UNIVERSAL LIBRARY

OU_224188

UNIVERSAL LIBRARY

891.4305

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

2 OCT 19

17 NOV 19

OUP—786—13-6-75—10,000.

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ٨٩١٥ ٤٣٥ ن آ Accession No. ١٩٤١ ٣٣

Author انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ

Title نوائے ادب

This book should be returned on or before the date last marked below.

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

کا

سہ ماہی رسالہ

نوائے ادب

ناشر

ادبی پبلشرس (شعبۂ اشاعت انجمن اسلام) بمبئی ۸

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

(بمبئی یونیورسٹی سے ملحق)

کے

اغراض و مقاصد

۱. ایم اے کی تعلیم کا انتظام

۲. پی ایچ ڈی اور دوسرے تحقیقاتی کام کرنے والوں کی اعانت۔

۳. تحقیقاتی کام کرنے والے اداروں اور جامعوں سے تعاون۔

۴. ایک جامع کتب خانہ کا قیام۔

۵. مختلف کتب خانوں کے اردو کے مخطوطات کی فہرست کی ترتیب۔

۶. نایاب مخطوطات و مطبوعات کی اشاعت

۷. اردو سے متعلق ایک علمی و تحقیقاتی سہ ماہی رسالہ کا اجراء۔

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

کے

سہ ماہی رسالہ نوائے ادب کی خصوصیات

۱. اردو زبان و ادب سے متعلق مختلف پہلوؤں پر بحث و تحقیق۔

۲. گجرات و دکن کی غیر مطبوعہ اردو تصانیف کی اشاعت

۳. اردو سے متعلق تحقیقاتی کاموں کی اطلاع۔

۴. اردو کے علمی و ادبی رسائل کے مضامین کی تلخیص و اشاعت۔

رسالہ سال میں چار بار شائع ہوگا

جنوری اپریل جولائی اکتوبر

چندہ سالانہ:- چھ روپے

فی پرچہ:- ڈیڑھ روپیہ

مع محصول ڈاک

ایڈیٹر عبدالرزاق قریشی

ترسیل مضامین و خط و کتابت

ڈائرکٹر

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

۹۲. دادابھائی نوروجی روڈ

بمبئی ۱

خریداری و ترسیل زر

ہندوستان میں:-

ادبی پبلشرز

۸ شیفرڈ روڈ، بمبئی ۸

نوائے ادب بمبئی

تاریخ اشاعت ۱۵ جنوری ۱۹۷۱ ع

جلد ۲۲ جنوری ۱۹۷۱ شمارہ ۱

شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	تحقیق متن	تنویر احمد علوی	۱
۲	معجزۂ فاطمہ رض	ابوالنصر محمد خالدی	۳۱
۳	خزائن رحمت	شیخ فرید الدین	۷۲

* تنویر احمد علوی

تحقیق متن

تحقیق متن کے سلسلہ میں مندرجۂ ذیل امور اساسی اہمیت رکھتے ہیں :

الف ـ متن کی ہیئت (حدود) کا تعین

ب ـ الحاق و اضافات کی نشان دہی جس کے ذیل میں تصرفات کا مطالعہ بھی آتا ہے ۔

ج ـ متن کے گم شدہ سلسلوں کی باز یافت

د ـ متنی حقائق کی جستجو اور چھان بین

ترتیب متن کے نقطۂ نظر سے متنی ہیئت کی دو بہت واضح صورتیں سامنے آتی ہیں : منضبط متن اور منتشر متن ۔

منضبط متن وہ ہے جس کی ہیئت کا تعین فی الجملہ ممکن ہو اور تقسیم ابواب فہرست مطالب ، تشریح مضامین ، ابیات و اصناف کی تعداد کی نشان دہی یا اس نوع کی دوسری وضاحت اور اس کی عدم موجودگی میں تسلسل روایت کی روشنی میں اس کے دائرۂ کار کو متعین کیا جاسکے ۔ اس کے مقابلہ میں «غیرمنضبط متن» ایسے متن کو کہاجائے جس کے مختلف اجزا یا آثار تمام و کمال صورت میں اپنی اصل کے ساتھ موجود نہ ہوں اور ادھر ادھر منتشر حالت میں پائے جاتے ہوں ۔ اکثر اشعار و ابیات کے مجموعوں اور گاہ گاہ قصص و حکایات اور لطائف و ملفوظات کے ساتھ بھی یہ صورت موجود ہوتی ہے ۔ ویسے ملفوظات کا حتمی تعین تقریباً ناممکن ہے ۔

متن بیشتر مبسوط ، منتخب یا منفرد حالتوں میں ملتے ہیں ۔ اول الذکر دونوں طرح کے متن متحد المضامین بھی ہوسکتے ہیں اور مختلف النوع بھی ۔ لیکن منتخب متن کے لئے اپنی حدود کا پابند ہونا ضروری ہے ۔ منفرد متن ایک ایسا متنی

* ڈاکٹر تنویر احمد علوی ، ام ۔ اے ؛ پی ۔ اچ ڈی ؛ ڈی ۔ لٹ ؛ استاد شعبۂ اردو ، دلی کالج ، دہلی ؛ دکن نصابی کمیٹی ، شعبۂ اردو ، دہلی یونیورسٹی ، دہلی ؛ مصنف ذوق ، مرتب کلیات ذوق ، کلیات شاہ نصیر وغیرہ ۔

واحدہ Textual Unit ہوتا ہے جسے اپنی جزئی شکل میں بھی کل ہونے کی حیثیت حاصل ہوتی ہے، جیسے کوئی کتبہ، دستاویز، خط۔

متن مکمل حالت میں بھی ہو سکتا ہے اور نا مکمل حالت میں بھی۔ نا مکمل حالت کبھی عدم تکمیل کی نشان دہی کرتی ہے اور کبھی متن کی ضیعان رسی کی طرف اشارہ فرما ہوتی ہے۔ اول الذکر صورت حال کی ایک مثال کے طور پر مفتی صدر الدین کے تذکرہ کو پیش کیا جاسکتا ہے جس کا واحد قلمی مخطوطہ ردیف ن پر ختم ہوجاتا ہے۔ اس کی کوئی دوسری روایت دستیاب نہیں۔ اس کا امکان ہے کہ خود مسودہ تکمیل سے محروم رہا ہو متن کی ضیعان رسی کی ایک اور نمایاں مثال حیدربخش حیدری کے تذکرۂ گلشن ہند مخزونہ برٹش میوزیم سے دی جا سکتی ہے جس میں سوز کے ترجمہ کے بعد مندرجہ ذیل سطور بطور خاتمہ کے درج ہیں:

> «احوال مولف۔ اس احقر نے موافق اپنی محنت و مشقت کے چھ سات برس میں ان بزرگوں کے نام مع اشعار و تخلص جمع کئے اور کئی جز بخوبی تمام لکھے۔ افسوس یہ ہے کہ وہ جز حروف ش سے لے کر تا حروف ی خدا جانے کیا ہوئے! اس واسطے نوبت تحریر حرف ی تک نہ پہنچی۔ انشاءاللہ اگر زمانہ اس صورت سے قدرے رفاقت کرتا ہے تو یہ خاکسار پھر نئے سرے سے احوال ان شعراؤں کا خاطرخواہ لکھتا ہے۔ ۔ ۔ (گلشن ہند، ص ۱۰۲)

ایسی کوئی صورت تحریر کا تسلسل ٹوٹ جانے کی غماز بھی ہو سکتی ہے، اس کی ایک سے زیادہ مثالیں مل سکتی ہیں۔ میر نے نکات الشعرا میں حاتم کے ترجمہ کے ضمن میں لکھا ہے:

> «دیوانش تا ردیف میم بدست آمدہ»

جس کے یہ معنی ہیں کہ دیوان حاتم کی یہ روایت نامکمل نہیں اور ممکن ہے یہ نسخہ یہیں تک نقل ہوا ہو۔

متن کی ضیعان رسی کی وہ صورت کہ مصنف کے نتائج فکر زمانے کی دست برد کے ہاتھوں ضائع ہوجائیں، دوسری نوعیت رکھتی ہے غالب نے اپنے خط میں جو ہنگامہ غدر کے بعد لکھا گیا، اپنے کلام کے ضائع ہونے پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

. . . میرا کلام میرے پاس کبھی نہیں رہا. ناظر حسین مرزا اور ضیاء الدین احمد خان جمع کرلیتے تھے، سو ان کے گھر لٹ گئے ہزاروں کے کتب خانے برباد ہوگئے. اب میں اپنا کلام دیکھنے کو ترستا ہوں. . . . »[1]

غالب کے کلام کا کتنا حصہ اس دست برد میں ضایع ہوا اس کے بارہ میں کچھ کہنا مشکل ہے. اس لئے ضایع شدہ متن کا بیشتر حصہ دوسرے وسایل کی مدد سے فراہم ہوگیا. لیکن ایسے مصنفین بھی ہیں جن کے رشحات قلم خود ان کی بے توجہی کے نتیجہ میں یا پھر ایسی ہی کسی «رستخیز بیما» کے ہنگامہ کی نذر ہوکر ضایع ہوگئے. ذوق کے کلام کا ضیعان اس کی ایک نمایاں مثال پیش کرتا ہے. ان کے دیوان کی ترتیب اول کے دیباچہ نگار امراؤ مرزا انور نے لکھا ہے.

«ہیہات ہیہات! ہجوم افکار و اشغال زمانی آن قدر فرصت نمی‌داد کہ مسودات کلام گوہر نظام کہ انبار انبار در یاد بستہ بود و لبالب در خم و سبوچہ چون جواہر بکان و اکثرے در بیاض بود فراہم و یکجا نمایند و ہمت والا نہمت بہ ترتیب و درستی کلیات معروف و معطوف فرمایند. . . در خلال این حال. . شیرازۂ جمعیت ہرکسے ازہم بگسست، عالم دگرگوں شد. . . بگفتن نمی آید کہ آن و کاغذ پارا انبار در انبار را کدام صرصر بربادی چون کاغذ بادی در پرواز آورد و کدام آتش زبانہ‌کش نیستی آن اوراق تصویرات چمن را ہم چون خس و خاشاک بسوخت»[2]

ایسی صورت میں کلام ذوق پر مشتمل کسی متن کی مجموعی ہیئت و حدود کا تعین کرنا ممکنات کی حدود سے خارج نظر آتا ہے. جو کچھ دیوان ظہیر اور انور کے ہاتھوں ممکن ہوسکا اس کا حال خود انور نے اس طور پر لکھا ہے:

«ہرقدر اشعار کہ از نقل تذکرہ جات، و از یاد شاگردان و حاضر خدمت حضرت اوستاد غفراللہ لہ از قصائد و غزلیات و متفرقات بدست

---

۱ اردوئے معلی، خط بنام مرزا قاسم علی مہر، ص ۴۲

۲ دیوان ذوق مرتبہ ویران، ص د۱ (دیباچہ)

آمدند و آن قدر کہ بیاد خود بودند ہمہ را فراہم نمودہ پیش نظر ترتیب داشتیم۔"[1]

اس اعتبار سے ذوق کا جو متن اب دستیاب ہے (اور جس میں مولانا محمد حسین آزاد کے مرتب‌کردہ دیوان کو بھی پیش نظر رکھا جاسکتا ہے) اُسے ذوق کا مکمل متن نہیں کہا جا سکتا، اب اس کی نوعیت منتخب متن کی نہیں "حاصل شدہ متن" کی ہے۔

"منتخب متن" کی ایک صورت تو یہ ہے کہ خود مصنف نے اپنے کلام یا تالیفات سے انتخاب کیا ہو۔ اس کی یہی دو شکلیں ہوسکتی ہیں، ایک وہ جو غالب کے انتخاب کلام "گل رعنا" کی صورت میں سامنے آئی ہے، دوسری صورت کی مثال دیوان زادۂ حاتم اور خود غالب کے منتخب دیوان اردو کی شکل میں سامنے آتی ہے۔

ایسے کسی متن کو مصنف کا "مرجح متن" کہا جائے گا، باقی‌ماندہ حصہ "غیر مرجح یا مسترد متن" تصور کیا جائے گا۔ ترتیب کے وقت دونوں طرح کے متن الگ الگ دئے جا سکتے ہیں۔ مجموعی صورت میں اس کی نشان دہی ضروری ہے کہ مصنف کا "مرجح متن" کون سا ہے۔ منتخب متن کو اگر اس کی اپنی حدود کے ساتھ ترتیب دیا جائے تو باقی‌ماندہ متن کا اضافہ غیرضروری ہوگا۔

متن کے ایسے اجزا کو جنہیں فکر سخن یا سعی اصلاح و درستی کے وقت "نظری" قرار دیا گیا ہو، متن سے خارج سمجھا جائے گا، ہاں ترتیب کے موقعہ پر حواشی میں ان کی نشان دہی ہوسکتی ہے۔

منتخب متن کے ضمن میں اس حقیقت سے بھی صرف نظر ممکن نہیں کہ کبھی انتخاب معیار پسندیدگی سے زیادہ کچھ خاص حالات کا پابند ہوتا ہے۔ ممکن ہے کسی نسخہ کی ترتیب کے وقت مصنف کا مکمل متن موجود نہ ہو یا متن کے تمام و کمال صورت میں موجود ہونے کے باوصف اس سے پوری طرح استفادہ نہ کیا جاسکے ایسی صورت میں کسی منتخب متن کی حیثیت "مرجح متن" کی نہیں ہوسکتی۔ عام انتخابات کی نوعیت اس سے مختلف ہوتی ہے اور ان پر اس حیثیت سے گفتگو نہیں کی جاسکتی۔

---

۱ دیوان ذوق، مرتبہ ویران، ص ۱۷

ایک مرتب متن کا فرض ہے کہ وہ کسی متن کے تحقیقی طور پر ترتیب دیتے وقت ان امور کی طرف ضروری اور مناسب توجہ دے۔

عام حالتوں میں یہ فیصلہ کہ کسی متن کی صحیح حدود کیا ہونی چاہئیں اس کے کسی معتبر نسخہ کو سامنے رکھکر کیا جاسکتا ہے لیکن ان حدود کے «تحقیقی تعین» کے لئے مختلف قلمی اور مطبوعہ نسخوں کا تقابلی مطالعہ ضروری ہے۔

اس ضمن میں مصنف کے اپنے قلمی نسخہ کے علاوہ جسے «خطی نسخہ» کہنا چاہئے باقی قلمی نسخوں پر بھی اعتماد کلی کا اظہار کرنا ممکن نہیں۔ قاضی عبدالودود نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> کتابوں کے قلمی نسخوں میں بڑے شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔ شاہ نامہ فردوسی کے بعض نسخوں میں گرشاسپ نامہ اسدی کا معتدبہ حصہ داخل ہوگیا ہے۔ ایسے نسخے بھی موجود ہیں جن میں یزدجرد نامے کے ہزاروں شعر داخل ہوگئے ہیں۔[1]

الحاق کی جس صورت کی طرف قاضی صاحب نے اشارہ کیا ہے اس کی گوناگوں مثالیں مختلف قلمی اور غیرقلمی نسخوں میں مل‌جاتی ہیں۔ چنانچہ اسی سلسلے میں آگے چل‌کر قاضی صاحب نے اس کی بعض دلچسپ مثالیں پیش کی ہیں۔

> «کلیات انوری طبع ہند میں ایک ہندوستانی شاعر کے قصاید داخل ہوگئے ہیں اس کے بعض اشعار اس کے ہندوستانی ہونے پر مشعر ہیں اور ان کی بنا پر الحاق کے امکان کو نظر انداز کرتے ہوئے ظفرعلی‌خان نے انوری کے ہندوستانی ہونے کا دعوی کیا ہے۔ ظہیر فاریابی کے دیوان کے جو نسخے ایران میں چھپے ہیں الحاقی کلام سے خالی نہیں اور نول‌کشوری نسخہ کے آخر میں جو دیوان غزلیات ہے وہ تو یک قلم ہند کے ایک شاعر ظہیر اصفہانی کا ہے۔»[2]

اس کے مختلف و متنوع اسباب ہوسکتے ہیں۔ کبھی نام یا تخلص کی وجہ سے ایک شاعر کا کلام دوسرے شاعر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، کبھی تصانیف

۱　آج کل، تحقیق نمبر، ص ٦
۲　ایضاً

کی ہم نامی یا ہم رنگی اس کا باعث بن جاتی ہے۔ اور اس سلسلے میں معروف تخلص کے ساتھ کسی تصنیف کی نسبت دہی نسبتاً زیادہ سہل ہوتی ہے اول الذکر کی ایک بہت نمایاں مثال ضیاء الدین خسرو عہدجہانگیری کے ایک شاعر کی تصنیف «خالق باری» سے دی جاسکتی ہے جو حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ سے منسوب کردی گئی۔ خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کا فارسی دیوان بھی اسی غلط انتساب کی ایک اور مثال ہے (جس پر گفتگو «متنی حقائق کی جستجو» کے ذیل میں آئے گی)

کبھی یہ صورت نظری فروگذاشت یا تسامح کے نتیجے میں بھی پیش آسکتی ہے۔ مثال کے طور پر، ایک سے زیادہ کتب و رسایل ایک ہی مجلد میں ہوں تو اس کا امکان رہتا ہے کہ نقل کرنے والا کسی تصنیف کو دوسرے مصنف کے ساتھ منسوب کردے یہ اس صورت میں بھی ممکن ہے جبکہ سرورق یا امتیاز پیدا کرنے والی کوئی دوسری صورت موجود نہ ہو۔

الحاق کی ایک صورت سرقہ یا تصرف بھی ہوسکتی ہے۔ اس کی بھی متعدد و متنوع مثالیں علم و ادب کی تاریخ میں مل جاتی ہیں۔ مصحفی نے شاہ حسین حقیقت کے ترجمہ میں اس کی ایک مثال پیش کی ہے:

«امام بخش خان کشمیری که با وصف جاہلی از مدتے خیال جمع کردن اشعار در تذکرہ درس داشت . . . . اما طرفه این است که خان مذکور پیش ازین روزے بر مکان فقیر آمده بالحاح تمام مسودۂ خام تذکرۂ مرا که درین مدت به ہیچ کس نه نموده بودم از من طلب نمود. من ساده دل بنا بر سابقه معرفت شاه جہان آباد آدمیت را کار فرموده اجزاے مسودۂ تذکرۂ خود را حواله کردم. در عرصۂ یک دو روز خفیه از من اشعار و احوال شعراے دہلی وغیره که من به محنت تمام آنہا را بہم رسانیده بودم از دست حقیقت بے حقیقت نقل کنانیده. و دیگر بیاض و جنگ مرزا جہان دار شاه که بعد حضرت ایشان پیش او مانده بود چیزے ازو و چیزے از جاے دیگر اخذ نموده ہر گاه، تذکرۂ بےمغزش که آن را ہیچ دانا نه پسندد فی الجمله صورت گرفت. . . »[1]

---

۱ تذکرۂ ہندی، ص ۸۷-۸۶

یہ تو ایک تذکرے اور ایک بیاض سے مختلف تراجم اور اشعار نقل یا اخذ کرلینے کی بات تھی ، ایسی مثالیں بھی مل جاتی ہیں جہاں تصانیف پر غاصبانہ تصرف کرلیا گیا اور ان کے مضامین و مقالات کو اپنے طور پر توڑموڑکر پیش کیا گیا . صاحب «کشف المحجوب» شیخ علی بن عثمان بن علی الہجویری نے لکھا ہے :

> ایک دفعہ کسی نے میرے شعروں کا دیوان طلب کیا اور پھر واپس نہ دیا . چونکہ میرے پاس اس نسخہ کے علاوہ کوئی اور نسخہ نہ تھا اس نے دیوان کے شروع میں میرے نام کی جگہ اپنا نام چسپاں کرتے ہوئے میری محنت و کاوش کو تلف کرنا چاہا . اسی طرح میں نے تصوف میں ایک اور کتاب بعنوان منہاج الدین تالیف کی اور مدعیان شقی القلب میں سے ایک شخص نے میرے نام کو اس کتاب کے اول سے مٹا دیا اور عوام الناس میں اپنے نام کو شہرت دی[۱] .

اس کے برعکس الحاق کے سلسلہ میں یہ صورت بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ ایک شخص خود اپنی مرضی سے اپنی تصنیف دوسرے کسی فرد کے نام سے منسوب کردیتا ہے . کبھی اس کا مقصد خوشنودی مزاج کے لئے علمی یا ادبی نذرانہ پیش کرنا ہوتا ہے کبھی « در مدح خود می‌گویم » کا جذبہ اس کے پس پردہ کارفرما ہوتا ہے ، کبھی مذہبی رجحان کی تبدیلی پیش نظر ہوتی ہے ، کبھی اس کے ذریعہ کسی فرقہ کے معتقدات اور رایوں کو مقبول عام بنانے کی کوشش کی جاتی ہے . اسلاف پرستی اس کی ایک اور شکل ہے . سیاسی اغراض کے حصول کے لئے بھی مجہول تصانیف پیدا کی جاتی ہیں . علاوہ بریں بعض لوگوں کو خبط ہوتا ہے کہ اپنا کلام دیگر مشاہیر کی طرف مضاف کرکے زباں زد عام ہوتا دیکھنا چاہتے ہیں وغیرہ وغیرہ . امرا و سلاطین کے درباروں سے متوسل شعرا اور ادیب اپنی تصانیف بطور نذرانہ اپنے ممدوحین کو پیش کرتے رہے ہیں جس کی متعدد مثالیں ادبیات کی تاریخ میں مل سکتی ہیں . اردو شعر و ادب کی تاریخ بھی ایسی مثالوں سے خالی نہیں .

شیخ ابراہیم ذوق کی طرف سے اپنے شاگرد مرزا ابوظفر بہادرشاہ کو پیش کئے جانے والے شعری نذرانے اکثر موضوع بحث بنے ہیں ، مگر یہ ایک حقیقت

---

۱ ترجمۂ کشف المحجوب ، ص ۳۴

ہے اور اس کا ثبوت ذوق کے اپنے بعض مسودات سے بھی فراہم ہوتا ہے جن میں ظفر کے تخلص سے غزلیں کہی گئی ہیں ۔ معروف کے تخلص سے کہی ہوئی ایک غزل کا مسودہ بھی بخط ذوق موجود ہے ۔

شعری بخششوں کی ایک دوسری نوعیت کی مثال مصحفی کے سلسلے میں مولانا محمد حسین آزاد نے پیش کی ہے :

«سن رسیدہ لوگوں کی زبانی سنا کہ دو تین تختیاں پاس دھری رہتی تھیں ، جب مشاعرہ قریب آتا مختلف کاغذوں میں طرح مشاعرہ پر شعر کہتے اور برابر لکھتے جاتے تھے ۔ لکھنو شہر تھا ۔ مشاعرے کے دن لوگ آتے اور جہاں تک کسی کا شوق مدد کرتا وہ دیتا ۔ ۹ ، ۱۱ ، ۲۱ شعر کی غزل نکال کر حوالہ کردیتے اور اس کے نام کا مقطع کردیتے تھے ۔»[1]

اس سے مختلف نوعیت کی مثالیں بھی ادبیات کی تاریخ میں مل جاتی ہیں ۔ اس ضمن میں میر اثر کی مثنوی خواب و خیال کا ذکر کیا جا سکتا ہے جس میں خود مؤلف کے اپنے بیان کے مطابق سلسلہ غزلیات میں خواجہ میر درد کے عطا فرمودہ تقریباً دو سو اشعار موجود ہیں ۔ معاصرین کے کلام میں اس طرح کی خلط ملط کی بہت سی مثالیں مل جاتی ہیں ۔

قاضی عبدالودود نے سودا کے مطبوعہ کلیات کے بارے میں لکھا ہے :

«سودا کے کلیات کے مطبوعہ نسخے میں میر سوز کی سو سے زیادہ غزلیں داخل ہیں ۔»[2]

سودا کے مشہور معاصر میر تقی میر کے کلام میں بھی التباس و الحاق کی بہت سی مثالیں موجود ہیں جن کا حوالہ قاضی عبدالودود صاحب نے دیوان میر طبع اول مطبوعہ فورٹ ولیم کالج ، کلکتہ ، پر گفتگو کرتے ہوئے دیا ہے اور کہا ہے :

«میں اس موقع پر ایسے اشعار کی جو غلطی سے میری طرف منسوب کئے گئے ہیں کوئی فہرست دینا نہیں چاہتا ، صرف یہ کہنے پر اکتفا کروں گا کہ حسب ذیل اشعار اس میں نہیں :

---

۱ آب حیات ، ص ۳۲۳

۲ آج کل ، تحقیق نمبر ، ص ٦

وہ شعر جس کا مصرع آخر ہے مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا
یہ در اصل محمد یار خاں میر شاگرد قائم کا شعر ہے جیسا کہ تذکرۂ
شوق سے معلوم ہوتا ہے۔
۲۔ وہ شعر جس کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوتا ہے: ستاروں میں روشنی نہ رہی
یہ زمانۂ حال کے کسی شاعر کا شعر ہے، کسی قدیم کتاب میں نظر
نہیں آتا
۳۔ یہ جو چشم پر آب میں دونوں الخ یہ دراصل منور کا شعر ہے
رجوع بہ تذکرۂ قاسم (حالی اور ان کی تقلید میں ڈاکٹر عبدالحق اسے
میری ملکیت قرار دیتے ہیں)۔
۴۔ وہ شعر جس کا مصرع آخر یہ ہے:

کفن دینا تمھیں بھولے تھے ہم اسباب شادی میں

یہ امیر اللغات میں قادر کے نام سے ہے۔ غالب نے اردوئے معلی میں
شعر ذیل میر کی طرف منسوب کیا ہے لیکن وہ کسی اور کتاب
بشمول کلیات نہیں ملتا۔ اس کے باوجود قطعی طور پر یہ نہیں کہا
جاسکتا کہ میر کا طبع زاد نہیں، رنگ بالکل انہی کا ہے۔
بدنام ہوگے جانے بھی دو امتحان کو رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو
اس کے علاوہ میر کی طرف مشہور اس قطعے کی بھی یہی کیفیت ہے
جو آزاد نے ان کے ورود لکھنؤ کے سلسلے میں لکھا ہے:

کیا بود و باش پوچھو ہو . . . الخ »[1]

الحاق کی بہت سی مثالیں ذوق مرحوم کے کلام میں مل جاتی ہیں۔ خود نسخۂ ویران کو بھی اس سے مبرا نہیں قرار دیا جاسکتا۔ بیاض آزاد میں بھی بعض ایسے شعر مل جاتے ہیں جو ذوق کی اپنی تصنیف کی حیثیت سے شامل ہیں جبکہ درحقیقت وہ دوسروں کی تخلیقات فکر ہیں۔ مثال کے طور پر یہ شعر

آئینۂ فلک میں ہے عکس چراغ دل خورشید پر نمود ہوا بدر داغ دل

ذوق کا نہیں انشا کا ہے۔[2]

---

۱ میر نمبر، ص ۲۹۰
۲ عمدۂ منتخبہ، ص ۲۷

آخر گِل اپنی خاک در میکدہ ہوئی　　پہنچے وہاں پہ خاک جہاں کا خمیر ہو

مصرع ثانی ذوق کے یہاں بہ ادنٰی تغیر ملتا ہے :

پہنچی وہاں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

بیاض قلمی میں یہ شعر ۱۵۲ کے عدد کے ساتھ ملتا ہے ، اور یہ وہ عدد ہے جو اس بیاض میں شامل ذوق کی بہت سی غزلوں کے ساتھ بطور تمغۂ عنوان سخن ملتا ہے . مگر یہ شعر در حقیقت مرزا جہاں دار شاہ کا ہے جو نہ صرف یہ کہ ان کے نام سے بعض تذکروں میں شامل ہے بلکہ ان کے قلمی دیوان میں بھی موجود ہے . ایسی صورت میں یہ یا تو ذوق کے یہاں نوارد کا درجہ رکھتا ہے یا پھر وہ اسے سامنے رکھ کر اس زمین سخت میں غزل کہنا چاہتے ہوں گے . اسی طرح ناسخ کا یہ مطلع بھی بیاض میں موجود ہونے کی وجہ سے دیوان ذوق میں شامل ہوگیا ہے .

سرو عاشق ہوگیا اس غیرت شمشاد کا

غالباً ایسا ہوا ہے کہ ناسخ کا یہ مطلع ذوق کو پسند آیا ، یادداشت کے طور پر بیاض میں نقل ہوگیا . پھر اسی وقت یا اس کے بعد اس پر غزل ہوئی . یہ مطلع بھی اس غزل کے اشعار کے ساتھ لگا رہا اور بعد میں دیوان ذوق مرتبہ آزاد میں نقل ہوگیا .

ناسخ کا ایک اور مطلع بھی بیاض قلمی میں موجود ہے :

پھر بہار آئی کف ہر شاخ پر پیمانہ ہے　　ہر روش پر جلوۂ باد صبا مستانہ ہے

اسے بھی سابقہ اشعار کی طرح مولانا محمد حسین آزاد نے اپنے مرتبہ دیوان میں شامل کرلیا .

ایک اور شعر سے متعلق جو نسخۂ ویران میں شامل ہے خود مولانا نے اس کا اظہار کیا ہے کہ وہ اہل تالیف کی بےخبری سے دیوان مطبوعہ میں شامل ہو گیا .

مطلع مرقوم حاشیہ :

گہر کو جوہری صراف زر کو دیکھتے ہیں .. کو استاد مرحوم نے بیاض خاص میں سے کاٹ دیا تھا میں نے پوچھا تو فرمایا : سودا کے ایک مطلع سے بیت ملتا ہے ، لڑکپن میں خدا جانے کیونکر ہو

گیا تھا۔ دیوان سابق میں یہ چھپ گیا، اہل تالیف بے چاروں کو کیا خبر!»[1]

اس کے علاوہ صاحب خم‌خانہ جاوید نے منشی محمدعلی تشنہ شاگرد ذوق کے حوالے سے ایک سے زائد شاعروں کے متعلق لکھا ہے کہ ان کا مطلع ذوق کے دیوان اول میں ہے اور متفرق مطلعوں میں کئی مطلعے شاہ نصیر کے اور کئی معروف اور مخیر کے لکھے گئے ہیں۔ اس بیان کا حوالہ دیتے ہوئے پروفیسر شیرانی نے بھی اس غلطی کا تذکرہ کیا ہے:

«اس غلطی کا پرتو مولانا کے مرتبہ دیوان پر بھی پڑنا چاہئے، علاوہ مولانا نے بعض اشعار دیگر شعرا کے اتفاقیہ لے لئے ہیں، مثلاً سکندر کی رباعی اور جہاں‌دار شاہ کا مطلع۔»[2]

جہاں دار شاہ کے مطلع کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے۔ سکندر کی رباعی یہ ہے:

اے زاہدو تم سے کیا جھگڑا کروں میں　　ناحق دل اپنے کو کروں کیوں خوں میں
مےخوارر صنم پرست کہتے ہو مجھے　　ہوں میں جو کچھ کہ ہوں میں ہوں میں

جو دیوان ذوق مرتبہ آزاد میں بہ ادنی تغیر شامل ہے۔ اس رباعی کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے یہ بیاض آزاد میں صفحہ ۱۹۳ پر لکھی ہوئی ملتی ہے۔ مولانا نے اسے ذوق یا اپنے والد کے ہاتھ سے لکھا ہوا دیکھ کر ذوق کے نام سے اپنے مرتبہ دیوان میں شامل کرلیا۔

یہ شعر

ہم نے اس بت میں جو دیکھا ہے نہیں کہہ سکتے
کہ مبادا کہیں سن پائیں شریعت والے

ظفر کے دیوان میں شامل ہے جبکہ مرزا قادر بخش صابر نے اسے اپنے تذکرہ میں ذوق کے نام سے پیش کیا ہے۔ ذوق کے دیگر مآخذ میں یہ نہیں ملتا۔ نیز «سروش سخن» کے مولف نے یہ شعر ذوق کے نام سے لکھا ہے:

قاصد جو واں سے آیا تو شرمندہ میں ہوا
بےچارہ سینہ چاک گریباں دریدہ تھا

۱　دیوان ذوق، مرتبہ آزاد (طبع اول)، ص ۵۷
۲　رسالۂ ہندوستانی، اپریل ۱۹۳۸ع

میر حسن نے اسے بہ ادنیٰ تغیر میر تقی میر کے نام سے درج کیا ہے ۔ اسی طرح نگارستان سخن میں ظہیر دہلوی نے اِس شعر کو

ننگا ہی گاڑ دیتے مجھے کوئے یار میں
یاروں نے ایک اور نکالی کفن کی شاخ

اس شعر کو مولانا محمد حسین آزاد نے اپنے ایک مضمون میں (جس کے اوراق راقم الحروف نے آغا محمد باقر کے پاس دیکھے تھے) شاہ نصیر سے منسوب کیا ہے لیکن یہ شاہ نصیر کے قلمی مآخذ میں نہیں ملتا ، بہت ممکن ہے ذوق ہی کا ہو ۔

بہارستان اشعار میں ذوق کے نام سے یہ شعر بھی درج ہے :

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

« مجموعہ نغز » میں یہ شعر بدھ سنگھ قلندر کے ترجمے میں شامل ہے ۔[۱]

مرثیہ گو شعرا کے یہاں بھی الحاق اور غلط انتساب کی گوناگوں مثالیں ملتی ہیں ۔ علامہ شبلی نے میر خلیق کے کلام کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

« میر نواب نامی ایک بزرگ نے جو میر خلیق کے بیک واسطہ شاگرد تھے ، سنہ ۱۲۹۷ھ میں بمقام گلبرگہ ، حیدرآباد، دکن ایک مجموعہ چھاپا تھا جس میں میر خلیق ، مونس اور انیس کے چند مرثیے جمع کئے تھے ، اس میں میر خلیق کے متعدد مرثیے ہیں ، لیکن اکثر وہ ہیں جو میر انیس کے نام سے مشہور ہیں اور جو میر انیس کے چھپے ہوئے مرثیوں میں شامل ہیں ۔ بعض ایسے ہیں جو مطبوعہ مرثیوں میں شامل نہیں لیکن زبان اور طرز ادا سے قیاس ہوتا ہے کہ میر انیس ہی کے نتائج فکر ہیں اور اگر وہ واقعی میر خلیق کا کلام ہے تو بیٹے سے باپ کو ترجیح دینے کی کوئی وجہ نہیں ۔ »[۲]

علامہ نے زبان و بیان کو ایک کڑی مان کر یہ فیصلہ دیا ہے کہ وہ میر خلیق کی بجائے میر انیس کے مرثیے ہونے چاہئیں لیکن مرثیہ کے سلسلہ میں زبان اور بیان میں تصرفات کی بھی مثالیں مل جاتی ہیں اور متنی مشتملات کو حسب ضرورت گھٹانے بڑھانے کی بھی ۔ اس ضمن میں علامہ شبلی نے اس صورت حال کا بھی ذکر کیا ہے ۔

---

۱ کلیات ذوق ، مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی ص ۱۰۴ ـ ۹۷

۲ موازنۂ انیس و دبیر، ص ۱۵

میر انیس کا جو کلام موجود ہے وہ ۵ جلدوں میں شائع ہوا ہے لیکن میر صاحب کے متوسلین کا خاص دعوی ہے کہ ان مرثیوں میں بہت کچھ تحریف اور خلط ہوا ہے۔ مولوی عبدالغفور نساخ نے ایک رسالہ مرزا دبیر اور میر انیس کے اغلاط سے متعلق لکھا تھا۔ اس کا جواب مرزا محمد رضا المتخلص بہ معجز شاگرد ناسخ نے لکھا جس کا نام تطہیر اور وساخ ہے اور جو سنہ ۱۲۹۶ ھ میں شعلہ طور کانپور میں چھپا تھا۔ اس کے دیباچہ میں مرزا صاحب لکھتے ہیں کہ

«اکثر تلامذۂ میرصاحب و مرزا دبیرصاحب نے بہ لحاظ اپنے پڑھنے کے اکثر تصرفات بہ تغیر و تبدل الفاظ مرحوم و بند کے کئے ہیں۔ بہ نظر اختصار کسی مرثیہ کے کچھ بند نکال ڈالے اور کہیں درمیان مرثیہ میں کوئی مطلع یا بند ایجاد کرکے الحاق کیا تاکہ وہیں سے پڑھنا شروع کریں۔ کہیں بغرض بکا و ابکا مضامین مبکیہ موزوں کرکے شامل کئے، کہیں الفاظ میں موافق اپنے فہم و سلیقہ کے کمی بیشی کی یا مشتاقین نے جو مرثیہ جدید زبان سے ان صاحبوں کی مجلس میں سنا خفیہ تحریر کیا اور جو الفاظ یا مصرع بسبب عجلت تحریر یا عدم سماعت کے رہ گئے اس کی تکمیل بطور خود کی اس باعث سے کہ نقل مرثیۂ جدید و نوتصنیف کا دستیاب ہونا شاعرین سے غیر ممکن تھا۔ پس جو کچھ کہ مرثیے ان کے تلامذہ کے پاس ہیں ان میں اکثر کالاصل نہیں ہیں، تغیر و تبدل و اضافہ و نقصان ان میں بہت ہے۔ اس بنا پر مرزاصاحب نے میر نفیس سے جو میر انیس کے فرزند تھے مطبوعہ مرثیوں کی تصحیح کی جس کا نتیجہ حسب ذیل ہے:

یہ مرثیہ — اے تیغ زباں جوہر تقریر دکھادے

اس مصرع تک — ملنے لگے آنکھیں قدم سرور دیں پر

میر صاحب کا کلام ہے، باقی ۱۴۵ سے ۱۵۵ تک اور مقطعے کے دو اول مصرعے سب الحاقی ہیں۔

یہ مرثیہ — دشت وغا میں نور خدا کا ظہور ہے

۷۰ بند تک یعنی اس ٹیپ تک ع۔

چھاتی کے پار نیزہ کی نوکیں نکل گئیں — میر صاحب کا کلام ہے

باقی الحاقی ہے ۔ یہ شعر:

لپٹوں گلے سے میں پدر ناتوان کے سینہ سے تو سرک تو مرے باباجان کے

الحاقی ہے ۔ »[1]

اس طویل اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مختلف متون میں ضیعان رسی نیز الحاق و اضافات اور تصرفات کی متنوع صورتیں کس طرح راہ پا گئی ہیں ۔

اس کی ایک دلچسپ مثال مولانا محمد حسین آزاد کا مرتب کیا ہوا دیوان ذوق ہے ۔ مولانا نے ترتیب دیوان ذوق کے سلسلے میں لکھا ہے :

« کٹے پٹے اشعار کا پڑھنا ، مٹے حرفوں کا اجالنا ، اس زمانے کے خیالات کو سمیٹنا ، حالتوں کا تصور باندھنا ، بھولے بسرے الفاظ و مطالب کو سوچ سوچ کر نکالنا میرا کام نہ تھا ، میں حاضر اور خدا ناظر تھا ، راتیں صبح ہوگئیں اور دن اندھیرے ہوگئے جب یہ مہم سرانجام ہوئی ۔

مگر اس کوشش میں مولانا نے ذوق کے کلام کو پیش کرنے کے ساتھ اس میں اپنے نتائج فکر کو بھی شامل کردیا اور ذوق کی روایت کو بہت کچھ بدل دیا » ۔[2]

دیوان ذوق مرتبہ آزاد کا اصل مسودہ آغا محمد باقر نبیرۂ آزاد کی ذاتی لائبریری میں محفوظ ہے ۔ اس کے تحقیقی اور تقابلی مطالعے کے بعد بعض بہت دلچسپ حقایق سامنے آتے ہیں اور پتہ چلتا ہے کہ مولانا نے بعض غزلیں ، اصل مسودات کو سامنے رکھ کر نقل کیں اور اپنے خیال کے مطابق جہاں کہیں مناسب سمجھا ان کی روایت کو بدل دیا ۔ بعض غزلوں کا ابتدائی متن وہی رکھا جو نسخۂ دیوان میں ملتا ہے ۔ مگر بعد میں حسب منشا اس میں تبدیلیاں کردیں ۔ بعض زمینہائے سخن میں ترمیم و تنسیخ کا عمل اتنی بار ہوا ہے کہ اس کی حیثیت ایک مسودہ کی سی ہوگئی ہے ۔

نثری مثنوی میں بھی اضافہ و الحاق کے سلسلے جاری رہے ہیں ۔ الحاق کے تحت آنے والے اضافے اور تصرفات کی نوعیت ان اضافات سے مختلف ہوتی ہے جو

---

۱ موازنۂ انیس و دبیر، ص ۲۰-۱۹

۲ دیوان ذوق ، مرتبہ آزاد ، ص ۱

حود مصنف اپنے زیر مطالعہ نسخے میں کرتا رہتا ہے یا اس کے علم و منشا کے مطابق عمل میں آتے رہتے ہیں۔ ایسے بہت سے قلمی اور مطبوعہ متون موجود ہیں جن میں صاحب تصنیف نے خود اضافے کئے ہیں۔ اس کی ایک مثال عیاد الشعرا مولفہ خوب چند ذکا کے اس قلمی نسخے سے دی جاسکتی ہے جو انجمن ترقی اردو علی گڑھ کے کتب خانے کی زینت ہے اور جس کے حواشی پر مصنف کے قلم سے بہت سے اضافات ہوئے ہیں۔

الحاقی و اضافی صورتوں کا جو گوناگوں اور متنوع ہوتی ہیں تحقیقی اور تقابلی مطالعے کے ذریعے پتہ چلانے کے بعد جہاں کی متن سے ان اجزا کو الگ کیا جاسکتا ہے جو صاحب متن کے اپنے رشحات قلم کے مرہون منت یا فکر فرمائیوں کے نتائج نہیں ہوتے وہاں متعلقہ متن کے اجزا کی بازیابی و یکجائی بھی کم و بیش ممکن ہوجاتی ہے۔ نئے ماخذ کی جستجو اور دریافت کے بعد اس کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ بیشتر حالتوں میں ایک ہی متن کی مختلف روایتوں کے تقابلی مطالعے کے بعد اگر وہ ممکن الحصول ہوں، ضایع شدہ یا منتشر اجزا کی بازیابی ممکن ہو جاتی ہے۔ یہاں مثال کے طور پر تذکرۂ گلشن سخن مولفہ مردان علی خان مبتلا لکھنوی کے مختلف نسخوں کے تقابلی مطالعے اور اس کے نتائج کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

« نسخہ نمبر ۱ بہت کچھ صحیح ہے اور کاتب کی دست برد سے بالکل محفوظ معلوم ہوتا ہے لیکن وہ دونوں طرف سے ناقص ہے۔ اس میں کل ۲۰۹ شاعروں کا حال ہے۔ پہلا شاعر الم دہلوی خلف خواجہ میر درد اور آخری شاعر حمایت علی ممنون ہے۔ نسخہ نمبر ۲ کے بارہ میں عرشی صاحب لکھتے ہیں:

« نہایت بدخط اور غلط نویس کاتب نے لکھا ہے۔»

اس نسخہ میں الم سے پہلے ۲۸ شاعر اور ممنون کے بعد اسی شاعر اور ہیں۔ یہ نسخہ بظاہر مکمل مگر درحقیقت بہت ناقص ہے۔ اس نسخے کا مقابلہ نسخہ نمبر ۱ سے کیاگیا تو معلوم ہوا کہ مرزا الف بیگ فرصت الہ‌آبادی کے احوال و اشعار تک دونوں نسخے تقریباً یکساں ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ جنون دہلوی اور محمد علی حشمت کا ذکر نسخہ نمبر ۱ میں ہے اور نمبر۲ میں نہیں ہے لیکن فدوی دہلوی اور فدوی لاہوری سے نسخہ نمبر۲ میں شاعروں کے حالات مختصر کر دئے گئے ہیں

اور ان کے بہت سے شعر چھوڑ دئے گئے ہیں. اس حذف و اختصار کی سب سے نمایاں مثال میر کے ذکر میں ملتی ہے. میر کا حال نمبر ۱ میں حسب ذیل ہے:

« میر محمد تقی تخلص میر شاگرد شاگرد سراج الدین علی خان آرزو است موطنش اکبرآباد و نشو و نما در دارالخلافه شاه جہان آباد یافته. ذکاء ذہن و علوء فطرت و درستی نظم و صفاے فکرت از کلام دلنشین مبرہن و ہویدا است. الحق درین زمان سرآمد ریخته گویان می‌توان شمرد. از اقسام فنون سخن گستری در غزل گوئی بےمثل، و احدے را مجال نیست که دم از ہمسری او تواندزد. ہر فرد غزلش که در شوخی و رعنائی برجسته‌تر از غزالان ختن است صحراے دلہای شکاریان نخچیر معانی را چراگاه خود ساخته. مسموع شده که در شاه جہان آباد تا حالت تحریر این گلشن سخن که یکہزار و یکصد و نود و چار ہجریست بسلامت استقامت دارد، تذکرهٔ مختصرے مشتمل بر احوال و انتخاب اشعار ریخته گویان تالیف نموده. دیوان فصاحت بیانش چار ہزار بیت، و این ابیات زبدهٔ آنست. . . . »

اور نسخہ نمبر۲ میں اس عبارت کا صرف پہلا فقرہ ہے یعنی: میر محمد تقی شاگرد سراج الدین علی خان آرزوست.[۱]

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کہیں کہیں مختلف نسخوں میں کس حد تک اختلاف احوال پایا جاتا ہے اور ایک نسخہ کے مقابلہ میں دوسرے نسخے میں متنی اجزا کی کمی بیشی کی نوعیت اور حدود کیا ہوتی ہیں. اب اگر کسی ایک نسخہ کی اس کی اپنی حدود کے ساتھ ترتیب منظور نہ ہو تو متن کی یکجائی کے ایک نسبتاً زیادہ مکمل متن ترتیب دیا جاسکتا ہے.

متن کے گم شدہ سلسلوں کی بازیافت کے لئے معاصرین کی تصانیف کی طرف رجوع اور مجموعہاے کلام کا تقابلی مطالعہ ضروری ہے. جس طرح ایک مصنف کے مختلف قلمی مجموعوں میں یا اس کی کسی تالیف کے مختلف نسخوں میں متن کے حدود ایک نہیں ہوتے اور ان کے تحقیقی مطالعہ سے جہاں الحاقات و اضافات کا پتہ چلتا ہے اسی طرح الحاقات کے مطالعہ سے کسی متن کی بازیابی ممکن ہو جاتی ہے

---

۱ تذکرۂ گلشن سخن، مقدمہ از سید مسعود حسن رضوی ادیب، ص ۲۲-۲۱

اوپر کی سطور میں اس کا ذکر آچکا ہے کہ سودا کے مطبوعہ کلیات میں میر سوز کی غزلوں کا ایک معتدبہ حصہ شامل ہے۔ میر سوز کے دیوان کی ترتیب کے وقت اسے میر سوز کے کلام میں شامل کیا جانا چاہئے۔ سودا کے کلیات میں ان کے بعض دیگر معاصرین کا کلام بھی شامل ہے۔ اس ضمن میں قائم مہربان خان رند اور مصلح الدین کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں، یہ حضرات سودا سے تلمذ رکھتے تھے۔

قائم کی بعض مثنویاں اور اشعار جو سودا کے مطبوعہ کلیات میں شامل ہوگئے ان کی نشان دہی اس طور پر کی جاسکتی ہے:

مثنوی در شدت سرما، جس کا مطلع ہے

اب کے سردی پڑے ہے اتنی شدید
صبح نکلے ہے کانپتا خورشید

یہ مثنوی سودا کی نہیں قائم کی ہے۔ اس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ یہ کلیات قائم کے قدیم قلمی نسخے میں موجود ہے، علاوہ بریں میر حسن اور قدرت اللہ شوق نے جو سودا کے ہم عہد تذکرہ نگار ہیں اسے قائم ہی سے منسوب کیا ہے۔ طرفہ تر یہ کہ یہ سودا کے ان قلمی نسخوں میں بھی موجود نہیں ہے جو ان کی زندگی میں ترتیب دئے گئے۔ ہاں، مطبوعہ کلیات میں یہ باخلاف روایت موجود ہے۔

یہی صورت مثنوی «طفل پتنگ باز» کی ہے جس کا مصرع اولی ہے:

ایک اونڈا پتنگ کا ہے کھلاڑ

یہ بھی سودا کے قلمی نسخوں میں موجود نہیں۔ شوق نے اپنے تذکرہ میں اسے بھی قائم سے منسوب کیا ہے اور اس کے چوبیس شعر پیش کئے ہیں۔

اس کے علاوہ گیارہ شعر کی ایک حکایت بطرز مثنوی جس کا پہلا مصرع یہ ہے: 　سنا ہے کہ اک مرد اہل غرض　　اور

تیس شعروں پر مشتمل ایک اور حکایت جو اس شعر سے شروع ہوتی ہے:

سلف کے زمانے کا تاریخ داں　　یہ لکھتا ہے احوال وارفتگاں　　اور

سولہ شعر کی ایک اور حکایت جس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

سنا ہے کہ اک مرد آزادہ طور　　جز اپنے نہ رکھتا تھا اسباب اور

نیز وہ حکایت جو اس شعر سے شروع ہوتی ہے:

سنا جائے ہے اک مہوس کا حال   کہ رکھتا تھا نت کیمیا کا خیال

وغیرہ

یہ سب حکایتیں سودا کی نہیں قائم کی ہیں اور ان کے دیوان کے قلمی نسخوں میں موجود ہیں۔ ان کے ماسوا تین سو انسٹھ شعر کی ایک طویل مثنوی حکایت مرد درویش کمیاب بھی جو سودا کے مطبوعہ کلیات میں موجود ہے اور قلمی نسخوں کے اوراق جس سے خالی ہیں، قائم ہی کی ہے

دونوں نسخوں کی روایت میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ممکن ہے یہ اختلافات نقل روایت کے مرہون منت ہوں۔ اس کا امکان ہے کہ یہ سودا کی اصلاحات ہوں، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ وہاں تخلص قائم ہے اور یہاں تخلص سودا۔ اس کی توضیح اس طرح کی جاسکتی ہے کہ ان تخلیقات کو رنگ سخن کی مماثلت کی وجہ سے جو اکثر التباس کا سبب بن جاتی ہے، سودا کا کلام تصور کرکے ان کے کسی شاگرد نے داخل کردیا ہے۔ لیکن غزل کے اشعار کے سلسلے میں اس کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ یہ تسامحات کا نتیجہ ہیں۔

اس بات کا تعین اور اس امر کی تحقیق کرلینے کے بعد کہ یہ تخلیقات سودا کی نہیں قایم کی زائیدۂ فکر ہیں انہیں قایم کے متن میں شامل کیا جانا چاہئے۔

سودا کے بعض دوسرے شاگردوں کا کلام بھی، جیسا کہ سطور بالا میں اشارہ کیا جاچکا ہے، ان کے مطبوعہ کلیات میں شامل ہوگیا ہے۔ ان کی «مثنوی بوم و شبال» میں جو فدوی لاہوری کی ہجو میں ہے شیدا تخلص موجود ہے۔ میر حسن اور شوق نے بھی اسے شیدا ہی سے منسوب کیا ہے۔ اب اسے مرتب کی سہل نگاری اور سہو پسندی کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ سودا کے کلام میں یہ اور ایسی متعدد شعری تخلیقات شامل ہیں۔

اس صورت حال کی ایک اور مثال سودا کے ایک دوسرے شاگرد فضل علی ممتاز کی مثنوی «در صفت چھڑی» ہے، میرحسن کے یہاں یہ ممتاز کے ترجمہ میں شامل ہے اور اس کے کچھ اشعار بھی نقل کئے گئے ہیں۔ یہ مثنوی سودا کے قلمی نسخوں میں شیخ چاند کے بیان کے مطابق موجود نہیں۔

اسی طرح راقم کا ایک قصیدہ « بندرا بن » سودا کے کلیات میں شامل ہوگیا ہے حالانکہ راقم تخلص مقطع میں صاف طور پر موجود ہے ۔

مثنویات کے علاوہ شیخ چاند نے سودا کے مرثیوں میں بھی ایسے کلام کی نشان دہی کی ہے جو سودا کا نہیں ہے :

« اکیانوے مرثیے اس کے مطبوعہ کلیات میں ملتے ہیں جن میں سے اٹھارہ ایسے ہیں جو اس کے نہیں ۔ ان اٹھارہ مرثیوں میں مہربان تخلص موجود ہے ۔ یہ اس کے شاگرد اور ممدوح نواب مہربان خان ویران فرخ آباد کی تصنیف سے ہیں ۔ مہربان خان کا تخلص رند تھا ۔ لیکن شوق کے تذکرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مہربان بھی تخلص کرتا تھا ۔ سودا نے خود ہی اپنے ایک قصیدہ میں جو اس کی تعریف میں ہے اس کی مرثیہ گوئی کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ بعض بیاضوں میں ایسے مرثیے ملتے ہیں جو مہربان خان شاگرد سودا کے بتائے جاتے ہیں ۔ ان میں سے بعض بہ تبدیل تخلص سودا کے نام سے بھی موجود ہیں ۔ »[۱]

مہربان خان کے سلسلے میں یہاں ایک ضروری بات کی طرف اشارہ کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے ۔ اسے سودا کے علاوہ میر سوز سے بھی تلمذ رہا ہے ۔ اس کے دیوان میں کئی غزلیں ایسی ہیں جو سوز اور سودا دونوں کے کلیات میں شامل ہیں ۔ ان کے متعلق قدرت اللہ شوق نے لکھا ہے :

« اکثر اشعار در دیوان او یافتہ شد کہ آن را میر سوز نسبت بطرف خود کند ، وبعضے گویند کہ از مرزا رفیع (سودا) ہست۔ »[۲]

شوق نے اپنے تذکرہ میں ایسی ۱۷ غزلوں کا حوالہ دیا ہے ، ایسی صورت یہ بات اور بھی پیچیدہ ہوجاتی ہے ۔ اس پیچیدہ صورت حال کو پیدا کرنے میں اس دور شاعری کا پیشہ ورانہ ماحول اور اساتذۂ سخن کی معاصرانہ چشمک کو بھی بہت کچھ دخل رہا ہے ۔ اور ارادی یا غیر ارادی طور پر غلط انتساب کو بھی ۔ ان حالات میں متن کے گم شدہ سلسلوں کی بازیافت اچھا خاصا پیچیدہ مسئلہ بن جاتا

۱　سودا، از شیخ چاند، ص ۱۱۶

۲　ایضاً، ص ۱۱۷

ہے جو مختلف روایتوں کی تحقیق اور ان کے بکھرے ہوئے سلسلوں کے تجسس میں کافی احتیاط اور چھان بین کا تقاضہ کرتا ہے اور اس بارۂ خاص میں اس پر تنقیدی نظر ڈالنا اور متعلقہ شواہد سے بحث کرنا ضروری ہوجاتا ہے، جن کی روشنی میں یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ ایسے متنی اجزا کا کسی اصل یا نقل سے کیا تعلق ہے اور کیوں ہے۔ متن کے ایسے گم شدہ سلسلوں یا منتشر اجزائے متن کے علاوہ، جن کی بازیابی کا تعلق متون سے ہوتا ہے، متن کے کچھ سلسلے ایسے بھی ہوتے ہیں اور ہوسکتے ہیں جو الحاقات کے ذیل میں نہیں آتے۔

یہ کہیں انتخابات کے زمرہ میں شامل ہوتے ہیں، کہیں ان کی حیثیت اقتباسات اور حوالہ جات کی ہوتی ہے اور کہیں یہ تضمین یا ترتیب بند وغیرہ کی شکل میں موجـــود ہوتے ہیں اور ان کی شمولیت کسی دوسرے شخص یا مولف کے نام سے نہیں ہوتی، مصنف ہی کے نام یا تخلص سے ہوتی ہے۔

کتب قواعد و لغت، انشا و مکاتیب اور ملفوظات و منتخبات میں اکثر دوسری تالیفات سے متعلق اشعار، لطائف اور اقوال وغیرہ مل جاتے ہیں۔ بیاض اور تذکرے بھی ایسے ہی مآخـــذ کے ذیل میں آتے ہیں جن میں ایسے اشعار اور فردیات کا حصول ممکن ہے جو کسی ایک یا زیادہ نسخوں میں موجود نہ ہوں۔ شیخ ابراہیم ذوق کے کلام کے ایک معتدبہ حصہ کی بازیابی بعض ایسے ہی مآخذ کی مرہون منت ہے۔

ایسے کچھ مآخذ میں نگارستان سخن مرتبہ ظہیر دہلوی کو ایک خاص اہمیت ہے۔ یہ ذوق، مومن اور غالب کا انتخاب کلام ہے جس کی ترتیب و اشاعت تقریبا اسی زمانے ۱۲۷۹ ع میں عمل میں آئی ہے جب ذوق کا پہلا مجموعۂ کلام اشاعت پذیر ہوا تھا ظہیر دہلوی اور حافظ ویران اس کی ترتیب میں شامل تھے۔ لیکن جب انہوں نے اپنا یہ انتخـــاب ترتیب دیا تو اس میں کچھ ایسی غزلیں اور اشعار بھی شامل کئے جو نسخۂ ویران کے عـــلاوہ ذوق کے کسی دوسرے مآخذ میں بھی شامل نہیں۔

تذکرے اور بیاضیں بھی ایسے مآخذ ہیں جن سے اجزائے متن کی بازیابی میں مدد ملتی ہے۔ لیکن چونکہ تذکروں میں اور انہیں کے ساتھ قلمی بیاضوں میں غلط انتساب کی متعـــدد مثالیں مل جاتی ہیں اور بہت کم تذکرے ایسے ہیں جنھیں

تحقیقی تصحیح کے ساتھ مرتب کیا گیا ہو ۔ اور بیاضوں کے بارے میں تو اس نوعیت کی تحقیق اور بھی مشکل ہے ۔ اس وجہ سے تذکروں کے تراجم پر کلیتا اعتماد نہیں کیا جاسکتا ۔ ان مآخذ سے اگر اجزائے متن کی بازیابی فی الجملہ وثوق و اعتبار کے ساتھ ممکن نہ بھی ہو تب بھی ان سے بعض قرائتوں کی تفہیم میں سہولت پیدا ہوجاتی ہے اور بعض قدیم و معاصر روایتوں کا پتہ چل جاتا ہے ۔

قواعد اور لغت کی کتابوں میں تو جگہ جگہ اشعار سے استناد کیا جاتا ہے ۔ اگر یہ تصانیف معاصر ہیں تو اجزائے متن کی بازیابی اور روایتوں کی تصدیق میں ان کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے ۔ مولانا محمد حسین آزاد نے ظفر کی ایک غزل کے بارے میں (جس کی زمین ہے امتحان پر ، دل طپاں پر) لکھا ہے :

« جب بادشاہ کا دیوان چھپ کر آیا تو مجھے یاد ہے کہ والد مرحوم (مولوی محمد باقر) نے غزل مرقومۃ الذیل کو دیکھ کر مجھے کہا « یہ غزل بھی بادشاہ کو دے دی » ، والد کو پہلے سے ساری یاد تھی ۔ »[۱]

اس طرح کی روایتوں پر اعتماد کرنا آسان نہیں ہوتا لیکن اس غزل کے دو شعر بیاض عوض علی مخزونۂ رضا لائبریری رامپور میں جو سنہ ۱۲۶۸ھ کی مرتبہ ہے ، ذوق کے نام سے موجود ہیں ، ان میں کا ایک شعر یہ ہے :

اٹھائے سو زخم ہر نمط ہیں یہ خوں کے دعوے کوئی غلط ہیں
کہ مثل خط گیر خط پہ خط ہیں ہنوز باقی ہر استخواں پر

یہ دوسرا شعر مولانا امام بخش صہبائی نے رسالۂ قواعد صرف و نحو میں دو مرتبہ نقل کیا ہے اور لکھا ہے « شیخ ابراہیم ذوق سلمہ اللہ تعالی کا شعر » ۔

کسی متنی جز کے حق میں ایسی کوئی معتبر معاصر شہادت اگر مہیا ہو جائے تو اس کی روشنی میں اس کا اپنے اصل کی طرف لوٹا دینا تحقیقی نقطۂ نظر سے غیرصحیح نہ ہوگا ۔

ذوق کے کلام کے سلسلے میں اس نوعیت کی بعض دوسری مثالیں بھی موجود ہیں :

« عمدۂ منتخبہ » ذوق کا یہ مطلع ظفر کے ترجمہ میں شامل ہوگیا ہے

---

۱ دیوان ذوق ، مرتبہ آزاد ، طبع اول ، ص ۱۲۳

نعل شکل مہ نو جب ترے توسن کو لگے
چار چاند اور دھنک پر مہ روشن کو لگے

بعد میں یہ غلطی ‹ گلشن بےخار › سے ہوتی ہوئی ‹ گلستان بےخزاں › تک پہنچی ، لیکن ایک مدت کے بعد دیوان ذوق کے مرتبین ویران ، ظہیر و انور نے متفقہ طور پر اسے اپنے مرتبہ دیوان میں شامل کرلیا

متنی حقایق کی جستجو کے سلسلہ میں مختلف مسایل و مباحث سے سابقہ پڑتا ہے جن کا فیصلہ متعلقہ متن کے تحقیقی عواید کی روشنی میں کیا جاسکتا ہے . اس ضمن میں جو اہم مسایل سامنے آتے ہیں ان میں اساسی متن کے انتساب کا مسئلہ بھی ہے جو بسا اوقات بہت پیچیدہ اور تحقیق طلب ہوتا ہے جس کی ایک مثال خواجہ معین الدین چشتی سے منسوب دیوان کی صورت میں سامنے آتی ہے . بعض تذکرہ نویسوں نے یہ دیوان خواجہ صاحب کی طرف منسوب کیا ہے اور اہل مطبع کے بیانات اور عوام کے جذبۂ عقیدت نے اس پر اپنی مہر تصدیق ثبت کردی ہے . لیکن بقول پروفیسر شیرانی:

« ایک محقق اور منقد کی نظر میں یہ شہادت اور بیانات اس دیوان کا تعلق خواجہاجمیر سے وابستہ کرنے کے لئے کافی معلوم نہیں ہوتے . کیونکہ سب سے مقدم یہ سوال آتا ہے کہ حضرتخواجہ کے عہد سے ان بزرگوں کے عہد تک جس کے درمیان ۵ صدیوں سے زیادہ کی مدت حائل ہے ، یہ دیوان گنج مخفی کی طرح کہاں غایب رہا اور خواجہ کے سوانح نگاروں کی نظر سے کیونکر بچا . . . .

« آپ کی تصنیف انیس الارواح موجود ہے . خود آپ کے ملفوظات حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی قدس سرہ نے دلیل العارفین کے نام سے شایع کئے ہیں . سیر العارفین میں جو نصیر الدین ہمایوں بادشاہ کے عہدمیں تصنیفہوئی ہے آپ کے کافی حالات ملتے ہیں . ابوالقاسم فرشتہ نے مشایخ ہند کے احوال میں سب سے مقدم آپ کا ذکر کیاہے اور آپ کے متعلق تمام واقعات جمع کردئے ہیں . علاوہ بریں اہل تصوف کے تذکروں میں آپ کے حالات اکثر موجود ہیں . لیکن ان تمام کتابوں میں نہ صرف آپ کے دیوان بلکہ آپ کے ذوق شعر

تک کا ذکر نہیں ملتا . . . دیوان فی نفسہ اس سوال پر کچھ روشنی نہیں ڈالتا ، اس میں کوئی ایسی شہادت یا تلمیح موجود نہیں جو اس کو خواجہ صاحب کی ذات سے انتساب دے ۔ بعض شہادتیں اس انتساب کی تردید کے حق میں موجود ہیں . »[1]

محقق شیرانی نے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے اس کا اظہار کیا ہے کہ یہ دیوان دراصل مولانا معین الدین بن مولانا شرف الدین بن حاجی محمد الفراہی کا ہے جو مولانا حاجی کے ہم‌عصر اور صاحب تصانیف کثیرہ تھے ۔ آپ کے مواعظ و تصیفات مذاق شعر سے پر ہیں ، ان پر عشق و تصوف کا رنگ چھایا ہوا ہے . آگے چل کر اس سلسلے میں پروفیسر شیرانی نے لکھا ہے :

«میرا ایسا خیال ہے کہ اکبری عہد کے مورخین کو مولانا کے متعلق صحیح معلومات نہیں لیکن بعد کے تذکرہ نگاروں نے ان کے حالات سے بہت کم اعتنا کی ہے ۔ مجھے صرف ایک مختصر بیان تذکرۂ مخزن الغرائب میں ملا ہے جس نے میرے تمام شکوک کو یقین کی حد تک پہنچا دیا ۔ »[2]

یہ تذکرہ غیرمطبوعہ ہے ، اس لئے اس طرف توجہ کم کی گئی ۔ اس میں مولانا معین کے ترجمہ میں جو اشعار ملتے ہیں وہ اس دیوان میں بھی موجود ہیں جسے خواجہ معین الدین چشتی سے منسوب کردیا گیا ہے .

اس کی ایک دوسری مثال قصۂ چہار درویش ہے جسے اس کے مشہور مترجم میر امن اور ان کے علاوہ ایک دوسری روایت کے مرتب میر احمد خلف شاہ محمد نے (یہ نسخہ قاضی محمد ابراہیم بن قضی نور محمد پلبندری نے چھاپا تھا) حضرت امیر خسرو سے منسوب کیا ہے ۔ مگر یہ روایت نوطرز مرصع میں نہیں ملتی ۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ اس وقت تک یہ روایت اتنی عام نہ تھی ۔ بہرحال روایت مذکور پروفیسر شیرانی کے بیان کے مطابق عبارت ذیل پر تعمیر پاتی ہے :

« باعث این تصنیف از راز پژوہان اخبار پیشینیان این نوع مفہوم گردید کہ بارے طبع مقدس جناب السالک مسالک طریقت و ناسک

---

۱ مقالات شیرانی ، ص ۲۱۷ - ۲۱۵

۲ مقالات شیرانی ، ص ۲۲۷

مناسک شریعت قدوۃ العارفین و زبدۃ الصالحین حامی دین متین چراغ ہدایت و شمع یقین حضرت قدس سرہ العزیز بعارضہ علیل بودند. حضرت امیر خسرو دہلوی مدام این قصہ را زیب رقم فرمودہ پیش حضور پیر ومرشد خود می خواندند ، تا آنکہ حضرت موصوف غسل صحت فرمودند واین دعا می‌نمودند کہ یا رب ہرآنکس کہ این قصہ را بخواند یا بشنود از علت امراض نجات یابد.»[1]

اس روایت پر تحقیقی نظر ڈالتے ہوئے پروفیسر شیرانی نے لکھا ہے :

«اس عبارت سے مفہوم ہوتا ہے کہ اصل قصہ امیر خسرو کی تالیف ہے اور یہ مختصر دیباچہ مع نعت و حمد کسی نے بعد میں اضافہ کردیا ہے . باوجودیکہ اس قصہ کے ایک سے زیادہ متن ہیں لیکن ان میں سے کسی ایک کی زبان بھی ایسی نہیں جسے امیر خسرو کے عہد کی زبان کہی جاسکے . حضرت امیر صنائع و بدایع ، دقت‌پسندی اور پیرایۂ کلام‌کو پیچ دےکر دشوار فہم بنانے کے عادی تھے لیکن یہ نسخہ نہایت سادہ و سلیس عبارت میں مرقوم ہے ، اس کا املا ، انشا اور پیرایۂ بیان بالکل اسی اسلوب میں ہے جو ہمارے یہاں گذشتہ اور اس سے قبل کی صدی میں رائج تھا .

« چہار درویش کے جو قلمی نسخے ہم تک پہنچے ہیں ان میں قدیم ترین وہی ہیں جو بارھویں صدی ہجری کے مصنف تک ہمیں لے جاتے ہیں اس سے آگے ان کی سراغ رسی نہیں کی جا سکتی ، نہ اس عہد سے پیشتر کوئی اہل قلم اس تالیف سے آشنا معلوم ہوتا ہے . ابوالفضل نے آئین اکبری میں جہاں اپنے عہد کے مروجہ افسانوں کا ذکر کیا ہے ان میں چہاردرویش کا نام نظر نہیں آتا .

اوپر شیخ نظام‌الدین اولیا کے حالات و مقالات و ملفوظات پر متعدد کتب و رسائل موجود ہیں .

ان ملفوظات و مولفات کے ذریعہ سے شیخ کی زندگی کے روزانہ حالات و واقعات پر اطلاع بہم پہنچ سکتی ہے لیکن ان کتابوں

---

۱ مقالات شیرانی ، ص ۳۰

میں چہار درویش اور اس کے سبب تالیف کا کوئی مذکور نہیں ۔

اسی طرح امیر خسرو کے حالات و تعلیمات بالتفصیل معلوم ہیں لیکن نہ مورخین نہ تذکرہ نگار اس نام کی کوئی تالیف ان کی تصنیفات میں شمار کرتے ہیں ۔

« جب ہم قصۂ چہار درویش کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ان میں متعدد ایسے وجوہ و قرائن موجود ہیں جو ایک طرف (حضرت) امیر خسرو سے اس کے تعلق کی تردید اور دوسری طرف اس کے جدید الاصل ہونے کی تائید کرتے ہیں ۔ »[۱]

پروفیسر شیرانی کی اس بحث میں تحقیق متن سے متعلق کچھ بنیادی سوالات اٹھائے گئے ہیں اور ان کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی متن کو قدیم الاصل قرار دینے کے لئے یا کسی عہد کی شخصیت سے وابستہ کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ اس کے حق میں معاصر شہادتیں کیا ہیں اور متن کے قدیم تر قلمی نسخے کس زمانے سے تعلق رکھتے ہیں ۔ ایسی شہادتوں کی عدم موجودگی میں یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ متن اس عہد یا اس شخص سے تعلق نہیں رکھتا ۔ اس ضمن میں داخلی شہادت کے طور پر یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ اس کی زبان ، طرز املا اور جملوں کی ساخت کس نوعیت کی ہے نیز اس میں جو الفاظ یا علمی اصطلاحات آئی ہیں وہ کس قدر قدیم ہیں اور آیا اس عہد سے پیشتر کی ہیں یا اسی عہد سے تعلق رکھتی ہیں ۔ مقولوں اور اشعار وغیرہ سے متعلق بھی اسی طرح کی تحقیقی چھان بین ضروری ہے ۔

متنی روایت کی تحقیق سے متعلق ایک اور دلچسپ مثال محاورات بیگمات کے سلسلے میں سامنے آتی ہے جو سعادت یار خاں رنگین کی تالیف ہے لیکن ایک قلمی نسخے میں اسے خان آرزو سے وابستہ کیا گیا ہے ۔ اس پر تحقیقی گفتگو کرتے ہوئے مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے لکھا ہے :

« کتاب خانہ رامپور میں سراج الدین علی خاں آرزو کے اردو لغت نوادر الالفاظ کا ایک قلمی نسخہ بھی محفوظ ہے جس میں یہ سب لفظ اور محاورے دس پانچ کی کمی بیشی کے ساتھ ردیف وار درج ہیں ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ رنگین کے یہاں تشریحات اردو میں ہیں

---

۱ مقالات شیرانی ، ص ۳۲ ـ ۲۹

اور آرزو کے نسخے میں معمولی کمی بیشی کے ساتھ فارسی میں لکھی گئی ہیں ۔

« یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ محاورں کا جامع اور شارح اول کون ہے ، خان آرزو یا رنگین ؟ جہاں تک دونوں کے عہد کا تعلق ہے آرزو رنگین سے بہت مقدم ہیں ۔ انہوں نے ٢٣ ربیع الثانی سنہ ١١٦٩ھ میں انتقال کیا اور رنگین ١٢٥١ھ میں فوت ہوئے ہیں ۔ اس لئے جو مطالب آرزو کی کتاب اور ان کے پس رو مصنف کی تصنیف میں مشترک نظر آئیں گے وہ اصلا آرزو کے تسلیم کئے جائیں گے اور مصنف دوم ان کا ناقل قرار دیا جائےگا ۔ (لیکن) چونکہ رنگین اپنے دیباچہ میں) ایسا انداز اختیار کرتے ہیں جس سے ان کا جامع اور شارح اول ہونا مستنبط ہوتا ہے اس لئے ضرورت ہے کہ اس خصوص میں مزید جستجو کی جائے ۔

« یہ محاورے آرزو کی کتاب کے صرف ایک نسخے میں پائے جاتے ہیں نیز ان کی تشریح کی فارسیت آرزو کے درجہ سے جگہ جگہ فروتر نظر آتی ہے ، اس لئے ۔ ۔ ۔ یہ احتمال باقی رہتا ہے کہ ان کا جامع کوئی اور شخص ہو اور اس نے مناسبت کے باعث نوادر الالفاظ کے اپنے نسخے کے حاشیوں پر یہ الفاظ فارسی تشریحوں کے ساتھ لکھ لئے ہوں ۔ چونکہ ان کے ساتھ کوئی دیباچہ اس نے نہیں لکھا تھا جس سے حقیقت حال واضح رہتی بعد کے کسی شخص نے اس نسخے کی نقل کرتے وقت ان حواشی کو متن میں داخل کردیا اور دوسرے اشخاص کے لئے یہ غلطفہمی پیدا ہونے کا موقع مہیا ہوگیا کہ ان کا جامع خان آرزو ہے ۔»[1]

متنی حقائق کی جستجو کے ضمن میں ایک اور مسئلہ متنی روایت کے مآخذ کا ہے ۔ بعض متن ایسی قدیم روایتوں سے متعلق ہوتے ہیں جن کا سلسلہ تاریخ ادبیات میں دور تک چلا جاتا ہے اور اس میں ایک سے زیادہ زبانوں کے متن شامل ہوتے ہیں ۔ مثلا قصۂ حسن و دل کی مختلف روایتوں کا ذکر کرتے ہوئے جاوید وششٹ لکھتے ہیں :

« مختلف زبانوں میں قصۂ حسن و دل کی طویل فہرست سے میں یہاں صرف ایک مختصر سا خاکہ پیش کرتا ہوں ۔

---

١ اردو ادب ، جولائی تا دسمبر ٥٣ ، ص ١٠٣

زبان	سن تصنیف	زمانے کا فرق	نام مصنف	نام کتاب
سنسکرت	تقریباً ۱۰۵۱ع	اصل قصہ	کرشن مشر	پربودھ چندر اودے
گجراتی	۱۳۵۸ع	۳۵۸ سال بعد	جن پربھا آچاریہ	بھویہ چرت
				دستور عشاق
فارسی ایران	۱۴۳۶ع	۴۳۶ « «	فتاحی	حسن ودل (نثر
				شبستان خیال «
ترکی	۱۵۱۷ع	۵۱۷ « «	والی	حسن و دل
فارسی ہند	۱۵۵۸ع	۵۸۵ « «	مولانا صلاح الدین	مثنوی حسن ودل
دکنی اردو	۱۶۳۵	۶۳۵ « «	ملا وجہی	سب رس[1]

متنی روایت کے اخذ و استنباط پر تحقیقی گفتگو کی ایک اور مثال مذہب عشق یا قصہ گل بکاولی سے پیش کی جاسکتی ہے جس کے مرتب خلیل الرحمان داؤدی نے اس کے مختلف اجزاے ترکیبی کے مآخذ پر گفتکو کرتے ہوئے لکھا ہے:

« (۱) تاج الملوک کو گل بکاولی کی مہم سے باز رکھنے کے لئے دلبر بیسوا اسے برھمن اور شیر کی حکایت سناتی ہے. یہ حکایت پنچ تنتر کے دکنی نسخے سے ماخوذ ہے. اس کہانی کو دیاشنکر نسیم نے گلزار نسیم میں بیان نہیں کیا ہے.

« (۲) تاج الملوک نے اپنے چاروں بھائیوں کو دلبر بیسوا کی قید سے رہائی دلائی لیکن وہ بھائی بعد میں اس سے غداری کرتے ہیں. یہ حصہ الف لیلی سے لیاگیا ہے. الف لیلی میں شہزادہ خداداد کے ساتھ بھی بالکل ایسا ہی کیاگیا ہے.

« (۳) پھول یا کسی اور چیز کے آنکھوں میں لگانے کے بعد بصارت کی واپسی کا تصور حضرت یعقوب کے قصے میں موجود ہے.

« (۴) ایک لڑکی دیو سے جنس تبدیل کرکے مرد بن جاتی ہے، یہ مہا بھارت کے ادھرگ پرب سے ماخوذ ہے. جنس بدلنے کی مثالیں بیتال پچیسی کی چودھویں کہانی کے سلسلے میں دریافت کی جاچکی ہیں

« (۵) اس داستان میں جو طلسم ہے وہ ان طلسمات سے مختلف نہیں ہیں جو داستان امیرحمزہ یا بوستان خیال میں مذکور ہیں.

---

۱ ہماری زبان، ۲۲ نومبر ۱۷ ع، ص ۱۲

«(٦) اس داستان میں راجہ اندر کی محفل اس اندر سبھا سے مختلف نہیں ہے جس کا ذکر سنسکرت کی قدیم کتابوں میں ملتا ہے۔

«(۷) کامروپ میں انسان کو جانور بنا دینے کی روایت اس داستان سے پہلے موجود تھی۔

«ان داخلی شہادتوں کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس داستان کی اصل ہندوستان ہے لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ یہ کتاب کسی سنسکرت یا برج بھاشا کی کتاب کا ترجمہ نہیں ہے۔»[۱]

تحقیق روایت سے متعلق ایک نہایت اہم مسئلہ کسی نسخہ کے اصلی یا جعلی ہونے کا ہے، اسکی ایک دلچسپ مثال مالک رام صاحب نے آج کل کے تحقیق نمبر میں پیش کی ہے:

«پچھلے دنوں قاضی عبدالودود صاحب نے ایک جعلی متن سے متعلق بتایا: بہار کی پرانی خانقاہ عمادیہ کی تولیت اور سجادہ نشینی سے متعلق کچھ اختلاف پیدا ہوگیا۔ بنائے اختلاف یہ تھی کہ ایک فریق کا دعوی یہ تھا کہ دوسرے فریق کے معتقدات فاسد اور بانیء خانقاہ کے عقاید سے مختلف ہیں، اس لئے وہ تولیت کے حق دار نہیں۔ اس بنا پر جناب تمنا عمادی مجیبی پھلواری کہیں سے ایک رسالہ دریافت کرکے لائے جس کا عنوان تھا «سیدھا راستہ» دعوی یہ کیا گیا کہ یہ دستاویز خود حضرت عمادالدین قلندر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ اس سے ایک فریق کے عقاید کی تائید ہوتی تھی اور دوسرے کی تغلیط اور غالباً اسی بناء پر تولیت کا فیصلہ ہوگیا

اس رسالے کی علمی و ادبی اہمیت یہ تھی کہ اس پر تاریخ ربیع الاول سنہ ۱۰۸۱ھ درج تھی جو جولائی ۱٦۷۰ع کے مطابق ہے۔ اس طرح یہ تحریر شمالی ہند کی سب سے قدیم اردو نثر قرار پاتی ہے۔ کربل کتھا بھی اس کے بعد کی چیز ہے یہ رسالہ ایسی چالاکی سے مرتب کیا گیا تھا اور اسکی زبان بہار کی پرانی بول چال کے اس حد تک مطابق تھی کہ بڑے بڑے صاحب نظر اس سے دھوکا

۱ مذہب عشق، ص ۲۷ - ۲۵ [مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو ص ۳۰ - ۲۸]

کہا گیا ہے۔ چنانچہ اسکی تاریخی اہمیت کے پیش نظر قاضی عبدالودود صاحب نے اسے اپنے رسالے «معیار» کی اشاعت مارچ ۱۹۲۶ میں شایع کردیا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ یہ تحریر جعلی ہے اور اسکا جعل صرف ایک لفظ سے ظاہر ہو جاتا ہے اس کے ترقیمے کی فارسی عبارت ملاحظہ ہو:

‹ الحمد للہ که این رساله در مدت دو روز حسب فرمایش اہل خانۂ خود در زبان مروجۂ دیار خود نوشته که مردمان و زنان ناخوانده را در زبان مادری ایشان ذریعه معلومات ضروریـــه دینیه گردد و برائے من ذخیرۂ آخرت شود ›

«اگرچہ یہ پوری عبارت ہی اکھڑی اکھڑی سی ہے لیکن اسمیں کلیدی الفاظ «زبان مادری» کے ہیں۔ یہ ترجمہ ہے انگریزی کی ترکیب مدر ٹنگ Mother tounge کا جو اس ملک میں انگریزی تعلیم کے عام ہونے کے بعد رائج ہوئی۔ دور اورنگ زیب میں اس کے استعمال کا کیا امکان ہے»[1]

متنی حقائق اور روایات کی تحقیق کے سلسلے میں اس نوعیت کی مثالیں اور بھی مل جائیں گی۔ اصل سوال حقائق کی چھان بین کا ہے۔ جسکے ضوابط ان مثالوں سے بھی اخذ کئے جاسکتے ہیں

انتساب اور متنی روایت سے متعلق معاصر شواہد، قلمی نسخوں کی تاریخی ترتیب اور قدیم تر روایتوں کی طرف رجوع، زبان و بیان اور مصطلحات کی تحقیق، مماثل روایتوں کی چھان بین، اس ضمن میں ان محرکات کو بھی کلیتاً نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جو جعلی متن کی تیاری یا غلط انتساب کا باعث بنتی ہے۔

مصادر:

پرتھوی راج راسا حافظ محمد شیرانی، انجمن ترقی اردو، ہند دہلی ۱۹۴۳ء

مقالات شیرانی، حافظ محمود شیرانی، کتاب منزل، لاہور، ۱۹۴۸ء

مذہب عشق، مرتبہ خلیل الرحمن داؤدی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۱ء

غبارستان، قاضی عبدالودود، لیبل لیتھو پریس، پٹنا، ۱۹۵۷ء

---

۱ آج کل، اردو تحقیق نمبر، ص ۱۴-۱۳

تذکرہ گلشن سخن ، سید مسعود حسن رضوی ، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ ، ۱۹۶۵ع
تذکرہ ہندی ، مرتبہ مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو ہند ، علی گڑھ، ۱۹۳۳ع
(ترجمۂ) کشف المحجوب ، مترجم عبدالرحمن طارق ، مدنی کتب خانہ ، لاہور
اردو ادب ، جولائی تا دسمبر ، انجمن ترقی اردو ، ہند ، علی گڑھ ، ۱۹۵۳ع
آجکل ، اردو تحقیق نمبر ، اگست ۱۹۶۷ع
ہماری زبان ، ۲۲ نومبر ۱۹۷۱ع
دیوان ذوق ، مرتبہ تنویر احمد علوی ، مجلس ترقی ادب ، لاہور ، ۱۹۶۷ع
سودا ، شیخ چاند ، انجمن ترقی اردو ہند ، ۱۲۷۹ھ
دیوان ذوق ، مرتبہ ویران ، ظہیر و انور ، مطبع احمدی، شاہدرہ
دیوان ذوق ، مرتبہ مولانا محمد حسین آزاد، طبع اول
موازنۂ انیس و دبیر، شبلی نعمانی ، مطبع مفیدعام ، آگرہ ، ۱۹۰۷ع
آب حیات ، مولوی محمد حسین آزاد ، مطبع مفیدعام ، لاہور، ۱۸۸۷ع
گلشن ہند ، مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین آرزو، علمی مجلس ، دہلی ، ۱۹۶۸ع

*

٭ ابوالنصر محمد خالدی

معجزۂ فاطمہ رضؓ

از

کمترین

یہ مثنوی جن تین قلمی نسخوں سے مرتب ہوئی ہے ان کا اجمالی وصف یہ ہے۔

الف: یہ نسخہ راقم کے کرم فرما حمایت المقیت صاحب صدیقی بی۔ اے کی وساطت سے چند روز کے لیے عاریۃً ملا تھا۔ نسخہ پر کوئی ترقیمہ نہیں ہے۔ متن کی ابتدا میں اس کا نام «معجزۂ فاطمہ رضؓ» درج ہے۔ یہاں یہی عنوان اختیار کیا گیا ہے۔ پورا نسخہ دکھنی کتابوں کے عام و مروجہ نسخ نما خط میں لکھا ہوا ہے اور زیادہ تر صحیح ہے۔ ہر صفحہ پر گیارہ یا تیرہ سطریں ہیں۔ یہ نسخہ «حکایت عجب یک سنو دردمند سنے کھلیں دل کے قفلاں کے بند» سے شروع ہوتا ہے۔ مرتبہ مثنوی میں یہ آٹھویں بیت ہے۔ مرتب شدہ مثنوی کے لحاظ سے اس اس نسخہ میں آخری بیت کے سوا چند اور ابیات بھی نہیں ہیں۔ ایسے ابیات کی برمحل نشان دہی کردی گئی ہے۔ آخر میں ایک عبارت جو بطور بیت ثبت کی گئی ہے یہ ہے:

الٰہی لکھنہار پڑنہار سنے والے کے تئیں　　سر عاجز کساں کو رکھ جنت میں ویں

ب: کتب خانۂ آصفیہ کا نسخہ[1] «مثنوی در مناجات بی بی فاطمہ برائے مغفرت امت» سے موسوم ہے۔ غیرمحتاط جزوبندی کی وجہ سے درمیان میں دو ورق مقدم و مؤخر ہوگئے ہیں۔ یہ نسخہ بھی «حکایت عجب الخ» سے شروع ہوتا ہے۔ ناقص الآخر ہونے کی وجہ سے اس بیت پر ختم ہو جاتا ہے جو مرتبہ مثنوی میں نشان تین سو اکاسی پر ہے۔ یعنی «دعا فاطمہ نور قوسین کے - اور اس کے دونوں قرۃ العین کے»

* ڈاکٹر ابوالنصر محمد خالدی، ام. اے. (عثمانیہ)؛ ڈی. لٹ. (قاہرہ)؛ ریڈر، شعبۂ تاریخ، جامعۂ عثمانیہ، حیدر آباد۔

بعد کا صفحہ معرا ہے۔ حسب توقع ترقیمہ ندارد۔

کتب خانۂ مختاریہ[۲] «غار نامہ» سے موسوم ہے۔ یہ عنوان غالباً ناظم کا نہیں بلکہ کسی اور کاتب کا دیا ہوا ہے۔ اس نسخہ کا ترقیمہ ہے: «تمت تمام شد۔ کتاب غارنامہ شانز دہم رجب المرجب بروز دوشنبہ بوقت (؟) بعد نماز عصر ۱۲۶۷ ھ۔» یہ نسخہ مکمل ہے۔ سات تمہیدی بیتیں صرف اسی میں ہیں گو درمیان میں بعض بعض بیتیں نسخہ الف و ب سے کم بھی ہیں۔ مرتبہ مثنوی میں حذف و اضافہ کی برمحل نشاندہی کردی گئی ہے۔ الف و ب کے ساتھ اس نسخہ کا بامعان نظر مقابلہ کیا جائے تو کچھ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً یہ اصلاح شدہ نسخہ ہے۔ چونکہ یہ اصلاحیں اکثر معنوی ہیں، لسانی بہت کم ہیں اس لئے خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ اصلاحیں خود ناظم مثنوی کی ہوں لیکن یہ محض ظن و تخمین ہے

جہاں جہاں مرتب شدہ مثنوی میں اختلاف نسخ پایا گیا وہاں وہاں یہ سب اختلاف اپنی اپنی جگہ بتا دئے گئے ہیں۔ ناظرین کو توجہ دلانے کے لئے ادھر ادھر سے صرف چند اختلاف، جو بہ ظن راقم اصلاحیں ہیں، بطور مثال مع وجہ اصلاح یہاں بھی نقل کی جاتی ہیں:

۱۔ ش ۴۳:

علی ہور صدیق عثمان عمر   یو چاروں اپس میں ہوئے تل اپر
اے صدیق و عثمان عمر و علی   یہ چاروں کے دل میں پڑی بے کلی

اصلاح سے پوری تاریخی ترتیب نہ سہی کچھ نہ کچھ تو بہر حال پیدا ہوگئی اور یہ کہ دوسرے مصرع کے معنی یوں ہوتے: آپس میں نیچے اوپر ہوئے۔ اس سے باہم لڑ پڑے کا مفہوم بھی نکل سکتا تھا اصلاح سے ان بزرگوں کی حقیقی حالت نمایاں ہو گئی اور سقم جاتا رہا۔

۲۔ ش ۴۹: ع ہوا انبیاء کا کتے تاج تو
جتے انبیاء کا ہوا تاج تو

پہلے کتے کو کہتے کے معنی میں لیں تو خبر یقینی نہیں رہی اور اگر کتنے ہی کے معنی میں لیں تو اس میں سب انبیاء شامل نہیں ہوسکتے تھے۔ مزید برآں اس سے تعقید بھی پیدا ہوتی ہے۔ شاعر کہنا چاہتا ہے کتنے ہی انبیاء اور کہہ گیا کتنے ہی تاج۔ اصلاح سے یہ دونوں خامیاں دور ہوگئیں۔

۳۔ ش ۵٦ : ع چلے ہیں نین سوں ندیاں پور ہو
چلی تھی نین سے جو ندیاں کی رو

اصل میں غلو تھا. ترمیم سے صرف مبالغہ رہ گیا جو غلو یا اغراق کے مقابلہ میں یقیناً مستحسن ہے. آنے والی مثنوی میں ایسی ہی ترمیموں پر غور کرنے کے لئے غالباً اتنی مثالیں کافی ہوں گی پوری مثنوی میں اصلاحوں کی تعداد تین ہندسوں تک پہنچ گئی ہے.

بعض ترمیمیں یا اصلاحیں صرف ایک ہی لفظ تک محدود ہیں «یک لفظی» اصلاح ایک ایسا ادبی یا شعری مظہر ہے جو شاید بہت سی زبانوں میں مشترک ہے.

عربی داں جانتے ہیں کہ شعر عرب میں یہ مظہر بکثرت پایا جاتا ہے کیونکہ وہاں فن کتابت کے عام نہ ہونے سے پہلے شعر زیادہ تر سینہ بہ سینہ ہی نقل ہوتے تھے. چونکہ نقل کا ذریعہ بےجان آلہ نہیں بلکہ انسانی تھا اس لئے مسامرہ یا مشاعرہ میں جب کوئی شخص شعر سناتا تو وہ خود اپنی طبعی فطانت و شعریت کی بناء پر شعر کے کہے ہوئے لفظ کی بجائے اپنی طرف سے کوئی بہتر لفظ رکھ دیتا چونکہ ایسی ترمیم واقعی اصلاح ہوتی اس لئے وہی روایت چل پڑتی. عربی و فارسی کی دو تین مثالوں پر غور کیجئے تو بات بالکل واضح ہو جائے گی. معلقات کے پہلے قصیدہ کی پہلی ہی بیت «قفا نبک» کا دوسرا مصرع ہے: «بسقط اللویٰ بین الدخول و حومل». امام لغت اصمعی (م ۲۱۵) کی روایت بہ حرف عطف ہی ہے اور اس پر ان کو اصرار بھی تھا لیکن مشہور «بین الدخول فحومل» ہے. اس بیان میں واؤ اور فا کے باریک فرق کی تفصیل کے لئے معلقات کی کوئی مفصل شرح دیکھی جا سکتی ہے[۴]

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے نہایت مرغوب اشعار میں نابغہ ذبیانی کا مندرجہ ذیل شعر بھی تھا:

فلست بمستبق أخاً لا تلمّہ   إلی شعثٍ ایّ الرجال المھذّب

دوسری روایت (علی شعث) کی ہے لیکن إلی بمعنی مع کی خوبی کو نہیں پہنچتی[۵]

زھیر کا مشہور شعر ہے:

فلو کان حمد یخلد الناس لم تمت   ولکن حمد الناس لیس بمُخلد

لیکن روایت جیدہ بصیغہ حاضر نہیں بلکہ بصیغہ غائب «لم یمت» ہے گو شاعر نے بہ روایت اعلم شنتمیری وغیرہ غالباً بصیغہ حاضر ہی کہا تھا۔[6]

عربی میں یک لفظی اصلاح کے مظہر کی کثرت شاید اس لئے بھی ہے کہ شعرائے عرب خصوصاً اسلامی دور سے پہلے کے شعراء کا کلام ارتجالی یعنی فی البدیہہ ہوتا تھا۔ مگر فارسی کلام میں بھی ایسی مثالیں اچھی خاصی تعداد میں پائی جاتی ہیں۔ حافظ (م ۷۹۱ھ) کے دیوان کی روایت ہے:

شہریست پر حریفان از ہر طرف نگارے　　یاران صلائے عشق ست گر می‌کنید کارے

لیکن بعض اہل سخن کی زبان پر «عشق» کی بجائے «عام» ہے۔

عرفی (م ۹۹۹) کا شعر بروایت دیوان یوں ہے:

ہر کس نہ شناسندۂ راز است وگرنہ　　این‌ہا ہمہ راز است کہ مفہوم عوام است

لیکن بعض ثقہ بزرگوں کی زبانوں پر مفہوم کی بجائے «معلوم» چڑھا ہوا ہے۔

خسرو دہلوی کا شعر ہے:

زبان شوخ من ترکی و من ترکی نمی دانم　　چہ خوش بودی اگر بودی زبانش در دہان من

لیکن بعض سخن دانوں کی زبان پر «شوخ» کی بجائے «یار» ہے۔[7]

یہ اصلاح ہے یا فساد؟ اس کا تصفیہ تو سخن سنجان فارس کریں۔ یہاں صرف اتنا کہنا تھا کہ یک لفظی ترمیموں سے فارسی کلام بھی خالی نہیں ہے۔

عربی و فارسی کلام میں کم یا زیادہ لفظی ترمیمیں بہر طور ہوتی رہی ہیں تو بظاہر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اردو میں کیوں نہ ہوں۔ دفتروں اور دیوانوں کی تلاش کے بغیر ایسی دو تین اصلاحیں جو فوراً یاد آرہی ہیں یہاں نقل کی جاتی ہیں

اقبال کی بیت ہے۔

تو میری رات کو انوار سے محروم نہ کر　　تیرے پیمانے میں ہے ماہ تمام اے ساقی

بال جبریل کے مطبوعہ نسخہ میں «انوار» کی بجائے «مہتاب» ہے۔

بال جبریل ہی میں ہے:

جس کا عمل ہے بےغرض اس کی جزا کچھ اور ہے
حور و خیام سے گذر بادہ و جام سے گذر

لیکن ایک مداح اقبال ادیب نے «حور و قصور سے گذر الخ» پڑھا[۸]
حسرت موہانی کا شعر:[۹]

پھر روح کو محو ساز کردے   پھر چھیڑ کوئی نئی کہانی

ہے۔ لیکن ایک محفل میں اس طرح سنایا گیا:

پھر روح کو محو ساز کردے   پھر چھیڑ کوئی نیا ترانہ

مندرجہ صدر مثالوں سے واضح ہے کہ کسی شعر میں «یک لفظی» اصلاح (بحر کے صرف ایک ہی رکن یا جزو رکن کی حد تک) کا مظہر اردو میں بھی کمیاب نہیں اور یہ عموماً نا شاعر لیکن سخن فہم و سخن داں سے ظہور میں آتا ہے۔ پیش نظر مثنوی میں بھی ایسی اصلاحیں قابل لحاظ تعداد میں موجود ہیں۔ مثلاً:

ش۲۲:   ع   تو سوتا سدا دل میں ہو پر خطر

«پر خطر» کی بجائے «با خطر» یا

ش۵۷:   ع   لگی سخت رونے کے تئیں در حزن

«در حزن» کی بجائے «از حزن» یا

ش۴۷:   ع   ہوئے بے بصر نیں رہا ہم میں فام

«میں» کی بجائے «کو» وقس علی ھذا۔

مثنوی کی تنظیم کا عہد و مقام معلوم نہ ہو سکا۔ کسی متعلقہ تاریخ و تذکرہ کا کیا ذکر، «معجزہ» میں بھی ان کی طرف کوئی اشارہ یا کنایہ نہیں ملتا۔ لغت، صرف، نحو اور اسلوب سے کچھ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً یہ گیارھویں صدی ہجری کے ربع آخر اور گول کنڈہ کے قرب وجوار میں تالیف ہوئی تھی۔

ناظم مثنوی کے نام کا بھی ٹھیک ٹھیک تعین نہیں ہو سکا، البتـــہ چار سو ترپن ویں بیت

نہیں گور کا یاد تجھ کو کدیں   بسر کر گیا مرگ کو اے کمیں

سے اس کے مؤلف کا تخلص کمین ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

ہم نہیں جانتے کہ کمین کون تھا۔ اس لاعلمی کی وجہ سے گو مثنوی کی علت فاعلی کا ایک رخ — مؤلف کی زندگی کے وہ سوانح یا خارجی عوامل جن سے واقف ہونے پر مثنوی کو علمی حیثیت سے کماحقہ سمجھنے میں مدد ملے، ہماری نظر سے اوجھل ہے۔ تاہم خرد متن کے مطالعـــہ سے مؤلف کی افتاد طبع

اور اس کی ادبی و تہذیبی پرداخت کا تعین کرنا زیادہ دشوار نہیں معلوم ہوتا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ کمین کون تھا، نہ بتایا جا سکے لیکن کمین کیسا تھا، کا جواب دیا جاسکتا ہے اور وہ اس طرح کہ علت فاعلی متعین کرنے کی کوشش کو ہم تھوڑی دیر کے لیے ملتوی کردیں اور مثنوی کی علت مادی پر توجہ کریں کیونکہ یہاں علت فاعلی کی نوعیت و حیثیت وغیرہ متعین کرنے کا انحصار بہت کچھ اسی پر ہے اس لئے قدرے تقدیم و تاخیر ناگزیر ہے۔

کمین نے اپنی مثنوی میں جو مواد استعمال کیا ہے اس پر اگر ایک سرسری ہی نظر ڈالی جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ حادثۂ کربلا کے سوا بیان کردہ حوادث کا کوئی جزو بھی تاریخی کیا نیم تاریخی حیثیت بھی نہیں رکھتا۔ ان «واقعات» کی حیثیت کم و بیش ایسی ہے جیسی کہ مثلاً یہ افسانہ کہ:

پراچین زمانہ میں بھارت و لنکا میں ایک بڑے معرکہ کا رن پڑا تھا راون کے راکھششوں کی فوج کو تباہ کرنے کے لئے ہنومان جی نے شمال سے بڑے بڑے پتھر لا کر ان کے سروں پر برسائے۔

دکھن کی پہاڑیاں شمال سے لائے ہوئے انہیں پتھروں کا ڈھیر ہیں۔ چنانچہ شمال کا علاقہ کف دست میدان اور دکھن اسی لئے پتھریلا ہے!

مدتوں سے یہاں کے نیم ادبی و نیم تہذیبی ماحول میں اس طرح کے بے شمار افسانے پھیلے ہوئے تھے۔ مسلمانوں میں بھی کچھ اسلامی تاریخی ناموں کے سہارے اسی کے مماثل بکثرت افسانے تراشے گئے جن مین حادثۂ کربلا کو خصوصی امتیاز حاصل ہوا کیونکہ بہمنیوں کے آخری دور سے یہاں ایرانیوں، تاریخ دکھن کی اصطلاح میں آفاقیوں یا غریبوں کی فوج در فوج آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور یہی وہ زمانہ ہے جب کہ ایران میں اسلامی عربی تہذیب اپنے زوال کے آخری مرحلے طے کر رہی تھی اور صفویوں کی نوخیز خالص ایرانی قومی شیعی مملکت پوری قوت سے رو بہ عروج تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے زمانے میں جو ایرانی دکھن وارد ہوئے وہ اپنے ساتھ بہت سے ایسے افسانے لیتے آئے تھے جن میں آل علی اور بنو فاطمہ کے معمولی انسانی واقعات کو بھی خرق عادت حوادث کی صورت میں پیش کیا گیا تھا اور ان سے ایسے اعمال منسوب کئے گئے تھے جو اسلامی عربی شخصیتوں کے کارناموں سے کہیں زیادہ ہندی پاستانی شخصیتوں یا دیوتاؤں کی افسانوی کرامتوں سے مشابہ

تھے۔ اس مشابہت یا مماثلت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ایران کا قومی و نسلی مزاج عربی اسلامی تہذیب سے زیادہ ہندی تہذیب کے قریب تھا۔

اس ایرانی ہندی اثر کے ساتھ یہ واقعہ بھی یاد رہے کہ اگرچہ دکھن میں شیعی مذہب کو سرکاری حیثیت سنہ نو سو آٹھ ہجری ہی میں حاصل ہو گئی تھی لیکن یہ حیثیت صرف مادی قوت اور فوجی تنظیم کی بنیاد پر قائم ہوئی تھی۔ اس کی اعتقادی یا فکری بنیاد بیس سال بعد سنہ نو سو اٹھائیس ہجری میں اس وقت استوار ہوئی جب کہ شاہ طاہر (متوفی ۹۵٦ ھ) جیسے جید عالم یہاں وارد ہوئے اور انہوں نے یہاں کے سنی و مہدوی عالموں پر بحث و مناظرہ کے ذریعہ اپنی علمیت کی دھاک بٹھائی۔ اس طرح جب فکری و مادی دونوں حیثیتوں سے شیعت غالب ہوئی تو ایسے قصص و حکایات کو پھیلنے کا زیادہ موقع ملا جن میں سیدہ فاطمہ یا آپ کے فرزند کے نام کے سہارے بہت سی حیرت انگیز داستانیں وضع ہوئیں جو یہاں کے ماحول سے پوری پوری مطابقت رکھتی تھیں۔

آپ دیکھیں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم بارہ سو سال پہلے کے ایک عرب قریہ میں سیدہ عائشہ کے کچے حجرے میں نہیں بلکہ گیارھویں صدی ہجری کے کسی طرف دار یا سپہ سالار کی طرح ہندوستان کے ایک بارونق شہر میں رہتے ہیں۔ آپ کی دیوڑھی پر پہرہ چوکی ہے اور آپ محل میں آرام سے میٹھی نیند سو رہے ہیں!

جب آپ صلعم کسی سے کچھ کہے سنے بغیر لرزاں و ترساں جنگل کی راہ لیتے ہیں تو آپ کو گلی کوچوں میں، پرانی عمارتوں میں، فقیروں کے تکیوں اور خانقاہوں میں، باغوں اور سیر گاہوں میں تلاش کیا جاتا ہے آپ ایسے شہر میں رہتے ہیں جہاں بڑے بڑے پل ہیں، بڑی بڑی غدار باؤلیاں اور وسیع و عریض مہمان سرائیں ہیں!!

اس سے ظاہر ہے کہ یہ پہلی صدی ہجری کا سادہ سا حجازی قریہ نہیں بلکہ بیجاپور یا گول کنڈہ کا کوئی غدار شہر ہے!

جب آپ صلعم شہر میں کسی جگہ نہیں ملتے تو اطراف و جوانب کے راجوں مہاراجوں ہی کے نہیں بلکہ ایران و شام و روم کے والیوں کے نام خط دوڑائے جاتے ہیں کہ اگر وہاں آپ صلعم آئے ہوں تو مطلع کیا جائے۔

جب آپ صلعم واپس ہوئے تو حسب توقع ملکوں ملکوں کے بادشاہ حاضر دربار ہوئے انہوں نے آپ پر سے جواہر کے ہزاروں طبق نثار کئے اور وہ کئی روز تک آپ کی خدمت بجا لا کر واپس ہوئے!

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غار حراء جیسے کسی مقام سے بالکل عادی و معمولی واپسی نہیں بلکہ گویا کسی مہاراجہ کی اپنی راجدھانی میں فاتحانہ بازگشت ہے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی سیدہ فاطمہ رض اللہ سے دعا کرنے کے لئے مکان کے سب سے اندرونی حجرے میں بیٹھ کر تنہائی میں سجدہ ریز نہیں ہوتیں بلکہ ایک سن رسیدہ ایرانی بانو کی طرح اجنبیوں اور غیرمحرموں کے درمیان کھلے میدان میں سب کے سامنے اپنے لڑکوں کے چہروں پر خاک ملتیں، اپنے سر سے پلو اور چہرے سے چادر نکال کر بال بکھیرے ہوئے نعرہ مارتی اور چلاتی ہیں کہ الہی اس وقت میرے بابا کی امت کو بخش دے «نہیں تو مجھے بھی جہنم میں ڈال»

اس مطالعہ سے ثابت ہوا کہ «معجزۂ فاطمہ» میں جس مواد سے کام لیا گیا ہے اس کی نوعیت و حیثیت مختلف مذاہب کے مجموعہ کی طرح ایک ایسے آمیزہ کی ہے جس کے اکثر اجزاء ایک دوسرے سے متباین بلکہ بعض اجزاء تو ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔

مثنوی کی علت مادی کی بحث سے یہ بات بھی ظاہر ہو گئی کہ اس کی علت فاعلی یعنی ناظم اپنے تہذیبی ماحول کا آفریدہ تو ہے ہی اس کی پابندیوں کو خوشی خوشی قبول کرنے والا بھی ہے۔ وہ ایسے معاشرہ کی زنجیروں میں کسا ہوا ہے جو احساس تناسب کا شعور رکھتا ہے اور نہ فرق مراتب کا احساس۔ کمین یہ ضرور سنتا ہوگا کہ باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار، زبان سے یہ شہادت بھی دیتا ہے کہ محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں لیکن اس کے باوجود وہ ہمیں بتاتا ہے کہ

رسو اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آہ و زاری سن کر انسان تو کیا جانور بھی

ع نہ ہلتے نہ چلتے نہ چرتے ہیں وہ!

بھیڑ بکری پر کیا منحصر ہے، درندے بھی غم کے مارے ڈھال ہیں حتی کہ پرندے بھی آپ کی تکلیف دیکھ کر

ع ہو بے ہوش جھاڑاں سے گرتے ہیں وہ!

پرندے ، چرندے ، درندے تو بہرحال ذی روح ہیں اس لئے انسان کے ہم جنس کہے جاتے ہیں اگر وہ انتہائی برگزیدہ انسان کے غم میں شریک ہوں تو شاید زیادہ حیرت نہ ہونی چاہئے لیکن عالم نبات ، جس میں ارادہ تک مفقود ، وہ بھی حزن و غم کے مارے بدحال ہے ۔ درختوں کے پتے پیلے پڑگئے ۔ پھل پھول تو کبھی کے جھڑ پڑے ، غرض

نہ معلوم کیا باد طوفان ہے جناور جنگل سب پریشان ہے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین دن سے بغیر کچھ کھائے پئے اپنا سر خاک پر رکھے ، گویا تپسیا کرتے ہوئے اتنا روتے ہیں کہ آنسوؤں کی نہریں جاری ہوجاتی ہیں ۔ جبرئیل و میکائیل جیسے اولوالعزم فرشتے ان نہروں سے اپنی مشکیں بھر بھر کر جنت لے جاتے اور وہاں حوروں میں بطور تبرک تقسیم کرتے ہیں!

کمین اور اس جیسے دوسرے مثنوی نگاروں نے ھندی ماحول سے توافق پذیری کا جو نمونہ پیش کیا ہے اس کی مثالیں صرف دکھنی ہی میں نہیں بلکہ ہندوستان کے ایک سے زائد علاقوں میں بھی ملتی ہے ۔ بہرحال کمین اور اس جیسے دوسرے نیک نہاد و سادہ لوح ناظموں کے یہاں ماحول پر قابو پانے کی سعی و کرشش کی کیفیت و کمیت کا پتہ لگانا یا ان سے اجتہاد و انقلاب جیسی کسی فکر کی تلاش کرنا گویا خود اپنی بے بصری کا ثبوت فراہم کرنا ہے ۔

مثنوی کی علت فاعلی و مادی کی نوعیت متعین ہو جانے کے بعد اس کی علت صوری یعنی ہیئت پر غور کرنا اور یہ دیکھنا ہے کہ ایک تقلید زدہ شخص نے ادھر ادھر پھیلے ہوئے مختلف النوع مواد کی جدید ترتیب و ترکیب سے جو نئی شکل و صورت بنائی ہے وہ کیسی ہے

مثنوی کی ہیئت کا جائزہ لیتے ہوئے اگر ہم یہ واقعہ اپنے ذہن میں تازہ کرلیں تو مناسب ہے کہ شعر و ادب ہی میں نہیں بلکہ دوسرے فنون لطیفہ میں بھی کم و بیش اسی طرح کا عمل بار بار ہوا ہے اور اس کا سلسلہ اب بھی جاری ہے مثلاً جب قرطاجنہ پر رومیوں کا قبضہ ہوا تو انہوں نے قدیم معبدوں کے کھنڈروں ہی پر اپنے ہیکل وغیرہ بنائے اور جب مسیحیت پھیلی تو انہی ہیکلوں کے ملبہ سے بعض کلیسا و کنیسہ تعمیر ہوئے ۔ ہندوستان میں تو ایسے واقعات بہت زیادہ ہی ہوئے ہیں چنانچہ جب آریائی برہمنی مذہب کو زوال اور بدھ مت کو عروج ہوا تو بدھیوں نے

بڑے بڑے بت کدے توڑ کر ان کے اینٹ پتھر سے اپنے اسٹوپے اور وہار بنا لئے اور جب بدھیوں کو برہمنوں نے شکست دیدی تو بدھی عبادت گاہوں میں تھوڑی یا بہت ترمیم کرکے انہیں اپنے مندروں کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا ۔

بے کار و بے مصرف عمارتوں کے اینٹ پتھر سے نئے نئے ایوان بستے ہی رہے ہیں ۔ ادب و فن کے مورخ یا نقاد کو ظاہر ہے کہ تخریب و تعمیر کے ان کثیر العمل حوادث و واقعات کے دینی ، معاشری و معاشی اسباب کا کھوج لگانے اور ان کا تجزیہ کرنے سے براہ راست کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی وہ تو اس پر غور کریگا کہ جدید تعمیر کا نقشہ کیسا ہے ؟ کون سی شےء کہاں کس طرح لگائی گئی ہے ۔ اور وہ یہ دیکھے گا کہ مختلف اشیاء کی ترکیب سے جو جدید شکل وجود میں آتی ہے فن پارہ کی حیثیت سے اس کا درجہ و مرتبہ کیا ہے ؟

اس مثنوی کو اگر اس حیثیت سے دیکھا جائے تو بنظر اول ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ امین نے اپنے قصیدہ میں جو قصہ نظم کیا تھا کمین نے اس کے اصل اجزاء یا اجمالی بیان کو صرف وسعت ہی نہیں دی ہے بلکہ اپنے مقصد کے لئے مثنوی میں ایک نئے جزو — حادثۂ کربلا کا بھی اضافہ کیا ہے ۔ امین کا قصیدہ پڑھنے کے بعد اس اضافہ کا تصور کرنا بہت مشکل تھا کیونکہ سیدہ فاطمہؓ کی دعا کے مقبول ہونے پر ع

لے آئے نبی کو ساتھ سب پہنچا دئیے گھر کے بھیتر پر قصہ کا ختم ہو جانا بالکل طبعی تھا لیکن کمین نے رسول اللہ صلعم کے ذریعہ اس موقع پر ایک ایسا سوال کیا ہے جو بالکل برمحل اور فطری ہے آپ (صلعم) اللہ تعالی سے پوچھتے ہیں :

الہی کرم مجھ اپر نت دھرے دعا میری ہر دم اجابت کرے بیت ۳۳۹
کیا نین دن مجھ کو حیران کیوں ہوا فاطمہؓ پر مہربان کیوں بیت ۴۰۲

اس طرح حادثۂ کربلا کا اضافہ ضمیمہ نہیں بلکہ اصل ہی کا ایک لازمی جزو ہو جاتا ہے ۔ یوں تو اصل قصہ کا منصوبہ ہی ایسا شاطرانہ تھا کہ واقعات کے ہر موڑ پر قاری یا سامع ایک ایسی منزل پر پہنچ جاتا ہے جہاں وہ دم لئے بغیر ہی اگلی منزل کی طرف بڑھ جانا چاہتا ہے اور جب اس کا ذہن سیدہ کی اجابت دعا کے سبب کی طرف منتقل ہوتا ہے تو انتہا تک پہنچے بغیر اس کے شوق کا پورا

---

* مطبوعہ نوائے ادب ، جلد ۲۰ ، شمارہ ۴ (مرتب)

ہونا ناممکن ہے۔ اس طرح مثنوی کا کوئی گریز بھی بے موقع یا بےمحل نہیں معلوم ہوتا یہی اس کی ہیئت کا شاید سب سے زیادہ نمایاں وصف ہے۔ اس کی وجہ سے مثنوی کی قراءت کے دوران میں مجمع کا ایک سامع بھی جماہی لیتا ہے نہ انگڑائی حتیٰ کہ پہلو بھی نہیں بدلتا بلکہ ہمہ تن گوش بنا رہتا ہے۔

ابتداء سامع یہ خیال کرتا ہے کہ قصہ میں سب سے اہم مقام رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کا ہے غالباً شاعر بھی ہمیں یہی باور کرانا چاہتا ہے۔ قصہ کی ابتدا و اصل تو آپ صلعم کی ذات سے شروع ہوتی ہی ہے۔ آپ صلعم کی ہمہ تن رحمت ورأفت شخصیت کو نمایاں کرنے کے لئے شاعر آپ صلعم کے حزن و غم میں نباتات تک کو شریک کرادیتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ جب صحابہ ایک بدوی کو آپ کا حلیہ بتاتے ہیں تو آپ صلعم کے سر، پیشانی، زلف، بھویں، آنکھ، پلک، دیدے، پتلی، آنکھ کی سفیدی و سیاہی، دہن، ہونٹ، کان، ناک، نک پھڑی، گال، رخسار، لب، دانت، زبان، ٹھوڈی، ٹھوڈی کا گڑھا، غبغب، قد اور جثہ کی تفصیل کو چالیس ابیات تک پہنچا دیتا ہے۔ آخر آخر میں یہ بھی کہتا ہے کہ

سنو اے مسلماں ہے کاں یہ روا تمیں در گنہاں نبی در عنا

لیکن جب سیدہ غار کے سرے پر نمودار ہوتی ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ قصہ کی سب سے اہم شخصیت یہی ہے۔ قصہ کے عنوان سے قاری کا ذہن ایسا سمجھنے کے لئے پہلے ہی سے تیار بھی تھا اور جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ کے ساتھ ساتھ حیدر کرارؓ کی خدمتیں بھی بخشائش امت کے لئے مقبول نہیں ہوتیں تو اس کو اپنے اس تاثر میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ پنج تن پاک میں سیدہ فاطمہؓ ہی سب سے زیادہ ممتاز ہیں۔

بایں ہمہ اگر ذرا گہرے اترئیے یا کسی ایسے شخص کو یہ اشعار سنائیے جس کا تہذیبی و ذہنی نشو و نما اس قسم کے قصص و حکایات کے ذریعہ ہوا ہو، جس پر ہلکا یا گہرا مذہبی رنگ چڑھایا گیا ہو تو غالباً وہ سب سے زیادہ واقعۂ شہادت سے متأثر ہوگا اور اس کی جذباتی وابستگی امام حسین علیہ السلام سے پیوستہ ہوگی کیونکہ انہیں کی وجہ سے تو اس کی نجات ہوئی۔

اگر ایسا ہے تو کیا کمین کا مقصد یہ تھا کہ اس مثنوی کے ذریعہ اپنے زمانے کے مسلمانوں میں حضرت حسین علیہ السلام سے ان کے جذباتی تعلق کو گہرا کیا

جائے اور جن غیر مسلموں سے آپ کا کوئی تعلق نہ ہو ان سے آپ کا تعلق پیدا کیا جائے تا کہ اس طرح دونوں ملتوں کا نسب نما مشترک ہوجائے : اجنبیت دور ہو اور وہ ایک دوسرے کے زیادہ قریب آجائیں؟

ممکن ہے یہی ہو ۔ لیکن اگر ہم مثنوی کا مطالعہ زیادہ گہری نظر سے کریں اور اس علت کا پتہ لگانے کی کوشش کریں جس کی بناء پر قاری یا سامع کو امام حسین علیہ السلام سے والہانہ محبت ہوسکتی ہے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس کا سبب سیدنا حسین علیہ السلام کی نفس شہادت سے زیادہ شہادت کی علت ہے اور اس میں کوئی شبہہ نہیں رہتا کہ آپ نے کسی اور وجہ سے نہیں بلکہ مسلمانوں کی نجات کے لئے اپنی جان عزیز قربان کردی ۔ یہیں سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ شاعر نے ابن بابویہ وغیرہ کی طرح شفاعت اور کفارۂ مسیح کے عقیدہ کو ایک دوسرے میں مدغم کرنے کی سعی کی جیسا کہ ابھی معلوم ہوگا دکھن میں یہ آمیزہ ایرانی قافلہ کے ساتھ آیا تھا ۔

شفاعت کے معنی ہیں : الشفاعة هی سوال فعل الخیر و ترک الضرر عن الغیر لاجل الغیر علی سبیل التفرع[10] مطلب یہ کہ ایک نکو کار کا کسی خطا کار کے لئے اللہ سے عاجزانہ یہ درخواست کرنا کہ وہ اپنے کرم سے خاطی کی لغزشوں سے درگذر کرے اور اس کو اپنی رحمت سے بہرہ ور فرمائے ۔

اور کفارہ کے معنی ہیں : اگر کسی سے کوئی گناہ سرزد ہوجائے تو اللہ کے پاس یسوع مسیح گناہ گاروں کے حامی و مدد گار کی حیثیت سے موجود ہیں وہ صرف مسیحیوں ہی کے گناہوں کا نہیں بلکہ ساری دنیا کے گناہ گاروں کا کفارہ ادا کرنے کے لئے سولی پر چڑھ گئے اور ہمیں شریعت کی لعنت سے چھٹکارا دلا دیا ۔[11]

عہد نامہ جدید کی تفسیری تفصلوں اور ان کی سر چکرا دینے والی باریکیوں میں پڑے بغیر اس کا سیدھا سادہ مفہوم یہ ہے کہ سیدنا مسیح انسانوں کو جہنم کی آگ سے نجات دلانے کیلئے خود ہی سولی پر چڑھ گئے اس لئے انسانوں کا ان سے زیادہ محسن اور کون ہوسکتا ہے ۔ بڑا ہی شقی ہے جو احسان فراموشی کرے اور آپ سے اپنی محبت کا رشتہ استوار نہ کرے !

حضرت حسین علیہ السلام سے متعلق بھی بعض لوگ ، جو اپنے آپ کو بہرحال

مسلمان کہتے تھے، ایسا ہی عقیدہ رکھتے تھے۔ مسلمانوں کی تاریخ میں اس کی تحریری شہادت سب سے پہلے ابو جعفر محمد بن علی بن الحسین بن موسی بن بابویہ القمی متوفی تین سو اکیاسی ہجری کی کتابیں ہیں۔ اس نے اپنی کتاب کمال الدین و اتمام النعمۃ فی اثبات الغیبۃ و کشف الغمۃ اور کتاب العلل میں لکھا ہے کہ جس طرح سیدہ مریم علیہا السلام کا دنیا سے کوئی تعلق نہیں تھا اور وہ یکسو ہوکر ریاضت و عبادت میں لگی ہوتی تھیں سیدہ فاطمہؓ بھی قریب قریب ایسی ہی تھیں اسی لئے تو «فھی سمیت البتول مثل مریم» سیدہ مریم کی طرح آپ کو بھی بتول کہا جاتا ہے۔[۱۲] اور جس طرح سیدہ مریم کے فرزند سیدنا عیسی علیہ السلام اپنی امت کے لئے سولی پر چڑھ گئے لیکن قتل نہیں ہوئے بلکہ لوگوں کو ایسا شبہ ہوا اسی طرح حضرت حسین علیہ السلام نے بھی دشت کربلا میں شہادت حق ادا کی لیکن وہ قتل نہیں ہوئے بلکہ لوگوں کو ایسا شبہ ہوا۔ إن الحسین علیہ السلام لم یقتل و إنہ شبّہ للناس کعیسی بن مریم !!

امام حسین علیہ السلام مسلمانوں کو جہنم کی آگ سے نجات دلانے کے لئے خود ہی شہید ہوگئے اس لئے انسانوں کا ان سے زیادہ محسن اور کون ہوسکتا ہے۔ بڑا ہی شقی ہے جو احسان فراموشی کرے اور آپ سے اپنی محبت کا رشتہ استوار نہ کرے!

اس عقیدہ کا تحقیقی مطالعہ تو کسی اور جگہ کیجئے۔ براہ کرم ادھر تشریف لائیے اور سنیے امین و کمین و سیلان کیا فرماتے ہیں:

ابتدا ہی میں بطور تمہید آپ پڑھیں گے کہ اللہ اپنے رسول کی بھول چوک کا مواخذہ خود ان سے نہیں بلکہ ان کی امت سے کرے گا۔ امین کہتا ہے:

سوئے تم کیوں یا نبی بندگی بسارے تم ابھی
امت تمہاری کو سبھی ڈالوں گا میں اندر سقر بیت ۶

امین کے ساتھ کمین گلا ملاتا ہے:

سبب تیری غفلت کے اے کامیاب کروں تیری امت کو اب میں خراب بیت ۲۵

گویا ابتدا ہی سے یہ اصول مان لیا گیا ہے کہ ایک کا بوجھ دوسرے پر نہیں ڈالا جارہا ہے بلکہ اس کے برخلاف ایک کی خطا پر دوسرا سزا پاتا ہے اس سے قدرتاً خیال اس طرف جاتا ہے اور شاعر بھی غالباً اسی طرف لے جانا چاہتا

* سیلان کا مخمس اگلے شمارے میں شائع ہوگا (مرتب)

ہے کہ ایک کے صواب پر دوسرے کو جزا بھی مل سکتی ہے اور ملے گی۔

امین نے گویا آدھی بات ہی کہی اور سیدہ کی دعا پر جو واقعی شفاعت کی تعریف میں آتی ہے، اپنی کہانی ختم کردی لیکن کمین کا مقصد تو شفاعت کو کفارہ سے ملانا تھا اس لئے یہ کہنے کے بعد کہ

قضا ہوئی عبادت کی یک گھڑی بلا میری امت یو آکر کھڑی بیت ۲۴۹

چاروں یاروں کی خدمات کے معاوضہ میں امت کو بخشوانا چاہتا ہے جب جواب صاف ملتا ہے کہ:

تمہاری عبادت ہوئے گی کتی سبب اسکے بخشے خدا امتی بیت ۳۳۵

تو سیدہ اللہ تعالی کو طرح طرح کی قسمیں دیتے ہوئے عرض کرتی ہیں:

میرے نور دیدے سعادت نصاب شفاعت کو لائی ہوں تیری جناب بیت ۳۷۱

مگر یہ شفاعت کیسی ہے؟ جبرئیل کہتے ہیں:

بنو فاطمہ، فاطمہ کے طفیل کرے مغفرت تیری امت کا خیل بیت ۳۸۷

یہ کیوں؟ اس لئے کہ اول تو فاطمہؓ ہی طرح طرح کی مصیبت میں پڑی ہوئی ہیں:

فقر اور فاقہ میں نت وہ چلے نہیں ایک کپڑے سوں دوسرا ملے بیت ۴۰۹

اور پھر مصیبت بالائے مصیبت یہ کہ

مصیبت دیا اس کی اولاد پر حسین و حسن سب جتے دل جگر بیت ۴۱۱

اس لئے اللہ تعالی فرماتا ہے:

سبب اس کے شرمندہ ہوں میں تمام نہیں توڑ سکتا ہوں اس کا کلام بیت ۴۲۹

چنانچہ

سبب اس کے امت کو بخشا شتاب دعا فاطمہ کی کیا مستجاب بیت ۴۲۵

بخشایش میں تاخیر اس لئے نہیں ہوئی کہ کہیں فاطمہؓ صرف مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ کافروں کی نجات کے لئے بھی دعا نہ کر بیٹھیں! ارشاد باری ہوتا ہے:

مبادا کرے فاطمہ التجا منگے حق کنے کافراں کو دعا بیت ۴۳۴

اگر اب بھی کوئی شخص تاویل و توجیہ کرنا چاہتا ہو تو سیلان پیش بندی کرکے اس کا موقع بھی دینا نہیں چاہتا۔ اس لئے صاف و واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ:

کہا اے محمد یہ ہے حکم رب کا   کہ امت تمہاری کا چھٹکار ہوگا
کٹا دیں گے سر اپنا شبیر (و) شبّر

یہ سنتے ہی جبریل سے امر سبحاں   کہے مصطفی نے کہ اے شیرِ مرداں
عوض عاصی امت کا ہے حق کا فرماں   کریں ہم نواسوں کیتیں اپنی قرباں
کہ نا ہوئے محشر میں امت گناہ گر   بند ۱۸ واں

تو کیا واقعی ان لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ سیدنا حسین علیہ السلام نے مسلمانوں کے گناہوں کا کفارہ دینے کے لئے اپنی جان دیدی ؟ کیا امین و کمین و سیلان اور ان جیسے لوگ یہ چاہتے تھے کہ دوسرے مسلمان بھی یہی عقیدہ رکھیں ؟ کیا یہ ممکن بلکہ اغلب نہیں ہے کہ شاعر کا مقصد محض اپنے فن کا اظہار ہو ؟ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ نظمیں شہرت کی تمنا یا صلہ کی توقع پر نہیں لکھی گئیں؟ ثواب آخرت کی امید بھی ایسی چیزیں لکھنے پر ابھار سکتی ہے !

رہا مسلمانوں کے تصور شفاعت اور مسیحیوں کے کفارہ یسوع مسیح کے عقیدۂ ادغام و انضمام کا دعویٰ ، سو یہ بھی اس حد تک تو محتاج ثبوت ہی ہے کہ شاعر نے ایسا سوچ سمجھ کر بالقصد و ارادہ کیا ہے ۔ وہ تو شاعر ہے اور شاعر مختلف وادیوں میں بھٹکتا ہی رہتا ہے۔ اگر وہ سیدنا حسین علیہ السلام کی شہادت کی وجہ سے اپنے آپ کو یا دوسروں کو نجات یافتہ سمجھتا تو پھر یہ کیوں کہتا :

امت کے ٹک قول کو یاد کر   مسلمان ہے تو نکو جا بسر   بیت ۴۵۶
کتے ہیں برا گھاٹ ہے پل صراط   اتر پار جانے کو لے توشہ سات   بیت ۴۵۵

مختصر یہ کہ امین کا قصیدہ ہو یا کمین کی مثنوی یا سیلان کا مخمس ، ان منظومات کا وہ مقصد ہے ہی نہیں جس کو طالب علم مدرسہ میں بیٹھے خورد بین سے دیکھ رہے ہیں ۔

حوالے :

۱ فہرست ہاشمی م۔ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد سنہ ۱۳۸۱، ۱۹۶۱ع

۲ فہرست ہاشمی، کتب خانہ مختاریہ، ص ۵۱۸

۳ اس مثنوی کا ایک نسخہ جامعہ بمبئی کے کتب خانہ میں بھی موجود ہے۔ یہ بھی ع حکایت عجب یک السخ سے شروع ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو کتب‌خانہ مذکور کی فہرست مرتبہ عبدالقادر سرفراز، ص ۱۱۸، بمبئی۔ ۱۹۳۵ع۔ یہ نسخہ پندرہ ذی قعدہ سنہ گیارہ سو اٹھاسی ہجری میں بہ مقام میلا پور، خیرالدین خاں صمصام الدولہ ظفر جنگ کی بیوی کی فرمایش پر لکھا گیا تھا۔

۴ علاق النفیس، ظفرالدین، لاہور۔ ۱۸۸۸۔ اردو میں معلقات کی اس سے بہتر غالباً اور کوئی شرح نہیں ہے۔ اس پر محمد حسین آزاد اور محمد عبداللہ ٹونکی کی مختصر تقریظیں بھی ہیں۔

۵ طبقات فحول الشعراء، محمد بن سلام الجمحی، مصر، ۱۹۵۲، ص ۴۷

۶ دیوان زہیر، مصر، ۱۳۶۳ھ ص ۲۳۶

۷ حافظ، عرفی و خسرو کے دیوان کئی بار چھپے ہیں۔ محولہ اشعار متعلقہ ردیف و قافیہ میں بہ آسانی مل جائیں گے۔

۸ بال جبریل، لاہور، ۱۹۳۵، ص ۱۸ و ۴۶

۹ انتخاب حسرت۔

۱۰ کشاف اصطلاحات الفنون، محمد علی تھانوی، کلکتہ، ۱۸۴۸ع

۱۱ عہد نامہ جدید، یوحنا کا پہلا عام مکتوب۔ تیسرا باب، پہلا اور دوسرا فقرہ۔ نیز پولس رسول کا مکتوب بنام گلتین۔ تیسرا باب فقرہ تیرھواں و چودھواں۔

۱۲ کتاب مذکورطبع یورپ۔ ۱۹۰۱۔ ص گیارہ اور آگے، نیز کتاب الخصال۔ ایران۔ ۱۳۰۲۔ جزدوم۔ مختصر حوالے کے لئے ملاحظہ ہو الحضارۃ الاسلامیۃ۔ مصر۔ ۱۳۶۶۔ پہلا جز فصل الخامس، الشیعۃ۔

معجزۂ فاطمہ

از

کمین

کریما کرم بخش کرتار تو　　کرنہار بندے کے تئیں پیار تو
تو کر پیار منگتا ہوں توفیق میں　　کہوں معجزہ کھول تحقیق میں
کرے حق طفیل نبی و بتول　　مرے دین و دنیا کے مطلب حصول
دعا خیر کا حق میں میرے کرو　　سدا شوق سوں تم یہ قصہ پڑو[1]
الٰہی بڑا ہے نگہبان تو　　رکھے حفظ میں ہر دم ایمان تو
جو پڑنا[2] نہ آتا اچھے کس کے تئیں　　پڑاویں[3] دگر کن[4] سنے اس کے تئیں
کہوں یک حکایت عجب یو سندر[5]　　نبی کی امت[6] پر کھڑیا سو خبر[7]
حکایت عجب یک سنو دردمند　　سنے تو کھلیں دل کے قفلاں کے بند[8]
سنو اس کے تئیں کان دے دل سوں سب　　کتے ہیں[9] محمد رسول عرب
کریں خواب جب رات کو نیک نام　　اٹھیں دوپہر شب کے تئیں مستدام
عبادت کریں با نیاز و الم　　رہیں یاد میں رب کے تا صبح دم
کتے[10] عائشہ کے محل ایک رات　　سوتے[11] تھے نبی خوب آرام سات
لگی تھی رکتی نیند میٹھی تمام　　سوتے تھے فراغت سوں خیرالانام
سوتے اس وضع ہو کو جب دل کشاد　　ہوی دوپہر رات سوں کچھ زیاد[12]
سوویسے میں جبریل پونچے[13] شتاب　　لے آئے خدا سوں پیام عتاب

۱　پڑھو
۲　پڑھنا
۳　پڑھائیں
۴　پاس
۵　بنون غنہ
۶　بہ تخفیف میم
۷　یہاں تک صرف نسخۂ م۔
۸　یہاں سے تینوں نسخے متفق علیہ۔
۹　کہتے ہیں (کہ)
۱۰　کہتے (ہیں کہ)
۱۱　واو خارج از تقطیع (خ‍ت)
۱۲　م - ہوی دوپہر شب سو تب کچھ زیاد
۱۳　پہونچے

اٹھائے نبی کو ادب سوں تمام[1]
ہزاراں نیازاں و کیتے[2] سلام[3]

کہے: اے رسول خدا نامدار
ہوے آج کیوں تم فراغت شعار

کیا حکم سبحاں تمارے پو یوں
سوتا مست یوں نیند میں آجکیوں[4]

عبادت کو کیوں نیں[5] اٹھا رات کوں
سوتا کیوں زیادہ ادھی رات سوں

لگی نیند کیوں تجھ کو آرام کی
نہیں فکر واں کے سرانجام کی

گیا آخرت کو سراسر تو بھول
رہیا یاد سوں آج کیوں بےحصول[6]

تو سوتا سدا دل میں ہو پر خطر[7]
سوتا آج کیوں تو جمیعت پکڑ

تجھے بندگی کے سبب میں کیا
جتے انبیا پر شرف تجھ دیا

بندے کو بزرگی عبادت سوں ہے
بندہ او جو ہر دم عبادت میں رہے

سبب تیری غفلت کے اے کامیاب
کروں تیری امت کو اب میں خراب[8]

دھروں تجھ امت پر عذاباں کٹھن
جلاؤں گا دوزخ منے رات دن

غضب میں گرفتار ان کو[9] کروں
جہنم میں ہفتم لے جاکر دھروں

جلاؤں ابد لگ سدا بے قیاس
جہنم سیں ہرگز نہ دے ووں خلاص

سنے ہیں نبی جب عتاب خدا
ہوا خوف سوں تب سدو بد[10] جدا[11]

جتے تن کے اعضا لرزنے لگے
بندے بند دہشت اکڑنے لگے[12]

ہوا سخت بریان لرزا تمام
مبارک بدن سوں گیا ہوش فام[13]

یکندر[14] بدن سب لہو کھل بلیا
جگر پھٹ نین سوں ابل کر چلیا

---

۱ م - ... کو او خواب سے تمام
۲ کتنے ہی
۳ م - ہزاروں نیازوں سے کیتے سلام
۴ ب - سوتا مست ہو الخ
۵ نہیں
۶ الف - رہیا آج کیوں یاد سوں بے حصول
۷ ب - باخطر
۸ الف - کروں میں امت کو تری اب خراب
۹ ب - انوں کو
۱۰ سدھ، بدھ.
۱۱ ب و م - ... بندے بند جدا
۱۲ ب و م - بندے بند دہشت اکن تکبکے
۱۳ م ندارد - الف و ب میں موجود، فام - فہم
۱۴ یک، اندر - جملہ، سب کے سب - کل

مبارک بدن سوں فوارے اڑے　　انجو یوں چلے جوں ندی کے جھرے[۱]
نہیں کس سوں بولے سخن یک حرف　　چلے وینچ[۲] روتے جنگل کیطرف
گئے جب شہنشاہ جنگل کے دھیر　　ہوا ماتمی عائشہ کا سریر
یکندر بدن سب ہوا بے قرار　　لگے سخت رونے کے تیں زار زار
یکایک اجالا ہوا چو کدن[۴]　　نکل آنیا سور مشرق رخن[۵]
سو دیوڑی اپر عائشہ کے تمام　　صحابہ[۶] ہوئے جمع سب خاص و عام
پچھیں چار یاراں دل و جان سوں　　پوچھے[۷] دیوڑی کے نگہ بان کوں
کہے یوں: نبی رحمت کردگار　　ہیں خلوت منے یا عبادت کے ٹھار
دیا جواب[۸] نیں گھر میں شاہ رسل　　کریں عائشہ درد سوں (آہ و) غل[۹]
سنے جب خبر نیں محل میں نبی　　صحابہ لئے بے قراری سبھی
علی ہور صدیق عثماں عمر[۱۰]　　یو چاروں اپس میں ہوئے تل اپر[۱۱]
خودی سوں اپس کیلئے بیخودی　　تجے زندگی کو سٹے ہیں جدی[۱۲]
پوچھے عائشہ کو کہ اے نیک ذات　　کہاں گئے محمد شہ باصفات[۱۳]
کہے عائشہ اے صحابہ کرام　　کہوں رات کا میں حقیقت تمام
سوئے جب نبی رات ہوی یک بڑی　　ہوئی دوپہر سوں زیادہ گھڑی
زیادہ سوئے جب یو کچھ شاہ دیں　　عتابی حکم[۱۴] لیائے روح الامیں
ہوا انبیا کا کتے تاج تو[۱۵]　　سوتا کیوں نڈر ہو کو یوں آج تو

---

۱ چشمہ، سوتا
۲ وہیں
۳ جانب، رخ، طرف
۴ چو - چار، کدن - جانب - چاروں طرف
۵ رخ کی زیادت
۶ میم میں ہر جگہ - صحاباں
۷ واوخت
۸ واوخت
۹ م - سخت غل
۱۰ م - اے صدیق و عثمان عمر و علی
۱۱ م - یہ چاروں کے دل میں پڑی ہے کلی
۱۲ جبھی
۱۳ م - کہاں گئے نبی صاحب باصفات
۱۴ ب - زیادہ سئے جب کچھ یک شاہ دیں
۱۵ م - عتاب کا حکم اس صورت میں عتاب کا الف خم
۱۶ م - جتے انبیاں کا ہوا تاج تو

کیا میں تجھے بندگی کے بدل ‏— دنیا دین میں تو ہوا ہے بدل
تو بندگی کرے یا فراغت سو سوئے ‏— امت کو تری اب خلاصی نہ ہووے
غضب تجھ امت پر کروں اب تمام ‏— قہر کی اگن میں جلاؤں مدام
سنے سوچ غمگیں ہوئے بے شمار ‏— اسی وقت حضرت گئے گھر کے بہار
اپس کا دل و جان بریان کر ‏— گئے ہیں کدھر سو نہیں مجھ خبر[1]
اتھے غرق فکرت[2] کے دریا میں یوں ‏— ندی میں ڈوبیا نیل[3] کے سورجیوں
دسے غم کے جالے منے مین[4] ہو ‏— چلے ہیں نین سوں ندیاں پور[5] ہو[6]
سو یوں بول کر عائشہ نیک زن ‏— لگی سخت رونے کیے تئیں درحزن[7]
کہے : یا الٰہی ہے سبحان تو ‏— نبی مصطفیٰ کا نگہبان تو
الٰہی دنیا دین کا آفتاب ‏— چھپا کس نگر میں دکھا مجھ شتاب
الٰہی بغیر اس کے نیں مجھ میں ہوش ‏— فراقی ہو کرتی اتھی یوں خروش
سنے سب صحابہ مصیبت کی بات ‏— لگے سخت رونے یکندر جماعت[8]
لگے ڈھونڈنے شہر میں جابجا ‏— گئے رات کے تئیں کہاں مصطفیٰ
گلی اور کوچے عمارت تمام ‏— فقیراں کے تکیے دگر کئی مقام
جتے مسجداں تھے جتے خانقاہ ‏— جتے خاص باغاں جتے سیرگاہ
یکندر ڈھونڈے نیں دسیاں کئیں ذرا[9] ‏— جتے پل و چاہ ہور مہماں سرا
کسی جا میں حضرت نظر نیں پڑے ‏— صحابہ یکندر جتے تڑ پڑے
جتے یار ہر یک طرف تاختے[10] ‏— نبی نیں ملے سو اڑے فاختے
صحابہ میں طاقت نہیں کچھ رہیا ‏— دل و جان جگر سب بدن جل گیا
اپس میں اپنیں تلملے تلملیں ‏— سو روتے خدا کن دعا یوں منگیں

---

۱ م ۔ نہیں ہے خبر
۲ م ۔ فکراں
۳ نیل ۔ پانی ، نیر کا ابدال
۴ مچھلی
۵ بھرنا
۶ م ۔ چلے تھے نین سے جو ندیاں کی دو
۷ م ۔ از حزن
۸ عین خت
۹ میم ندارد
۱۰ دوڑتے ۔ از تاختن

الٰہی شہنشاہ لولاک تاج ہمن دیں ہور ایمان کا تھا وہ راج [۱]
الٰہی کہاں وہ گیا رہنما قدم اس کے دکھلا شتابی ہما [۲]
الٰہی بغیر اس کے انکھیاں تمام ہوئے بے بصر نیں رہیا ہم میں[۳] فام
کریں آہ و نعرہ نبی کے حرم ڈوبے غم منے سب حرم محترم
نہیں کس حرم میں رہیا آب و تاب لرزنے لگے جیوں مثال سراب [۴]
کہے حق سوں: اے اکرم الاکرمیں اے مجمع کن خلق متفرّقیں [۵]
اے خالق! محمد گیا کاں ہے آج دو جگ کا خلیفہ ہمن سر کا تاج
بغیر اس کے نیناں میں ہولے[۶] پڑے نین کی اگیٹھی[۷] سو چنگیاں جھڑے[۸]
ہزاراں سو یوں بول نعرہ کریں اگن میں جدائی کے ہردم جلیں
سنے فاطمہ جوں خبر اس وضا نہ دستے کہیں حضرت مجتبیٰ
اپس سینہ تن کی بھٹی کے بھتر جلانے لگے دل چونے کے کنکر
کریں فاطمہ سخت افسوس آہ کہے: باپ میرا گیا کاں الاہ
مرا باپ شاہنشۂ انبیا یکایک (یو) عالم سے کیوں گم ہوا
بغیر باپ کے مجھ کو اندکار[۹] ہے بغیر باپ کے زندگی خوار ہے
نہیں مجھ میں طاقت الٰہی ذرا شتابی ملا مجھ کو بابا مرا
ملے باپ میرا تو ہوں میں غنی نہیں تو فنا کر مجھے اے دھنی
جتے تن محمد کے نور البصر[۱۰] حسین و حسن نورجاں دل جگر[۱۱]
سنے یو حقیقت سو رونے لگے اپس دل جگر کو کرونے[۱۲] لگے

---

۱ کا ہے او ساج
۲ ہم کو
۳ م: کو
۴ م: بلکتے گذرنے لگے جیوں شراب
۵ ت ساکن
۶ ہولا - بھونا ہوا چھوٹا مٹر (کا دانہ)
۷ اگیٹھی - انگیٹھی
۸ چنگی - چنگاری
۹ اندھ-کار- اندھا کرنے والا. مراد اندھیرا، تاریکی دونوں مصرعوں میں بغیر کی یا خت
۱۰ م: جتے تھے الخ
۱۱ م: نور جان و جگر
۱۲ کرونا - کسی مجوف شے کے اندر کا میل نکالنا، کھرچنا

پکارے کہ ہے جد ہمارے کدھر   شہنشاہ لولاک خیر البشر
الٰہی جہاں سب اندھارا ہوا   دل و جاں جگر جل انگارا ہوا
ہے زینت ہمارا شہ دو جہاں   گیا زیب و زینت ہمارا کہاں
گیا کاں ہمارے سوں بے فکر ہو   کھلاوے سدا گود میں ہم کو او
بغیر جد کے ہم کو قراری نہیں   الٰہی ملا جد ہمارے تہیں
صحابہ پچھیں[1] کر اپس میں بچار   دئے بھیج جاسوس در ہر دیار
لکھے خط ہر اک صاحب تاج کو   لکھے ہر ملک کے ہر یک[2] راج کو
ہوا رات کے تئیں خدا کا عتاب   نہ معلوم کاں گئے شہ کامیاب
پڑی ہے مدینے منے کھلبلی   گیا ہے کہاں انبیا کا ولی
پڑیا سخت اندھارے میں عالم تمام   چھپا سور اسلام کا در غمام
نہیں ہم میں طاقت نہیں ہوش تاب   ہوی زندگی ہم سبھوں[4] کی خراب
شب و روز آپس میں ہم تلخ ہیں   چھپا سورِ ایماں نہ دستا ہے کئیں
ہوئے تین دن ہور دگر تین رات   نہ دستے کہیں سرور کائنات
اگر جس طرف کو نبی نیک نام   کریں گے گزر تو کرو ہم کو فام
اپس کے ملک میں تلاشاں کراؤ   ٹھکانہ لگا کر ہمن کو سناؤ
یہ خوش خبر[5] جو کوئی دیوے ہمن   خدا اس کو دیوے جزائے حسن
خطاں اس وضع سوں لکھے جب تمام   دئے بھیج ملک عجم روم شام
ہوا ملک میں جاں[6] تہاں شور یو   ہوئے گم نبی سخت غمگین ہو
مدینے میں ہے[7] کھلبلی ہر طرف   کدھر گئے نبی صاحب با شرف
کتے ہیں خلیفہ پچھے چار یار   اپس میں کئے اس وضا[8] کا بچار

---

۱ بعد میں
۲ م: یک یک
۳ م: پڑے ہیں اندھارے
۴ م: پر
۵ ب ساکن
۶ جہاں
۷ م: مکہ میں پڑی کھلبلی
۸ وضع کی ترخیم

ہمن تو ہوے سخت غمگیں اسیر [۱]　　دھنڈو جاکو حضرت کے دھیر (؟)
چلے ڈھونڈتے گاؤں کھیڑے جتے　　گڑے ہیں پہاڑاں کے پتھرے کتے
ہر یک طرف [۲] ڈھونڈے کتک کوس گئے　　سو ڈھنڈ ڈھونڈکر بہوت عاجز رہے
و لیکن ٹھکانا لگیا نیں کہیں　　صحابہ دیوانے ہوے بالیقیں
سو ویسے میں آتا دسیا یک بڈھا　　نسنگ [۳] دوڑ آتا ہے او سٹ پٹا
دسیا او بڈھا غم منے چور ہو　　شتابی سوں آتا ہے رنجور ہو
پوچھے یار اس کو کہ اے پیرمرد　　تو کیوں گھابرا [۴] ہو کے آتا ہے سرد
تو آتا کہاں سوں ہمن ساتھ بول　　ہماری حقیقت کی کچھ بات بول
تو آتا سو اس بات میانے اے پیر　　مسافر ملیا کوئی تجھ یک امیر [۵]
او پینا [۶] اگرچہ لباس فقیر　　ولیکن ہے او بادشا بے نظیر
سر اس کا ہے رحمت سوں کافوربار　　دسے شعلۂ نور پروردگار
محاسن [۷] ہے پرنور او باصفات　　کشادی پیشانی جوں [۸] آب حیات
سیہ زلف واللیل یغشی نمن [۹]　　دسے لیلۃ القدر وجہ الحسن
ہے زلفاں مبارک نورانی عجب　　فدا اس پو عنبر عطر مشک سب
سو قوس قزح تیوں بھواں ہے اسے　　ہے محراب کعبہ نمونہ جسے [۱۰]
نین دو ہیں رحمت سو خورشیدپور [۱۱]　　تصدق ہیں نرگس ہزاراں سوں حور
پلک جال ہیں صاف دیدہ ہے یوں [۱۲]　　گرن [۱۳] میں منور دسے سور جیوں
دسے دونوں دیدے کنول کے نمن　　اچھوتس [۱۴] میں پتلیاں بھنور خوش نمن
سفیدی نین میں (ہے) جیوں شب قدر　　سیاہی ہے ظلمات سوں بیش تر

---

۱ م : اپس میں کہے چار یاراں کیہ
۲ بہ سکون ر
۳ نی (حرف نفی) + سنگ = شک ، خوف　بے خوف ، جری
۴ گھبرایا ہوا ، پریشان
۵ م : مسافر ملیا تجھ کوں کوئی یک امیر
۶ پہنا
۷ بدن کے حصے
۸ م : ہے
۹ مانند
۱۰ م : دسے
۱۱ م : نین بادمی ہے او رحمت سوں پور
۱۲ ب : دیدے ہیں یوں
۱۳ گرہن
۱۴ اچھنا ـ رہنا ، ہونا

سیاہی سوں پتلیاں کے ظلمت ہوا
سفیدی سوں دیدیاں کے سورج[1] ہوا

نین سوں ہدایت اشارت دکھائے
پلک سو شہادت کی دستک بجائے

دہن میم تو مسکتاتا[2] دسے
ہنسے تو وہ گل ریز کے تیوں جھڑے

دسے ہونٹ غنچہ کہوں میں اگر
عجب تنگ دہاں تے وہ ٹپکے شکر

دسے نک پھڑیاں نازک و صاف یوں
کہے لوگ (ہے) نافۂ مشک جیوں[4]

ہے نازک عجب ناک خنجر کے دھار
صفت میں ملائم ہے کیوڑے کے سار

دونوں کان گل کے نظر میں چوبیں[5]
منور دو ٹکڑے چندر کے دسیں

کٹے[6] اس کو خنجر تو ہے جھوٹ بات
نمونہ ہے جس کا سو رہ پل صراط

ہدایت کے موتیاں سو او پور ہے
سعادت کے جوہر سوں معمور ہے

ہے رخسار گلنار جیوں در چمن
ہوا سرخ جس سوں عقیق یمن

منور عجب گال ہے نرم تر[7]
گل یاسمیں یا پونم کا چندر

لباں ہیں عجب خاص پھول پھانک کے
مٹھے[8] نرم فالود[9] کے تیوں دسے

لباں سرخ دستے ہیں یوں در دہن
ہے جیوں سرخ دامن گریباں گگن

بدن جس کا خوشبوی مشک عطر
مبارک لباں جوں ہیں شیر و شکر

عجب دانت ہیرے تراشے گئے
کہ جس روشنی سوں ستارے ہوئے

زباں میانے رکھتا ہے امریت[10] او
ہدایت کی دھرتا عجب ریت او

زباں سوں سیہ کو کرے با ضیا
جوں آہن کو سونا کرے کیمیا

تھوڑی اس کی ہے سیب جنت یقیں
ثریا کا جھومکا تکے اس کے تئیں

ہے چاہ زنخداں میں کوثر کا آب
پویں اس میں پانی ہدایت مآب

---

۱ یہ اور بعد کے دو بیت نسخۂ ب ندارد
۲ مسکراتا
۳ م: تو
۴ م: کھے تو دو نافۂ الخ
۵ چبھیں
۶ م: کیا، کٹے - کہے
۷ نسخۂ ب ندارد
۸ میٹھے
۹ فالودہ - پالودہ کا معرب پالودن - صاف کرنا، نچوڑنا، ایک قسم کی نرم و تر شیرینی
۱۰ امرت

غلولہ[1] ہے غبغب منے مشک خاص — معطر ہوا عرش سب جس کے[2] باس
میانہ ہے قد میں ہے جثے میں جست[3] — بڑا جلد[4] چالاک ہے تن درست
نہیں قد منے اس کے کچھ عیب تل — کہ جس قد کے آگے سرو ہے خجل
پکڑ سر سوں تا پاؤں نرمل بدن — ہے گنونت[5] میٹھا مبارک لگن[6]
دنداں[7] روز روشن کے تیوں سین ہے — کہ جس کی صفت سورہ یاسین ہے
محمد ککر ناؤں ہے پاک اسے — دیا سر پو حق تاج لولاک اسے
اسی نام کا سب یو منڈان ہے — مقرب ملک اس کے اخدان[8] ہے[9]
خدا کا عنایت ہے اس پر تمام — کیا اس کو خاص دو عالم مدام
نشانی اسی کوئی[10] اہے بے نظیر — چراغ ہدایت بشیر و نذیر
نہ طاقت کریں نعت میں ہم وصول[11] — ہوا نعت میں جس کے قرآں نزول
صفت اس کے کہنے کی نیں بالیقیں — ہمن عاجزاں میں یو[12] قدرت نہیں
کہیں نعت میں اس کے ہم کیا بچن — پھرایا ہے جس گرد سوں نو گگن
دونو جگ کے عالم میں او خاص ہے — اسے ورد نت سورہ اخلاص ہے
نشانیاں کیتک[13] تجھ واس کی بتائے — او تیری نظر کئیں بڑا سو دکھائے
دیکھیا ہوے ایسا تو جوہر اگر[14] — کرم سو دیوے ہم کو تو خوش خبر[15]
تو دیکھا تو[16] ہم کو نوازش کرے — او کس حال میں کاں ہے فائش[17] کرے

---

۱ گلولہ ، گولی
۲ م : سب خوش لباس
۳ م : رہے جس میں جست ، جس - قوت سین کے بعد بہ زیادت تائے قرشت برائے قافیہ
۴ جلد - مضبوط ، قوی ، صابر
۵ گنونت - نیک خصال
۶ لگن ، طالع
۷ پہلا نون خارج از تقطیع
۸ جمع خدن - دوست ، ساتھی
۹ ط : اس کے خادم ہوا ہے (خک)
۱۰ کو ہی - اسی (ہی) کو
۱۱ م : کرے کوئی اس کے وصول
۱۲ م : تو
۱۳ کتنے ہی ایک
۱۴ م - دیکھیا ہوے اس ذات کو کئیں اگر
۱۵ م - کرم سوں ہمن کو دیوے خوش خبر
۱۶ م - دیکھیا ہوے تو
۱۷ فاش کو بہ ضرورت قافیہ باضافۂ ہمزہ لکھا گیا ہے

ہمیں اس بغیر بےصبر[1] ہیں تمام نہیں زندگی کی خبر ہم کو فام
خبر اس کی بولے تو ہم کو جداں خدا تجھ کو دیوے جزا جاوداں
سنا جب بڈھا یو حقیقت تمام دیا جواب نادان بیہود نام
کہا : اے عزیزاں ! او ہے لامکاں کئے تم جو کچھ ساتھ میرے بیاں
کہے تم صفت جس کی یوں بالیقیں نہ دیکھا اسے میں جنم میں کدھیں
بلک[2] نام اس کا کدھیں نیں سنیا شکم سوں اپس ماں کے جب سوں جنیا
ہوی عمر یک سو کی میری تمام کدھیں نیں سنیا میں مبارک یو نام
نہیں ناؤں کی اس کے جس کو خبر[3] اچھے کیوں خلائق سو تس[4] کی خبر
او ہے کون نیں اس کو میں جانتا نہیں اس کے مذہب کو پہچانتا
ولیکن ہوے آج سوں چار دن جنگل پر مصیبت ہوا ایک کٹھن
کہوں میں جنگل کی مصیبت اتا سنو اے عزیزاں جتا ہے وتا[5]
رہوں میں ہمیشہ جنگل میں مدام پہاڑاں میں میرا سدا ہے مقام
شہر میں ہے گورو[6] خلق کے جتے لجاتا چرانے کے تیں میں وتے[7]
جنگل میں چراؤں رہوں در جنگل[8] کدی نیں سو آکر پڑیا ہے خلل
ہوے آج کے روز سوں روز چار یکندر جناور ہیں سب خوار زار[9]
نہ ہلتے نہ جلتے نہ چرتے ہیں او اپس میانے جھر جھر کے مرتے ہیں او[10]
نہ پانی پئے چار دن میں کدو[11] کھڑے ہو کے روتے رہیں پی انجو[12]
جتے گوسفندان جتے شیر خورد ہیں درغم اپس میں نہیں کس میں سد

---

۱ م ۔ ہمیں اس بجزنا صبر
۲ اب لک ۔ ایک بعید امکان یہ ہیکہ (بلک بلکہ کی تخفیف ہو ۔
۳ م ۔ نہیں نام سوں مجھ، کو اس کی خبر
۴ م ۔ اس
۵ ب عزیزاں فرمار روا
۶ گائے ، بیل ، ڈھور
۷ م ۔ سب اوتے
۸ م ۔ جنگل (میں) چراتا دہوں اس جنگل
۹ م ۔ یکندر جناور ہزاراں ہزار
۱۰ م ۔ پڑتے ہیں او ؛ جھرنا ۔ خشک یا دبلا ہونا
۱۱ م ۔ کدھیں ، کدو ۔ کدی ، برائے قافیہ یا کو واؤ سے بدلا گیا ہے ۔ جیسے کسی ، کسو
۱۲ م ۔ او پلتے رہیں

پرندے درختیاں پو نالاں ہیں سب   ہزاراں سوں مرتے کتیے روزوشب
جتے کویلاں بلبلاں ہو اداس   جتے ہدہداں قمریاں بہا اُساس [1]
ہو بیہوش جھاڑاں سوں گرتے ہیں او   چمن کے خیالاں بسرتے ہیں او
کبسی وقت جھاڑاں سوں گر گر پڑیں   کسی وقت اڑلا [2] کو نعرہ کریں
کسی وقت بھوئیں سوں [3] سراں کو پچھاڑ   کریں سخت نعرے ہزاراں سو جھاڑ
چمن میانے جھڑ جھڑ کو پڑتے ہیں گل   جہاں لگ درختاں ہیں پژمرد کل
درختاں پہ میوے اتھے جو ہرے [4]   یکندر ہوئے خشک سب جھڑ پڑے
چمن اور جنگل اپر سر بسر   یکندر ہوا ہے خزاں کا اثر
چمن میں ہوا یوں ہوا سوگ وار   کہ جوں گرم حمام کا ہے غبار
پہاڑاں جتے سخت مغموم ہو   کریں آہ افسوس جل بل کے او [5]
ندیاں کا جتا نیر بہتا کھڑیا   ہزاراں سوں آپیں موے تڑ پڑا
گیا جل ہو غمگیں [6] اپس میانے جل   چھلے [7] بڑبڑے [8] تن پو آئے نکل
کنول نیر میں اس وضع جل گیا   چونے کا کنکر جل سوں جو گل گیا
نہ معلوم کیا باو طوفان ہے   جناور جنگل میں پریشان ہے [9]
سبب مجھ کو معلوم نیں یک رتی   ہوا ہے یو طوفان جس روز تی
یک آواز ڈونگر سوں آتا سدا   سنو! امتی امتی کر ندا
یو آواز کیا ہے سو معلوم نیں   سنوں چار دن سوں اسی وضع میں
ہوا امتی امتی جب ندا   پکاریں جناور جنگل سب جتا
کہیں سب اپس میں پریشان ہو   ہمن سب کو ماریا ہے الحان یو
یو الحان کر یا الٰہی قبول   ہوئیں امتاں کے مطالب حصول

سانس، تنفس
۲ اڑلانا۔ دھاڑیں مار کر رونا
۳ م۔ دکھ سوں
۴ سو بھرے
۵ م۔ سخت گل گل کے او، جل جل کے او
۶ م۔ ہو غم میں
۷ چھلے۔ چھالے کی تخفیف
۸ بڑے بڑے بلبلے
۹ ب۔ نہ معلوم کسے کیاہے مستمر (؟) جناور تکمے ہے خزاں میں شجر (؟)

سنوں چار دن سوں ندا یو مدام یو آواز کس کا ہے[۱] نیں مجھکو فام
میں جاتا شہر میں اسی واسطا کہوں یو خبر گھر بہ گھر جا بہ جا
میں گورو جناور انو سوں کہوں خلق کی ملامت سوں چوٹ[۲] کر رہوں
سنے اس وضع درد یاران جب درونی میں آتش کیا جوش تب
بدن کی انگیٹھی جھڑپنے[۳] لگی کہ بن جل مچھی تیوں تڑپنے لگی
انگیٹھی جداں جل انگاری ہوی جگر کا کباب اس اپر دھر دئی[۴]
کباب اس پو بریان پانے لگیا لہو ہر بُنِ بُن[۵] چوانے لگیا
لہو نیر سو گنج سینہ[۶] کے بھتر نین حوض ابل کر چلے دو نہر[۷]
یقین[۸] دل میں سمجھے صحابی کبار ہویں گے فی اس پہاڑاں کے ٹھار
یو آثار اس ذات اصفات کے یو ہیں معجزے پاک اس ذات کے
چلے واں سوں آگے کیتک دور جب دیکھے غار میں جا کو حضرت کو تب
دسے حضرت بادشاہ عجم ہیں سجدے منے بانیاز و الم[۹]
مبارک سر اپنا کئے ہیں ننگا[۱۰] پڑے ایک بنڈے[۱۱] کیے تیں سر لگا
دونو زلف مشکین کھولے ہیں سب چلے ہیں نین سوں دو ندیاں عجب
چلیا آب پلکھاں[۱۲] سوں ہو یور یوں بھتا[۱۳] نیر خاشاک میں صاف جیوں
ہوا غم ستے سر مبارک گرم وہ[۱۴] پہترا ہوا موم کے تیوں نرم

---

۱ م - یہ آواز کیسا ہے
۲ م - چوپ ، خلق - بتحریک لام
۳ جھڑپنا - ہوا دینا لیکن یہاں بطور فعل لازم بمعنی تیز ہونا یا آگ کی ڈلیوں کا الٹ پلٹ ہونا ، استعمال ہوا ہے
۴ الف - اس پو دھر کردی،
۵ الف - بند بند
۶ یا خت
۷ م - نین جب ابل کر چلے خوب تر، ب - نین خون ابل کر الخ
۸ م - بچھیں
۹ میم ندارد
۱۰ بنون غنہ
۱۱ ب - پتھرے ، بنڈہ - ان گھڑ پتھر خواہ بڑا ہو یا چھوٹا
۱۲ پلک
۱۳ بہتا
۱۴ ب - جو

اچھے سر پو جس[1] رحمت کردگار — پڑی خاک اس سر اُپر بے شمار
کہ جس زلف پر حور قرباں ہے — او زلفاں زمیں پر پریشان ہے
کہ جس زلف پر مشک و عنبر فدا — او ہیں گرد آلود سنبل وضا
انجو ہور زلفاں ستے روئے نیک — چھپا ابر باراں میں جیوں سوردیک[2]
کہ جس تن اپر فضل معبود ہے — سو او تن دیکھو خاک آلود ہے[3]
جو نیناں اتھے رحمت پاک کے — گڑے ہیں جگر میں انجو خاک کے (؟)
اتھا موں جو نازک چنبیلی[4] کا پھول — پڑی ہے نہایت اوپر اسکے دھول
سٹے تن مبارک کے تیں مست[5] کر — خدا کی دعا میں زباں چست کر[6]
کتے درد سوں امتی امتی !! — الٰہی کیا مجھ کو توں رحمتی
اے غفار! اے پاک پروردگار!! — گنہ گار بندیاں کا آمرز گار
بخش میری امت کے تیں اے کریم — خلاصی امت کی منگوں مستدیم
نہ بخشے گا امت کے تیں جب تلک — رہوں میں قیامت تلک یوں بلک[7]
زمیں سوں سر اپنا اٹھانے کا نیں — کہ جب لگ مراد اپنی پانے کا نیں
الٰہی امت سوں محبت مجھے — ہے بیحد زیادہ کہوں کیا تجھے
الٰہی امت کی خوشی میں پھنکوں — مصیبت میں امت کی ہر دم گلوں
ہے سختی امت کی میرے پر کٹھن — یہی غم ہے دل میں مرے رات دن
مرے دل میں ہے درد امت مدام — میں روتا ہوں اس درد میں صبح وشام
نہ بخشے تو جب لگ مجھ امت کے تیں[8] — اٹھانے کا نیں سر کو تا حشر میں[9]
امت کو جلاؤں کتا ہے قیاس — جلا مجھکو، امت کے تیں دے خلاص
الٰہی تو برلیا مرا آرزو — لگی آگ تن میں جتے مو بہ مو

---

۱ الف۔ کہ جس سر پو ہے
۲ دیکھ
۳ م۔ گرد آلود ہے
۴ ب۔ چنبے
۵ بیخود
۶ م ندارد
۷ بلکنا ۱۔ سسکیاں لے لے کر رونا ۲۔ مضبوط پکڑنا
۸ الف۔ ابر
۹ سرکوں روز حشر

اسی وضع سوں بول روتے ہیں زار — ہزاراں سوں کرتے ہیں نعرہ پکار
چلی تھی دو نیناں سقے یوں جھڑی — مکائیل جبریل مشکاں بھری
لیجائیں ہیں او نیر جنت کے ٹھار — دئیے حور کے تیں تبرک کے سار
دیکھے حال حضرت کا جب اس وضا — صحابہ ہوئے سخت تب غم زدا
کتے: چار یاراں زمیں کے اُپر — اپس کو دئیے بے خطا ڈال کر
زمیں پر لگے ہونے بریان یوں — بھنے جائے تندور میں نان جیوں
کئے عرض: اے صاحب دو جہاں — کہو: کیا سبب آئے ہیں تم یہاں
سبب کیا ہے سو تم لئے ہیں فراق — دنیا کی ہوی زندگی تم پو شاق
او کیا ہے جو غم میں ہوے[1] زارزار — کئے غار و جنگل کے تیں اختیار
محمد کہے اے صداقت مآب! — کہوں کیا حقیقت؟ نہیں مج میں تاب
سوتا رات پرسوں کی ٹک بیخبر[2] — لے جبریل آئے حکم جلد تر
غضب کا حکم لیائے مجھ پر تمام — رہے تیری امت غضب میں مدام
خلاصی نہ امت کو دیوے خدا — جلاؤں کتا[3] تھا ابد لگ سدا
قضا ہوی عبادت کی یک گھڑی[4] — بلا میری امت پو آ کر کھڑی[5]
سبب اس کے جنگل قبولیا ہوں میں — شہر[6] کو تجا گھر کو بھولیا ہوں میں
کہ جب لگ خلاصی امت کی نہ پاؤں — نہ سر کو اٹھاؤں یہاں سوں نہ جاؤں
امت میری جب لگ بخشنے کا نیں — رہوں تا قیامت اسی ٹھاؤں میں[7]
کئے عرض صدیق، اے جان من! — اے سلطان عالم! اے ایمان من!!
کیا راستی کے جو کچھ کام میں — خدا کی رضا میں سر انجام میں
عبادت جو کچھ بندگی میں کیا — خدا واسطے خیر جو کچھ دیا
جو اعمال نیکی کے ہے مجھ منے[8] — کتا صدق دل سے میں تیرے کنے

---

۱ م: او کیسا ہے غم یوں ہوے
۲ الف: سوتا رات کو یکی ٹک سحر
۳ کہتا
۴ م: قضا ہوی مبارک نیں تک گھڑی (؟)
۵ ب: بلا میری امت کے سر آکھڑی
۶ ب و میم: عقل
۷ م: ٹھار میں
۸ م: نیکی ہوئیں مجھ منے

دیا بخش امت کے حق میں وتے ثواباں ہوئیں اس کے رب کن جتے
مبارک سر اپنا اٹھاؤ تمہیں صورت والضحیٰ مجھ دکھاؤ تمہیں
دئیے جواب ، اے یارِ جانی مرے اے صدیق اکبر! سُجاتی[1] مرے
تمھاری عبادت کا یاں کام نیں بجز عاجزی یاں سر انجام نیں
تمھاری عبادت کی نیکیاں ستی[2] خلاصی نہ امت کی ہوے یک رتی[3]
امت کا مری کام چلنے کا نیں بجز فضل رب غم یہ ٹلنے کا نیں
کہ جب لگ نہ بخشے گا پروردگار[4] رہوں میں اسی ٹھار پر زار زار
عمر تب کئے عرض اے سیّدا اے سرتاج امت ! شہ غم رہا!![5]
کیا عدل و انصاف جو میں تمام رضا میں خدا کے جو نیکی کے کام
مرے میں جو نیکی کے ہوتیں عمل کیا نذر تیری امت کے بدل
اٹھاؤ زمیں سوں مبارک یہ سیر[6] نہ طاقت رہیا ہم میں اے دستگیر
کہے اے عمر! عادل روزگار!! رفیق مکرم سعادت شعار
تمھارے عمل کام آنے کے نیں یہ امت کو میری چھڑانے کے نیں
کہ جب لگ کرم نا کرے ذوالجلال خلاصی امت کی دسے مجھ محال
بغیر فضل حق یاں سوں جانے کا نیں یہاں سوں قدم بھار بھانے کا نیں
ذی نورین نے یوں کئے عرض تب کہے : اے شہنشاہ سید عرب
حیا[7] میں جو کچھ کرتیاں میں کیا جو کچھ راہ مولا کی[8] بخشش دیا
کیا جمع قرآن ترتیب سوں دیا اس کو ترتیب ترغیب سوں
عبادت ریاضت کیا جو مدام دیا بخش امت کو تیری تمام
اٹھاؤ سر اپنا زمیں سوں اتال[9] دکھاؤ شتابی مبارک[10] جمال

---

١ عجیب الطرفین ۔ ممکن ہے یہاں اسی وزن کا دوسرا لفظ سجان ہو بمعنی تائے قرشت کی بجائے نون جس کے معنی دانا ، عاقل یا خردمند ہیں ۔
٢ ب ۔ ندارد
٣ م ۔ امت کی خلاصی نہ ہوے یک رتی
٤ ب ۔ نہ بخشے گا جب لگ کہ کرد گار
٥ م : غم زدہ
٦ سر
٧ م : جہاں
٨ م : میں
٩ اب
١٠ م : منور

دئے جواب حضرت نے عثمان کو　　حیا میں عبادت میں ہے کھان[۱] تو
ولے تجھ عبادت ستے ہوئے کیا　　کہ جب لگ کرم نا کرے کبریا
نہ ہوئے گا جب لگ خدا مہربان　　نہ سر کو اچاؤں[۲] نہ جاؤں کہاں
کئے عرض بھی یونچ[۳] دلدل سوار　　کہے: اے شہنشاہ روز شمار
کیا کافراں پر جو کچھ میں غزا　　جتے ملحداں کو دیا جو[۴] سزا
جو کچھ مجھ سوں طاعت ہوی بندگی　　خدا کی رضا میں سر افگندگی
جہاں لگ ہے میرے میں فعل حسن　　دیا بخش امت کو اے پاک تن
کرم کر اٹھا سر کے تیں اب یکیک[۵]　　دکھا ہم کو شمس الضحیٰ! روئے نیک
شہ انبیا نے کہے یا علی　　اے دل سوز میرے! ولیاں کے ولی!!
عبادت و نیکی میں ہے سور توں　　شجاعت کے کاماں میں مشہور توں
تری نیکیاں سوں مجھ[۶] امت کے کام　　نہ ہرگز چلے اے علی نیک نام
نہ بخشے گا امت کو جب لگ خدا　　رہوں میں اسی ٹھار روتا سدا
سنے سو ہوے دل میں یاراں ملول　　زمیں سوں نہیں سر اٹھاتے رسول
صحابی ہو غمگین کیتے[۷] بچار[۸]　　پچھے سب جنے[۹] مل، کئے یوں قرار
نبی کا کرم فاطمہ کے اپر　　ہے بے حد زیادہ سدا بیش تر
ہے خاتون جنت ہو حضرت کا پیار[۱۰]　　گھڑی یک نہ دیکھے تو ہوئے بیقرار[۱۱]
لے آنا ہمیں فاطمہ کو یہاں　　ہوئیں فاطمہ پر نبی مہرباں
بہت فاطمہ کا ہے خاطر عزیز　　اٹھانے کو[۱۲] سر کو شہ با تمیز

---

۱ کان - معدن
۲ اچانا - اٹھانا، اونچا کرنا
۳ یوں ہی
۴ م. میں
۵ اک بارگی - فورا
۶ الف: ولے تیری نیکیاں سوں
۷ کرتے
۸ م: صحابی ہو غمگیں اپس میں بچاو
۹ مرد، کس - شخص
۱۰ الف ندارد
۱۱ م - زار زار
۱۲ م: اٹھاویں گے

کئے مشورت جب صحابی کرام ۔ گئے فاطمہ کن کہے سب تمام
سنے فاطمہ جب ہوئے بے قرار[1] ۔ چلے ساتھ یاراں کے حضرت کے ٹھار
لئے ساتھ اپس قرۃ العین کو ۔ حسین و حسن ہر دو سعدین کو
دیکھے جاکر احوال حضرت جداں[2] ۔ لگی آگ دل کے نگر میں تداں[3]
جگر سوں شرارے نکلنے لگے ۔ نین سوں فوارے اچھلنے لگے
جتے بال سوزن کے تیوں تن منجھار[4] ۔ چوبیں دل جگر میں ہوئیں آرپار
کئے فاطمہ عرض غمگین ہو ۔ اے بابا! پتا غم لئے کیوں کہو
اے بابا! کھڑیا تم پو کیسا محن ۔ کئے خاک ہور غار میانے وطن[5]
اے سردار عالم شہنشاہ دیں ۔ پتا کیوں ہوئے ہیں تم اندوہ گیں
اپس تن کے[6] تیں سخت خواری میں دھر ۔ سٹے خاک میں ہور رہیں گرد کر[7]
کدیں اس وضع نیں ادا سے ہوئے[8] ۔ نہیں یوں کدھی بے قراری کئے
سبب اس مصیبت کا بولو مجھے ۔ زمیں و زماں نیں مجھے کچھ سوجھے
تمھارے بغیر گھر مجھے گور ہے ۔ ہریک طرف سوں ماتمی شور ہے
دسے سور مقدار نیزے کے ایک ۔ دئے جان تن کو انگاریاں میں سیک[9]
زمیں مجھ کو تانبے کی دستی یقیں[10] ۔ یو ہے حشر کا روز نیں رات دیں[11]
دے جواب حضرت نے رنجور ہو ۔ دل و جان جگر سب بدن چور ہو
اے جانی! سجانی. مرے دل جگر ۔ اے خاتون جنت اے نورالبصر[12]
مصیبت کا احوال کیا کر[13] کہوں ۔ نہ کہنے میں آتا زبان بند رہوں

---

۱ الف ندارد
۲ م : دیکھے حال حضرت کو جاکر تداں
۳ جب، تب
۴ بروزن سنبھال ۔ درمیان : یہ لفظ بغیر نون کے بھی مستعمل ہے یعنی مجھار.
۵ الف : غار میں آ وطن
۶ م: دل
۷ الف سٹے خاک ہور گود میں گرد کر، ب ۔ خک
۸ ب: کہ اس وضع سوں کیوں اداسی ہوی
۹ م: دل و جان و تن کو انگاروں کے سیک
۱۰ م ۔ دستی جو ہے، رات ہے
۱۱ د ن
۱۲ م ۔ ندارد
۱۳ م : میں

سوتا عائشہ کے محل ایک رات ۔۔۔ کری نیند او مجھ اوپر سخت گھات

ہمیشہ کرے وقت سوں یک گھڑی ۔۔۔ زیادہ سوتا سو مصیبت کھڑی[1]

لے آئے حکم سخت جبریل تب ۔۔۔ کروں تیری امت اوپر نت[2] غضب

امت تیری رحمت میں لئیں گا نہیں[3] ۔۔۔ خلاصی جہنم سوں دیئیں گا نہیں[4]

ہوا مجھ اپر جب ستے یو حکم ۔۔۔ دیوانہ ہوا دل عقل سب ہے گم

امت کا نہوے مغفرت جب تلک ۔۔۔ اٹھانے کا نیں سر کو میں تب تلک

سنے سو دئے فاطمہ نے جواب ۔۔۔ اے حامیء امت! اے عالی جناب!!

جو کچھ فقر و فاقہ سہی میں جتا ۔۔۔ جو محنت سوں چرخے کو کاتی سدا

علی کا ادب جو بجا لیائی میں ۔۔۔ ذرہ ناخوشی کد[5] نہ دکھلائی میں

جو طاعت کری میں خدا کی مدام ۔۔۔ جوراضی رکھی تم کو ہر صبح شام

وتا سب امت پر کری میں نثار ۔۔۔ تصدق تمہارے ہو ہوں[6] بار بار

پیارے تمہارے حسین و حسن ۔۔۔ نہ یک گھونٹ پانی ائے در دہن

یقیں چار دن سوں یو دونوں جگر ۔۔۔ سوائے انجو نیں پئے کچھ دگر

رکھیں ان کو سینے اپر تم سدا ۔۔۔ گھڑی یک نہ کرتے اپس سوں جدا

اے بابا! یہ دونوں کو کیوں بھول گئے ۔۔۔ کدھیں نیں سو بھولے بڑا حیف اے

یہ مظلوم معصوم دونوں کے تیں ۔۔۔ تمہاری لے خدمت میں آئی ہوں میں[7]

یہ معصوم ہیں چار دن سوں اداس ۔۔۔ تمہاری جدائی میں گئی بھوک پیاس[8]

اے بابا اتا اس ٹھکانے[9] سوں تم ۔۔۔ دیکھو قرۃالعین کا حال تم[10]

سر سروراں کو اٹھاؤ تمہیں ۔۔۔ پنم کا چندر موں دکھاؤ تمہیں

---

١ م: بڑی

٢ م: تب

٣ م: لینے کا نیں

٤ م: دینے کا نیں

٥ کدیں۔ کدھیں کی ترخیم

٦ م: میں

٧ الف ندارد

٨ ب و م ندارد

٩ الف: سر اٹھانے

١٠ م: کو چل کے تم

ہمیشہ انوں پر تمھیں ہیں خوشحال   دیکھو یک نظر سوں انوں کو اتال
کہے پھر کو حضرت نے اے جان جاں!   اے معدن حیا کی اے شیریں لساں! [۱]
تمھارے منے ہیں جو اعمال نیک   دیئے بخش امت کو مجھ حال دیک [۲]
تمھاری عبادت ہوئے گی کتی   سبب اس کے بخشے خدا امتی
عبادت کسی کی نہیں کام آئی   یو چیزاں سوں امت خلاصی نہ پائی
تمھیں حق کی درگاہ میں زاری کرو   جگر کو جلا اشک باری کرو
کرو عاجزی تا کرے حق پذیر [۳]   رحم سوں امت کو ہوے دستگیر
نہ کس کی عبادت سوں امت چھٹے [۴]   نہ کس کی عبادت کی پروا اسے
شریعت میں بندہ گنہ گار ہوے   کرے عذر تو حق کرم گار ہوے
اگرچہ حسین و حسن ہر دو تن   یقیں ہے یو دونوں مرے دل نین
والے غم ہے امت کا مشکل تمام   نہ اس غم میں رہتا عقل [۵] ہوش فام
نہ امت کے غم میں جگر یاد آئے   نہ اس غم منے عشق دسرا سمائے
سو یوں بول رونے لگے جگ پتی [۶]   الٰہی بخش امتی! امتی!!
منے فاطمہ اس وضع جب سخن   ہوا تن منے سخت بریان تن [۷]
کتے: وھاں ستے یک [۸] کنارے ہوے   حسین و حسن کو اپس سنگ لئے
لگا خاک موں کو ہوے ہیں نڈھال   پلو [۹] سٹ کو ہور کھول اپس سر کے بال
حسین و حسن ہر دو فرزند کوں   لگائے کتی [۱۰] خاک دونوں کے موں
بھی زلفاں منے پاک یو نیک نام   سٹے خاک عنبر کی جا گہ تمام [۱۱]

---

۱ م۔ اے مادر جانی شیریں لساں۔ خک
۲ دیکھ
۳ م۔ اگر عاجزی حق کرے ناپذیر
۴ چھوٹے
۵ م۔ نہ غم میں رہیا ہے عقل
۶ م۔ جب نبی
۷ میم ندارد
۸ الف۔ کتے وان سوں ٹک
۹ پلوٗ
۱۰ م۔ لگائے ہیں لے
۱۱ الف و میم ندارد

کنے ہیں کہ دونوں کو جنگل میں لیائے — اپس سر منے خاک گیسواں سو بہائے[1]
اے دونوں ہاتاں میں دونوں جگر — کھلے سر کنے ان کو بھی زودتر[2]
اٹھا ہات پیچھے خدا کی جناب — کنے آہ کا ایک نعرہ[3] شتاب[4]
کھڑے روبرو ہو کے قبلہ رخن[5] — کہے اے خداوند! اے ذوالمنن!
قسم تجھ کو تیری خدائی کا ہے — تری پاک ذات صفاتی کا ہے
الہی! مرے باپ کا تجھ قسم — کیا جس کا تو دین روشن رسم[6]
قسم تجھ ہے بابا کے رخسار کا — قسم تجھ ہے اس نین خونبار کا[7]
قسم اس کے نرگس نین کا تجھے — سیہ زلف مشکیں دہن[8] کا تجھے
قسم اس کے روئے مبارک کا تجھ — سورج چاند جس موں سوں دھرتا ہے تجھ[9]
قسم تجھ کو بابا کے سر کا ہے جان — کہ جس سر پو لاکھاں تصدق پران[10]
قسم چار یاراں کی تجھ کو تمام — جنھوں نے دئے دین کو انتظام
مرے نور دیدے یو مظلوم ہے — قسم تجھ کو ان کی مصیبت کا ہے
مرے فقر و فاقہ کی سوگند تجھے — دعا مجھ قبولے نوازے مجھے
مرے باپ کی بخش امت کے تیں — الہی مرے باپ میں حال نیں
مرا باپ امت بدل خوار زار — اپس تن کے تیں او[11] کیا خاکسار[12]
کیا جس کی خلقت کو تو بے بدل — او انجواں کو پیتا ہے پانی بدل
مرا باپ کھاتا ہے دل اور جگر[13] — پڑیا خاک اور دھول میں سربسر
زمین و زماں جس طرف سوں کیا — جسے ناؤں یاسین و طٰہٰ دیا

---

١ الف و میم ندارد
٢ ب ۔ کھلے سر ننگے پاؤں ہو زود تر
٣ الف و میم ۔ کتے ہیں ہوئے پا برہنہ
٤ میم ندارد
٥ رخ ۔ جانب، سمت
٦ علامت، نشان
٧ الف ندارد
٨ م ۔ مشکیں دہن ۔ خک ؛ ب ۔ مشک ختن ۔ خک
٩ م ۔ کہتا ہے تجھ
١٠ پریاں
١١ اپس تن بدن کو
١٢ میم ندارد
١٣ ب ۔ خونے (خون) جگر

اسے یوں مصیبت میں ڈالیا ہے کیوں　　کیا خاک میں کیوں پریشان یوں [1]
الٰہی بخش اس کی امت ایتال[2]　　نہیں تو مجھے بھی جہنم میں ڈال
محمد نبی سخت بےحال ہیں　　نہیں دیک[3] سکتی ہوں یو حال میں
مرے نوردیدے سعادت نصاب　　شفاعت کو لائی ہوں تیری جناب
الٰہی یو معصوم میرے سجات　　منگے جد کی امت کی تجھ کن نجات
کرم توں کرم کی نظر ان اپر　　امت کو خلاصی دیوے زودتر
منگے یوں دعا فاطمہ جب پکار　　بہتے تھے نین سوا نجوجل کی دھار[4]
سو یوں (بول) اڑلا کو مارے ہیں آہ　　بدن تن سراسر جلیا یا الاہ [5]
زمیں پر ہو بے ہوش ویں گر پڑے　　کہ بن جل مچھی کے نمن تڑپڑے [6]
منگے جب دعا فاطمہ اس وضا [7]　　لگے کرنے فریاد ارض و سما
سنیا یو سو لرزا ہے عرش عظام　　کرے زاری مل کے یکندر تمام
یکندر عرش میں پکارا ہوا　　فرشتیاں کا دل جل انگارا ہوا
کرے فرشتیاں[8] نے دعا با نیاز　　اے مشکل کشا صاحب کارساز!
دعا فاطمہ نور قوسین[9] کے　　ہور اس کے دونوں قرۃالعین کے
الٰہی نبی کی امت کو تمام　　کرے غرق رحمت ابد لگ مدام[10]
سو ایسے میں جبریل نازل ہوئے　　سلام علیکم نبی پر کئے
دے جواب حضرت علیک السلام　　اے جبریل کیا لائے ہیں پھر پیام
کئے عرض اے شاہ کامل وجود　　کہا رب نے تم پر سلام و درود
کرم سوں حکم یوں کیا ، اے رسول　　قبولے ہمیں اب دعائے بتول

---

۱ الف - یوں پریشان کیوں ؛ ب - توں الخ
۲ ب - اس امت کو ابتال ؛ ایتال - اتال
۳ دیکھ
۴ م - نین سو یوں انجواں کی بہتی تھی دھار ؛ ب - ندارد
۵ الف - سر و تن مرا سب جلیا یا الاہ
٦ یہ اور بعد کے پانچ بیت م ندارد
۷ وضع
۸ ر ساکن اور ش متحرک
۹ دیکھئے سورۃ النجم کی نویں آیت ۔ اعنی : فکان قاب قوسین او ادنیٰ
۱۰ یہاں سے مخطوطہ ب معرا - ناتمام

بنی فاطمہ ، فاطمہ کے طفیل　　کرے مغفرت تیری امت کا خیل
خلاصی دئے تیری امت کو ہم　　رکھے تیری امت کو جنت میں جم
کیا تجھ امت پر رحم بے شمار　　ہریک آن رحمت ہزاراں[۱] ہزار
جہنم سوں اس کو خلاصی دئے　　غضب چھوڑ اپس فضل میں ہم لئے
رکھو جمع خاطر کر اپنے تمام　　دیا تیری امت کو جنت مقام
سنے فضل باری جداں شہہ سوار　　ہوے خوش ہزاراں وضع نامدار
زمیں سوں سر اپنا مبارک اٹھائیے　　ثناحمد سوں رب کے تیں تب سرائیے
خلاصی کو امت کی جب پائے ہیں　　شکـــر کا دوگانہ بجا لائے ہیں
کہے اے خداوند اے پاک ذات　　تری ذات ہے قل ھو اللہ صفات
الٰہی ترا فضل ہے بے گنت[۲]　　کہوں کس زباں سوں نہیں مجھ سکت
الٰہی تو ہر چیز پر قادری　　ہر یک حال میں تو مجھے[۳] ناصری
الٰہی کیا میری امت کو خاص　　کرم سوں جہنّم تے کیتا[۴] خلاص
الٰہی کرم مجھ اپر نت دھرے[۵]　　دعا میری ہردم اجابت کرے
کدھی[۶] انتظاری منے نیں رکھیا　　کہ جس وقت جو کچھ منگیا سو دیا
سبب کیا اتھا اس براں[۷] اے کریم　　منگوں تین دن سوں مراد عظیم
دعا میری ہرگز نہ کیتا قبول[۸]　　رہیا تین دن غم منے ہو[۹] ملول
دعا فاطمہ کی اجابت کیا　　امت کو غضب سوں خلاصی دیا
کیا تین دن مجھ کو حیران کیوں　　ہوا فاطمہ پر مہربان کیوں
دعا اس کی فی الفور کرتا قبول　　سو رکھتا مجھے تین دن بے حصول

---

۱ الف ۔ رحمت ہمارا نثار
۲ م ۔ ان گنت
۳ م : صحیح
۴ کرتا
۵ الف ۔ مسح کرے
۶ کدیں ، کدی ۔ کبھی
۷ وقت
۸ م : کیا ہیں قبول
۹ م : میں ہو کر

اتھا اس میں حکمت ترا کیا سو بول — یو مشکل معمّا کہے صاف کھول
ہوا حکم اے خاص محبوبِ من — اے معشوق! اے انتخابِ زَمَن
ہے خاطر مجھے فاطمہ کی عزیز — مصیبت دیا اس پو کیتیک چیز[1]
فقر اور فاقہ میں[2] نت او جلے — نہیں ایک کپڑے سوں دسرا ملے
ہزاراں سوں پیوند لگاوے اسے — کدھیں[3] دل اپر غم نہ آوے اسے
مصیبت دیا اس کی اولاد پر[4] — حسین و حسن سب جتے دل جگر
ہوئیں کربلا میں پریشان او — بغیر آب دیویں گے سب جان او
پیویں گے یو پانی کی جا گا لہو — لگیں گے بدن میں زخم مو بہ مو
انوں کا زمیں پر بہے[5] خون ناب — نہ دیوے گا ان کو ذرا کوئی آب
ہوئیں خاک ہور خوں میں حیران یوں — ہوا نیل[6] میں سور غلطاں جوں
جتا کربلا کا ہے میدان سب — ہوے خون سوں اس کے افشان سب
پیارے یو دس دین[7] و دس رات میں — پڑیں گے مصیبت کی سب گھات میں
ہوئیں گے یو دس روز میں سب شہید — دیوے گا ہزاروں مصیبت یزید
یزیدی ذرا مہر لیانے کے نین — بچیاں کو بھی پانی پلانے کے نیں
ہوے کربلا یوں قیامت مگر — یقیں ہووے گا وانچ روز حشر
شہیداں کے بعد از حرم کو تمام — یزید کن لجائیں گے سب خاص و عام[8]
حرم محترم کو جتے قید کر — ننگے پاؤں سب کو چلاویں پکڑ[9]
نچھے گا[10] تو اس وقت پر اے رسول — نہ خاتون جنت نہ زوجِ بتول
نچھے اس وقت کوئی صحابی کرام — کھڑے گا انوں پر مصیبت تمام
رہیں کربلا میں یو ہو بے دیار — نچھے ان کو مونس نہ کوئی غمگسار

---

۱ م: یو کئی دھات چیز
۲ م: سوں
۳ کبھی
۴ م: اولیا
۵ م: پڑے
۶ م: ہوے نیر، نیل پانی
۷ دن
۸ ا: یو اسب خام
۹ ا: ننگے پاؤں لجائیں سب کودکاں کو پکڑ
۱۰ نچھی × اچھے = نچھنا = نہوتا

جنوں[1] کو معظم دو جگ میں کیا — انوں پر مصیبت دیا اس وضا
کیا جس کو خاتونِ جنات میں — نہ ثانی ہیں دونوں جہاں جس کے تئیں
دیا اس اپر اس وضا کا محن — جلے تا قیامت جگر دل نین
سبب اس کے شرمندہ ہوں میں تمام — نہیں توڑ سکتا ہوں اس کا کلام
اگر فاطمہ مجھ کو بولے یقیں — الٰہی بخش کافران اسمیں
ہوے کافراں کو بخشنا ضرور — کروں اس کی خواہش میں مَیں کیوں[2] قصور
سو کیوں فاطمہ کا سخن رد کروں[3] — مصیبت ہزاراں سوں جس پر دھروں
دعا فاطمہ اس وضع جب منگے — جہنم میں کس کو نہ ڈالوں سچے
مبادا کرے فاطمہ التجا — منگے حق کتے کافراں کو دعا
سبب اس کے امت کو بخشیا شتاب — دعا فاطمہ کی کیا مستجاب
خدا کا کرم جو امت پر ہوا — اماماں پہ جو کچھ مصیبت دیا
جو اولاد پر ہوئے ان کے محن[4] — شہادت لےویں دوہو ہفتاد تن
نبی فاطمہ سوں کئے جب بیاں — اول روئے، پچھیں یوں ہوئے شادماں
خوش حالی ستے سب کو گھر لے چلے — ہزاروں سوں اصحاب رہ میں ملے
نبی پر کئے آپ کو سب نثار — دروداں کا غل ہر طرف بے شمار
خوش حالی سوں کیتے[5] ہر یک شیخ و شاب — ملے غار کے بیچ والا جناب
چھڑانے کو امت[6] کے تیں گئے اتھے — چھڑا اپنی امت کو آئے کتے[7]
مدینے[8] کو جب آئے حضرت[9] نبی — دوگانہ کئے شکر کا مل سبھی[10]
یو ملکِ ملک جا کو پونچی[11] خبر — محمد نبی آئے اپنے شہر

---

۱ جنوں = جنہوں
۲ ا : نا
۳ م : سخن فاطمہ کا سو رد کیوں کروں
۴ م : جو اولیاد پر ان کی ہوئے محن
۵ کہتے
۶ م : امت کو چھوڑانے کے
۷ کہتے
۸ م : مکے کو
۹ م : محمد
۱۰ س - سبھی
۱۱ پہنچی

اتھے بادشاہاں ملک میں جتے — محمد کی خدمت میں آئے وتے
ہزاراں سو طبقار جواہر کے لیائے — محمد اپر سب تصدق دلائے
اپن بی[۱] تصدق ہوئے کل[۲] تمام — کیتک روز خدمت میں رہے جوں غلام
لے رخصت خوش حالی سوں ہو پھر نثار — یکندر گئے سب دیارے دیار
سنو اے مسلماں ہے کاں یوں روا — تمھیں در گناہاں نبی در عنا
نبی پر یتا درد امت مدام[۳] — امت نت کرے یوں[۴] جہالت کے کام
نبی یوں سہیں غم امت کے سبب[۵] — نہیں ننگ امت منے ہے عجب
نبی کے کرم فضل کو یاد کر — پشیمان ہو کر شرم ٹک پکڑ
نہیں گور کا یاد تج کو کدھیں — بسر کر گیا مرگ کو اے کمیں
پشیمان ہو اپنے افعال سوں — قیامت کے کر یاد احوال کوں
کتے ہیں برا گھاٹ ہے پل صراط — اتر پار جانے کا لے توشہ سات
الست[۶] کے ٹک[۷] قول کو یاد کر — مسلمان ہے تو نکو جا بسر
سعادت کے گھر میں اگر ہوئے کس — نصیحت منے یک حرف اس کو بس
ولے کوئی سعادت کے گھر یار نہیں[۸] — خرابات[۹] میں روز و شب یار ہیں[۱۰]
الٰہی نبی ابطحی[۱۱] کے طفیل — کرے حشر میرا تو خاصاں کے میل
الٰہی محی الدین[۱۲] ہے پاک ذات — طفیل اس کے مج کو تو دیوے نجات
الٰہی نوازندہ تو اے غفور — دے جنت مجھے تو ہزاراں سو حور
جو کوئی اس کو پڑھ کر منگے مج دعا[۱۳] — خدا دیوے گا اس کو نادر جزا
گنہ میں کیا ہوں نہ اس کا شمار — گنہ بخش میرا تو پروردگار[۱۴]

---

۱ بھی
۲ م: مل
۳ م: درد و غم میں مدام
۴ م. امت یوں کرے نت
۵ م: نبی یوں سدا غم میں امت کے سب
۶ الست بربکم الخ، تنزیل الاعراف آیت نشان ۱۷۲
۷ م: الست کے تو
۸ م: ہے
۹ م: خرافات
۱۰ م: خوار ہے
۱۱ ابطحی بیائے نسبتی ابطح بطحاء کا مترادف، وادی کی نرم مٹی، مراد مکہ معظمہ
۱۲ شیخ عبدالقادر جیلانی م ۵٦۱ ھ کا لقب
۱۳ م: مدعا
۱۴ الف ندارد

* شیخ فرید

خزائن رحمت

(۲)

خزائن رحمت شاہ باجن رحمۃ اللہ علیہ کی ایک قلمی یادگار ہے۔ اس کی زبان عام فہم اور سلیس ہے۔ مختلف مقامات پر شاہ صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار «خیال خام» کے عنوان کے تحت کیا ہے۔ اس «خیال پارہ» کی زبان عموماً مرصع، تشبیہ و استعارہ سے آراستہ اور کہیں کہیں تمثیلی انداز بیان لئے ہوئے ہے۔ تبصرہ کے ضمن میں چند مقامات نقل کئے گئے ہیں۔ دو تین اقتباسات اور ملاحظہ فرمائیے:

«ای درویش باجن، چون از خیال خود بیرون آئی مطلوب و مقصود خود عیاں بینی. اگر خود را درمیان نہ بینی و ہر کہ خود را درمیان نہ بیند، خدا را بیند. لایعرف اللہ الا اللہ.»[1]

«ای درویش، بعضی مردمان صادق اند و بعضی کاذب، باجن، کاذبان چہ دانند کہ در تاریکی چـــہ روشنائی است کہ روشنائی در سپیدی کشیدہ در سیاہی انداختند. در عین تاریکی روشنائی و در عین روشنائی تاریکی.»[2]

«شریعت چون مرکب است تا کہ راکب از مرکب فرود نیامدہ است آہستہ یا شتاب بمنزل خواہد رسید. اگر معاذ اللہ راکب از مرکب فرود افتد یا مرکب را رنجی یا آسیبی گرفت، ہردو در راہ ماندہ شدند و در راہ آفتہا بسیار بیابند.»[3]

---

۱ قلمی نسخہ، ص ۳۷

۲ ایضاً، ص ۹

۳ ایضاً، ص ۳۱٦

---

* ڈاکٹر شیخ فریدالدین برہانپوری، ام. اے. (اردو)، ام. اے. (فارسی)، پی اچ. ڈی؛ پروفیسر و صدر شعبۂ اردو و فارسی، جبلپور یونیورسٹی، جبلپور؛ دکن بورڈ آف اسٹڈیز، فیکلٹی اکیڈمک کاؤنسل، جبلپور یونیورسٹی، جبلپور؛ دکن بورڈ آف اسٹڈیز عربی و فارسی، فیکلٹی آف آرٹس، ناگپور یونیورسٹی، ناگپور.

«در باطن مردم از یک چیز بیش نگنجد که حق تعالی در ہیچ درون دو دل ننہادہ اند. واین مثل آوندی است، خواہ آن را بہ خاکستر پرکن خواہ بہ جواہر، خواہ بہ علم خواہ بہ محبت. ہرگاہ کہ بہ یک چیزی پُر شد چیزی دیگر را جائی نماند. پس این چنین چیز محل نظر رحمان است. باری بہ چیزی پُرکن کہ پاک و باقی باشد، نہ بہ چیزی کہ مردار و فانی است. اسباب دنیا ہمہ مردار و فانی است.»[1]

موقع اور محل کی مناسبت سے جا بجا موزوں اشعار چسپاں کئے ہیں۔ کہیں شاہ صاحب نے خود اپنے اردو و فارسی اشعار نقل کئے ہیں۔ سعدی، حافظ، رومی، محمود شبستری، آذری، امیرمغربی، ملک زادہ مسعود بک، عراقی، جامی، ابوسعید ابوالخیر وغیرہ کے اشعار بھی ملتے ہیں۔

نفس مضمون کی رعایت سے قرآن پاک کی آیات اور احادیث بھی منقول ہیں۔ فارسی جملوں کے بعد عربی آیات بکثرت مندرج ہیں۔ عربی کے طویل اقتباسات موصوف کی عربی‌دانی اور تبحر علمی کے شاہد ہیں۔

جن کتابوں سے استناد کیا گیا ہے ان کے نام بھی مذکور ہیں۔ ان میں سے بعض درج ذیل ہیں:

رسالہ عین القضاۃ ہمدانی، مثنوی گلشن راز، رسالۂ شمسیہ، ملفوظات شیخ الاسلام قطب العالم لنگر جہاں فرید الحق والدین، رسالۂ قشیری، رسالۂ غریب، عقیدۂ حافظیہ، مرصاد، حکایات الصالحین، عوارق، رسالۂ خواجہ حمادی، رسالۂ رموز الواصلین، رسالۂ روح الارواح، رسالۂ مقصد الاقصی، تفسیر وجیز، کتاب اخبار ملوک، رسالۂ احیاء العلوم، مصابیح، کتاب صحیحین، عوارف، حدیقۃ الانوار، تذکرۂ عطار، ملفوظات حضرت اسرار الاولیاء، لوائح قاضی حمید الدین ناگوری، قوت القلوب، رسالۂ غوث الاعظم وغیرہ۔

خزائن رحمت کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اس میں صاحب ملفوظات اور جامع ملفوظات کے حالات کے علاوہ ضمنی طور پر بعض بزرگوں کے حالات بھی منقول ہیں۔

---

۱ خزائن رحمت، ص ۴۲۰

اس میں حضرت گنج شکر، شیخ لطیف الدین، شیخ حمیدالدین اور خود جامع ملفوظات شاہ باجن کے دوہرے، اشعار، اقوال اور جملے مندرج ہیں جو اس عہد کی زبان کے کینڈے کی نشان دہی کرتے ہیں۔

تاریخی اور لسانی لحاظ سے یہ ملفوظات نہایت اہم ہیں۔ اردو کے قدیم ترین اشعار کا مستند نمونہ اس میں محفوظ ہے، قدیم اردو کے ذخیرے میں ایک اضافہ ہے۔ اس سے زبان کی ارتقائی منزل کی ایک کڑی ملتی ہے۔

حضرت شاہ باجن کا اردو کلام اور زبان

خزائن رحمت پر تبصرہ کے ذیل میں حضرت شاہ باجنؒ کے کلام کے نمونے نقل کئے گئے ہیں۔ وہ اشعار اردو کا قدیم ترین مستند نمونہ ہیں۔ شاہ موصوف پہلے شخص ہیں جنہوں نے اردو کو زبان دہلوی کے نام سے یاد کیا ہے:

«صفت دنیا بزبان دھلوی گفته»

ملفوظات میں انہوں نے بعض مقامات پر اسے زبان «ہندی» اور ہندوی سے بھی موسوم کیا ہے۔

تبصرہ کے ذیل میں منقول اشعار سے اس دور کی زبان کے کینڈے کا پتہ چلتا ہے، اس کے امتیازی خط و خال کا نشان ملتا ہے۔ اس میں عربی و فارسی کے الفاظ بھی شامل ہیں۔ جذبات اور افکار اسلامی ہیں۔ کلام ہندی بحور میں ہے۔ قواعد کے اصولوں کی پابندی نہیں کی گئی ہے۔

شعرائے متصوفین کی مانند شاہ باجنؒ نے بھی شعر کو اپنے خیالات اور جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ ڈاکٹر زور (مرحوم) نے «اردو شہ پارے»[1] میں لکھا ہے کہ «ان کا کلام نہ تو ادبی لحاظ سے قابل قدر ہے نہ معتبر وموثق» شاہ صاحب موصوف کی تصنیف ڈاکٹر صاحب کی نظر سے نہیں گذری۔ پروفیسر محمود شیرانی بھی ان اشعار کو زیادہ وقیع قرار نہیں دیتے[2] ان بزرگوں کی رائیں محل نظر ہیں۔ ان سے اختلاف کی جرأت کی جاسکتی ہے۔

شاہ باجنؒ ایک صوفی اور زاہد مرتاض تھے۔ وہ اپنی خانقاہ میں دین و دنیا کی خاموش خدمت میں مصروف تھے۔ عوام ان کے مخاطب تھے۔ وہ ان تک اپنا

---

۱ اردو شہ پارے، ص ۱۳

۲ اورینٹل کالج میگزین، لاہور، نومبر ۱۹۳۰، ص ۱۷

پیغام پہنچانا چاہتے تھے۔ وہ اپنے ماحول سے بیگانہ نہیں تھے۔ انھوں نے عوام کی زبان اور اصطلاحات میں عوام تک اپنا پیغام پہنچایا۔ ڈاکٹر عبدالحق (مرحوم) نے لکھا ہے کہ

«درویش کا تکیہ سب کے لئے کھلا ہوتا ہے۔ بلا امتیاز ہر قوم کے لوگ اس کے پاس آتے اور اس کی زیارت و صحبت کو موجب برکت سمجھتے ہیں عام و خاص میں کوئی تفریق نہیں ہوتی۔ خواص سے زیادہ عوام ان کی طرف جھکتے ہیں اس لئے انھوں نے اپنے اصول اور عقائد کی تلقین کے لئے جہاں اور ڈھنگ اختیار کئے ہیں ان میں سب سے مقدم یہ تھا کہ جہاں جائیں اس خطہ کی زبان سیکھیں تا کہ اپنا پیغام عوام تک پہنچا سکیں۔»[1]

شاہ صاحب کا کلام اس بیان کا عمدہ ثبوت ہے،

ترسیل خیال زبان کا اصل مقصد ہے۔ جیسے مخاطب ہوتے ہیں ویسی ہی زبان استعمال کرنی پڑتی ہے۔ «خیالات کے اظہار کے لئے زبان آوازوں کا ایسا نظام عمل ہے کہ لوگ اسے سمجھ سکیں اور اس کے مطابق اپنا رد عمل ظاہر کرسکیں۔»

اردو ادب کے قدیم دکنی روپ کے غائر مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت اردو زبان تشکیل اور ارتقاء کی کن کن منزلوں سے گذر رہی تھی۔ خیال کے اظہار کے لئے قواعد کے اصولوں کی پابندی نہ تھی اور نہ اس کا خیال تھا۔ الفاظ بن رہے تھے۔ ان کی شکلیں بدل رہی تھیں۔ جملوں مین توڑ مڑوڑ ہورہا تھا۔ ان امور کے لئے کوئی ضابطہ مقرر نہ تھا۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ زبان اپنے بننے میں قواعد اور اس کے اصولوں کا انتظار نہیں کرتی یہ اصول بعد میں مرتب ہوتے ہیں۔ زبان کو علماء اور ماہرین السنہ کی بھی تلاش نہیں رہتی۔ قواعد کی پابندیاں زبان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتی ہیں۔

ابتداء میں زبان میں کئی تغیرات — صوتی، معنوی اور صوری وغیرہ — رونما ہوتے رہتے ہیں۔ لفظوں کی صوتی شکل تحریری صورت اختیار کرلیتی ہے۔ ایک

---

۱ اردو زبان و ادب، ص ۴۳

ہی لفظ کو ضرورت کے تحت کئی طرح سے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک ہی لفظ مختلف شکلوں میں ملتا ہے۔ زبان کے ابتدائی دور میں ان باتوں پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔

جب لسانی معیار ترتیب پاجاتے ہیں اور قواعد کے سانچے بن جاتے ہیں تو اس عہد کی زبان جاننے والوں کو قدم قدم پر حیرت ہوتی ہے۔ اس کی ابتدائی اور موجودہ شکل میں زمین آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ لہذا یہ ضروری نہیں کہ قدیم عہد کی زبان اور اس کی شکلوں کو پرکھنے کے وقت جدید زبان کے قواعد اور لغات کی روشنی میں اس کا جائزہ لیا جائے۔ «زبان کی ارتقائی اور تدریجی طور پر بدلتی ہوئی صورت کا مطالعہ تاریخی اور تقابل لسانیات کی روشنی میں کرنا چاہئے۔ زبان کا دھارا رواں دواں ہے۔ اس کی صحت کا انحصار رواج پر ہے۔

مذکور حقائق کی روشنی میں شاہ باجن رح کے کلام کا مطالعہ کیجیے۔ مطالعہ کے وقت یاد رکھئے کہ عوام ان کے مخاطب تھے۔ انھوں نے عوام الناس کو سادہ اور بے تکلف زبان میں اپنا پیغام پہنچایا۔ ان کے پیغام میں فرقہ بندی نہ تھی۔ وہ ہمہ گیر اور عالم گیر تھا۔ ان کا پیغام ہر رنگ، قوم، نسل اور ذات کے فرد کے لئے تھا۔ اس لئے انھوں نے اپنے عہد کے اظہار کے ذرائع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اظہار بیان کے قدرتی اور آسان ذریعوں کو کام میں لا کر یہ حقیقت عوام کے ذہن نشین کردی کہ خدا کی مخلوق میں مساوات ہے۔ وہ رنگ اور نسل کے امتیاز سے بری ہے۔ انسان کا فرض خالق اور مخلوق سے محبت کرنا ہے۔

اس مقصد کی اشاعت کے لئے شاہ موصوف کو کتابی زبان کی ضرورت نہ تھی وہ بول چال کی زبان استعمال کرتے تھے۔ کتابی زبان اور بول چال کی زبان میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔ اپنے مقصد کی اشاعت میں انھوں نے کسی اصول کی پابندی گوارا نہیں کی۔ اس وقت زبان اور قواعد کے اصولوں کی ترتیب و تدوین بھی عمل میں نہ آئی تھی۔ کتابی زبان میں بسا اوقات معانی قربان ہو جاتے ہیں۔ اس لئے شاہ باجن رح نے کتابی زبان کو ترک کر دیا کہ عوام ان کا پیغام سمجھ سکیں

سطور ذیل میں شاہ باجنؒ کی زبان کی بعض خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے

الفاظ کی قدیم شکلیں یہ ہیں :

جے ـ جو

تھے ـ سے

اہے ـ ہے

منہ ، منین ـ میں

آپیں ، اپین ، واپیں ـ آپ

چکہ ، کچہ ، کچھو ـ کچھ

اگیں ، اگہوں ـ آگے

پاچھیں ـ پیچھے

سریکھا ـ سریکا

لہنا ـ لینا

چھوٹک ـ چھٹکارا

پہلوں ـ پہلے

منجہ ـ مجھ

اب دھوتی ـ اب دھوت

نیلج ـ نراج

جیو ـ جی

ناں ـ نہیں

تانوں ، نانو ـ نام

تھانو ، تھیاؤں ـ استھان

کت ـ کون سا

بھوت ، بہوت ، بہیت ـ بہت

لوہو ، لوھو ـ لہو

دنہ ـ دونوں

ہور ـ اور

نانگے ـ ننگے

الفاظ کی جمع :

(ا) برج کی طرز کی :

کلالوں ۔ کلالنه

درویشوں ۔ درویشنه

باپ ۔ باپنه

راتوں ۔ راتنه

اوروں ۔ اورنه

لوگوں ۔ لوگن، لوگاں

(ب) پنجابی طرز کی :

کانٹے ۔ کانٹیاں

آنکھیں ۔ انکھیاں

جمع مضارع :

دھریں ۔ دھرنه

کریں ۔ کرنه

بلسیں ۔ بلسنه

ترسیں ۔ ترسنه

تپئیں ۔ تپنه

پریں ۔ پرنه

جاگیں ۔ جاگنه

مانگیں ۔ مانگنه

لوریں ۔ لورنه

دریریں ۔ دریرنه

چھوڑیں ۔ چھوڑنه

اسماء ضمائر :

یه، ایه، یو، اے، ان، ایون

او، وو، وے

توں، تُہیں (تونہیں)، تج، تجھ

منج، مج، مجھ

جے

وہ الفاظ جو مسلسل استعمال کئے گئے ہیں :

دسنا، دشتا رہے، سیونا، لہنا، لہے، اچھانا۔ اچھے، بسلانا، اپاوے، سوہے، لانگھا، اہے، اتھے، کیتا، لوانا، لوائے۔

ہائے مختمہ پر ختم ہونے والے الفاظ :

کلالنہ، لوکنہ، کرنہ، دھرنہ، انـہ، جنہ، نینہ، لبینہ، باتونـہ، دینـہ، رانیہ، کھانہ، لورنـہ، ترسنہ، بلسنہ، دریرنہ، جاگنہ، تپنہ، پرنہ۔

مصمتوں میں «ہ» کی تخفیف :

کتا ۔ کہتا

پیلا ۔ پہلا

کورے ۔ کھورے

گور ۔ گھور

بری ۔ بھری

صوتی اعتبار سے مصمتوں کی تخفیف :

بہتر، بھتر، بھیتر ۔ اندر

اواز

گور (گھور)

دڑبڈا (دربدا)

صوتی تبدیلیاں :

پھاٹا ۔ پھٹا

لاگا ۔ لگا

لاگے ۔ لگے

کاندھے ۔ کندھے

مسموع اور غیرمسموع کی تقلیب صوت :

مسیت ۔ مسجد

نگہ وان ۔ نگہبان

ہندی صرف کے تصرف کی مثالیں :

فارسی اور عربی الفاظ کی برج کے مطابق جمع :

کافر ۔ کافرنہ

عاشق ۔ عاشقنہ

درویش ۔ درویشنہ

ہندی مضارع عربی سے :

رقص سے رقصے بنا لیا. جو دھمکے ، ٹھمکے اور جھمکے کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے. فارسی لفظ میاں (درمیان) کو میانے بنا لیا.

فارسی محاورات کے ترجمے :

روزہ داشتن ۔ روزہ دھرنا

نماز گذاردن ۔ نماز گذارنا

زکات دادن ۔ زکات دینا

مخصوص حروف کا استعمال :

ستے ، تے ، تمھے ، سوں ، آنکھے ، اک ، تلک ، تون ، تلے ، تلھیں.

حروف مشدد کا استعمال :

لیّا ۔ لیا

میّرا ۔ میرا

اڑّانا ۔ اڑانا

ہیّرا ۔ ہیرا

کہیں علامت فاعلی (نے) کا استعمال نہیں ہے :

کلالن دیّا ۔ کلالن نے دیا

افعال کا صیغۂ ماضی الف کے بجائے یا (ی) سے مرکب :

پانیا ، بسلانیا ، دیّا ، گنواوا ، نرہیّا ، کلیا ، چلیا ، کیتا (کہتا ہے)

افعال مستقبل میں « سی » کے مرکبات کا استعمال :

کریسوں ۔ کرونگا

دیسوں ۔ دونگا

اتریسوں اتریگا

واو (و) کے اضافے کے ساتھ افعال :

جگاویں (جگاؤنا) ۔ جگانا

سناویں (سناؤنا) ۔ سنانا

رولاوے ۔ رولانا ۔ رلانا

آویں ۔ نیاوے ۔ آنا

گنواوا ۔ گنوانا

فعل کی یہ صورتیں بھی ہیں :

کہانا ۔ کہلوانا

بعض الفاظ کا املا یوں ہے :

رکھوالا ۔ رکھوال

چھاؤں ۔ چھانہ

گلا ۔ گر

لہو ۔ لوہو

نالے ۔ نالھے

پانی ۔ پانیں

چوتھی ۔ چوتھیں

سطور بالا میں شاہ باجن کے اشعار کی زبان کی چند خصوصیات بیان کی گئی ہیں ۔ یہ اشعار اردو کے قدیم روپ کے نمونے ہیں ۔ لسانی نقطۂ نظر سے ان کی اہمیت مسلم ہے ۔ زبان کے تدریجی ارتقا کے جائزے میں ان سے بڑی مدد مل سکتی ہے ۔

*

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

اور

ادبی پبلشرز

کی مطبوعات

	قیمت
۱۔ ولی گجراتی از ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی	۳ رُپے
۲۔ نور المعرفت از ولی گجراتی مرتبہ ڈاکٹر سید ظہیرالدین مدنی	۲ »
۳۔ اردو مخطوطات مسجد جامع، بمبئی مرتبہ مولوی حامد اللہ ندوی	۴ »
۴۔ میرزا مظہر جان جاناں از عبدالرزاق قریشی	۶ »
۵۔ لغات گجری مرتبہ سید نجیب اشرف ندوی	۱۰ »
۶۔ دیوان عزلت » عبدالرزاق قریشی	۱۰ »
۷۔ مبادیات تحقیق از » »	۴ رپے، ۵۰ پیسے
۸۔ نوائے آزادی مرتبہ » »	۵ رپے
۹۔ مقالہ نما (نوائے ادب) مرتبہ مس رقیہ انعام دار	۲ »
۱۰۔ راگ مالا از سید عبد الولی عزلت مرتبہ عبدالرزاق قریشی	۴ »

ملنے کا پتا:

ادبی پبلشرز، شیفرڈ روڈ، بمبئی ۸

ایڈیٹر: عبدالرزاق قریشی

پرنٹر پبلشر سید شہاب الدین دسنوی نے ادبی پرنٹنگ پریس، ۸، شیفرڈ روڈ، بمبئی ۸، میں چھپوا کر، مالکان انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ۹۲، دادا بھائی نوروجی روڈ، بمبئی ۱، کے لئے شائع کیا۔

فارم IV

دیکھو رول نمبر ۸

نوائے ادب ، بمبئی

مقام اشاعت	:	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱
نوعیت اشاعت	:	سہ ماہی
نام پرنٹر	:	سید شہاب الدین دسنوی
قومیت	:	ہندوستانی
پتـــہ	:	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱
نام پبلشر قومیت پتـــہ		ایضاً
نام ایڈیٹر	:	عبدالرزاق قریشی
قومیت	:	ہندوستانی
پتـــہ	:	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱
نام پتہ مالک رسالہ	:	انجمن اسلام ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی

میں سید شہاب الدین دسنوی تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم میں صحیح ہیں ۔

Nawa-e-Adab

A QUARTERLY JOURNAL OF

THE ANJUMAN-I-ISLAM URDU RESEARCH INSTITUTE

Annual Subscription :

Inland & Pakistan : Rs. 6 Foreign : Shillings 12
(inclusive of postage)

Price per copy: Rupee one & Paise fifty

[Vol. 22 1971 JANUARY - MARCH No. 1]

All remittances to be made to

THE ADABI PUBLISHERS

8 Shepherd Road, Bombay 8 (India)

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

کا

سہ ماہی رسالہ

نوائے ادب

ناشر

ادبی پبلشرز (شعبۂ اشاعت انجمن اسلام) بمبئی ۸

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

(بمبئی یونیورسٹی سے ملحق)

کے

اغراض و مقاصد

۱. ایم اے کی تعلیم کا انتظام

۲. پی ایچ ڈی اور دوسرے تحقیقاتی کام کرنے والوں کی اعانت۔

۳. تحقیقاتی کام کرنے والے اداروں اور جامعوں سے تعاون۔

۴. ایک جامع کتب خانہ کا قیام۔

۵. مختلف کتب خانوں کے اردو کے مخطوطات کی فہرست کی ترتیب۔

۶. نایاب مخطوطات و مطبوعات کی اشاعت۔

۷. اردو سے متعلق ایک علمی و تحقیقاتی سہ ماہی رسالہ کا اجرا۔

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

کے

سہ ماہی رسالہ نوائے ادب کی خصوصیات

۱. اردو زبان و ادب سے متعلق مختلف پہلوؤں پر بحث و تحقیق۔

۲. گجرات و دکن کی غیر مطبوعہ اردو تصانیف کی اشاعت

۳. اردو سے متعلق تحقیقاتی کاموں کی اطلاع۔

۴. اردو کے علمی و ادبی رسائل کے مضامین کی تلخیص و اشاعت۔

رسالہ سال میں چار بار شائع ہوگا

جنوری اپریل جولائی اکتوبر

چندہ سالانہ :- چھ روپے

فی پرچہ :- ڈیڑھ روپیہ

مع محصول ڈاک

ایڈیٹر: عبدالرزاق قریشی

ترسیل مضامین و خط و کتابت

ڈائرکٹر

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

۹۲. دادا بھائی نوروجی روڈ

بمبئی ۱

خریداری و ترسیل زر

ہندوستان میں :-

ادبی پبلشرز

۸ شیفرڈ روڈ ، بمبئی ۸

نوائے ادب بمبئی

تاریخ اشاعت ۱۵ اپریل ۱۹۷۱ ع

جلد ۲۲ | اپریل ۱۹۷۱ | شمارہ ۲

شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	کلمۃ الاسرار	حسینی شاہد	۱
۲	سر سید کی سب ..... اردو تصنیف	عبدالغفار شکیل	۱۷
۳	نکات سخن	احمر لاری	۲۷
۴	اردو میں ... سے متعلق سرمایہ	شاکرہ بیگم	۴۵
۵	مخمس از سیلان	ابوالنصر محمد خالدی	۵۵
۶	ریسلاس	اشفاق احمد	۶۲
۷	مولانا احسن مارہروی کی ادبی خدمات	پروفیسر ضیاء احمد بدایونی	۷۴

* حسینی شاہد

کلمة الاسرار

صوفیائے کرام نے کلمۂ طیبہ کی تشریح و تعبیر میں بڑا زور قلم صرف کیا ہے اور اپنے فکر و وجدان اور مشاہدات و مکاشفات کا اعجاز دکھایا ہے۔ حضرت امین کا رسالہ کلمۃالاسرار بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

اس رسالے کے حسب ذیل نسخوں کا پتہ چلا ہے :

١) کتب خانہ مولوی علیم الدین صاحب، حیدرآباد۔

تعداد صفحات ١٨

دکھنی اور فارسی رسائل کے ایک مجموعہ میں رسالۂ طریق الموحدین (شاہ راجو بن شاہ نصیر اللہ حسینی)، مفتاح التوحید در حل مشکلات و شرح قصیدۂ محبوب چشتی، وجودالعاشقین (خواجہ بندہ نواز)، رسالۂ شاہ راجو قتال حسینی، مراۃ الاذکار (صدرالدین)، مثنوی وجودیہ (قادر سید ظہوراللہ)، رسالۂ اصطلاحات صوفیہ کے ساتھ کلمۃالاسرار بھی شامل ہے۔ اس نسخہ کی لوح اور خاتمے پر "این کلمۃالاسرار بہ تصنیف حضرت امین الدین عالی قدس اللہ سرہ" لکھا ہے۔ رسالہ کا آغاز حسب ذیل اشعار سے ہوتا ہے جو نثر کی طرح لکھے ہوئے ہیں :

عجب دریا بیچوں کا گھیرا ہے لا نہایت یو
(کڑا)
اُوسے اکھیاں سے عرفاں کے تمھیں اے عارفو دیکھو
(عارفاں)
نہ اوس کا ٹھاؤں کچ دستا بہوت گہراؤ دریا ہے
جو اوس کا انت لینے گئے ہوئے گم گشت فانی او
او دریا (لا) الہ (کا ہے) جے حد ہور نہایت نیں
ہور اللہ اِلہ کا موتی اوسی دریاؤ میں دھونڈو
(سوالااللہ)

---

* ڈاکٹر حسینی شاہد، ایم. اے؛ پی ایچ ڈی؛ پرنسپل اردو آرٹس کالج، حیدرآباد؛ رکن سنیٹ، عثمانیہ یونیورسٹی (یو پی) حیدرآباد، رکن ساہتیہ اکیڈمی، آندھرا پردیس، حیدرآباد۔ وغیرہ

اوسی موتی میں عجائب جوت سو نور محمد ہے
تجلی نور کی کھوں اب رسول اللہ کر بوجھو
(اوس کوں)

تمیں کلمے کے معنے کوں ذرہ چت لائے کر سننا
تمیں یو پیر سوں بوجھنا بھی اوس کوں دل اوپر دیکھو

لا اِلہ الا اللہ باطن تھا سو ظاہر ہو
آپ محمد رسول بن کور آیا باہر ہو

ان اشعار کے بعد اصل رسالے کا آغاز ہوتا ہے :

«لا اِلہ الا اللہ محمد رسول اللہ . مرید نے پوچھا مرشد کامل سوں کہ اے مرشد رہنما و اے ہادی صاحب زماں کلمہ کا معنی کیا ہے سو بولو ہور مہربانی کرکے یو رمز مجہ پر کھولو . تب مرشد نے فرمائے کہ کلمہ کا ظاہر کا معنا یو ہے کہ نہیں کوئی معبود برحق مگر اللہ ہے ہور محمد بھیجے گئے ہیں . ....»

خاتمے کی عبارت یہ ہے :

«جب پیر نے مرید کوں یو کلمے کے معنی کا مشاہدہ بتلائے تو مرید کے دل میں آنند ہوا . مرید اس آنند کی خوش حالی سوں مست ہو کر آپی بھی سراپا آنند بیچ رھیا ہور اس آنند کی مستی سوں مدمست ہوکر یو بیت کہا . بیت :

جوں کہ دریا عین آب است قطرۂ او عین آب
قطرہ دعوا می‌کند من عین دریا یافتم .

گم شدم در خود نمی دانستم کہ پیدا شدم
(جو و نمی دانم کجا)
شبنم بودم ز دریا غرق دریائے شدم
(شبنمی)

جان این خاک پائے کہ آں بود حبابے
بشکست و بحر گشت و شد از بے نشانے (کذا)

«بعد مرشد صاحب نے کلمۃ الاسرار اس رسالہ کا ناؤں رکھے ہور کہے
کہ جوکوئی اس رسالے کوں صدق دل سوں پڑھے گا یا سنے گا اور
اس کے معنی (یاد) کرے گا اس وقت اصل کو پونچے گا ہور اصل کوں
اپنے انپڑے گا. بیت :

الٰہی توں کلمے کے معنی کا نور شتابی سوں کر سب دلاں پر ظہور
جو اوس نور عرفاں سوں دیکھے تجے ہر ایک شےء میں اوس کوں محمد سجے»

ترقیمہ .

که ایں کلمت الاسرار به تصنیف امین الدین عالی قدس‌الله سره . تمت تمام شد

۲) کتب خانۂ آصفیہ، حیدرآباد .

مخطوطہ نمبر (۶۳) تصوف، تعداد صفحات ۲۴

اس نسخے پر کوئی سرنامہ نہیں ہے، البتہ بائیں حاشیہ پر یہ جملہ لکھا ہے :

رسالۂ حضرت شاہ برہان الدین جانم قدس‌اللہ سرہ برائے رحیمی کہ
مرید سائل کلمہ کا آیا تھا .

اور پانچواں شعر اس طرح ہے :

ایتا کلیمے کے معنی کوں ذرا چت لاے کر سنو
رحیمی پیر سوں پوچھیا ہے اوس کوں دل اوپر لیکھو

رسالے کے خاتمے پر «الحمد للہ علی کلِ حالٍ تمت شد بعون اللہ» درج ہے . ترقیمہ سیدھی جانب حاشیہ پر تھا جو جلد بندی میں کٹ گیا ہے . تاہم کاتب کا نام شاہ فضل اللہ قادری پڑھا جاتا ہے . مصنف کا نام دو جگہ تھا لیکن اس کے اوپر کے حصے کٹ گئے ہیں . ایک جگہ سید کا لفظ صاف پڑھا جاتا ہے . اس کے بعد امین کی «ی» اور اس کے دو نقطے اور ان سے ملحق «ن» بھی پڑھے جا سکتے ہیں . ظاہر ہے کہ یہ لفظ امین ہے، برہان نہیں ہوسکتا . دوسری جگہ امین شاہ لکھا ہے جس کے بعد تاریخ کتابت درج تھی . بحالت موجودہ صرف «جمعہ» رہ گیا ہے .

اس نسخے کو شاہ برہان الدین جانم سے منسوب کرنے کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ رسالے کے متن میں ایک مقام پر برہان الدین راز الٰہی کے حوالے سے چند شعر نقل کئے گئے ہیں . غالباً متن میں اس نام کو دیکھ کر تسامح ہوا اور رسالے کو شاہ برہان الدین جانم سے منسوب کر دیا گیا، اس

قسم کے غلط انتسابات کی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں۔ علاوہ بریں حاشیہ کی تحریر متن کے قلم سے مختلف اور بعد کی معلوم ہوتی ہے۔

۳) کتب خانۂ جامعۂ عثمانیہ، حیدرآباد۔

مخطوطہ نمبر الف ق ۶۱ ۲۹۷ م ن ۔ ک، تعداد صفحات ۳۰

اس نسخے میں سرنامہ یا ترقیمہ نہیں ہے۔ سوائے ان اختلافات کے جو ایک ہی رسالے کے دو مخطوطوں میں ہوسکتے ہیں یہ نسخہ کتب خانۂ آصفیہ کے نسخے کے مطابق ہے۔ مصنف کا نام کہیں درج نہیں ہے۔

۴) کتب خانۂ پروفیسر نجیب اشرف ندوی مرحوم، بمبئی۔

تعداد صفحات ۶

نظم و نثر کے بارہ دکھنی رسائل کے ایک مجموعے میں یہ نسخہ شامل ہے۔ ان رسائل میں سے ایک پر سنہ کتابت ۱۱۶۶ء اور دوسرے پر ۱۲۹۳ء درج ہے۔ کتابت کے پیش نظر اول الذکر سنہ غلط معلوم ہوتا ہے۔ اس مجموعہ میں کسب محویت (صدر الدین)، مثنوی چہار یار (علی اکبر)، رسالۂ نثر چہار یار (علی اکبر) رسالہ در بارۂ کلمۂ طیبہ (میراں محی الدین)، رسالۂ دل آئینہ (خو جہ عثمان بخش اور قادر معروف کا سوال و جواب)، کلمۃ الاسرار (امین الدین علی اعلیٰ) کے علاوہ پانچ اور رسائل شامل ہیں جن کے نام اور مصنف کا پتہ نہ چل سکا۔

کلمۃ الاسرار اس مجموعہ کا آخری رسالہ ہے جو ناقص الاوسط ہے لوح پر حسب ذیل شعر درج ہے:

الٰہی تو کلمے کے معنی کا نور شتابی سوں کر سب کے دل پر ظہور

اور بسم اللہ الرحمن الرحیم کے دائیں اور بائیں جانب « یہ بیان کلمہ طیب کے معنی کا ہے » اور « اس رسالے کا نام کلمت الاسرار حق » لکھا ہے۔ رسالے کا آغاز دوسرے نسخوں کے برخلاف اشعار سے نہیں ہوتا۔ آغاز کی عبارت درج ذیل ہے:

الحمد للہ الذی خلق الخلق لمعرفتہ۔ سب صفت اور ثنا سزاوار ہے خدا کوں کہ جو کچھ پیدا کیا انسان کے واسطے اور انسان کوں پیدا کیا ہوں مجھے بوجنے کے واسطے۔ قولہ تعالی ما من عبد الا لہ عابدین عنیین فی راسہ۔ خدا کہا بند، ہونا بہت مشکل ہے۔ گندے بھوتیرے ہیں۔ مجھے دیکھ بندہ ہوے گا نہیں تو گندے کا گندے رہے۔»

اس کے بعد اشعار کو نثری ترتیب میں لکھا ہے. جس میں رحیمی کا نام نہیں ہے . اصل رسالہ اس طرح شروع ہوتا ہے :

ترقیمہ حسب ذیل ہے :

تمام شد بتاریخ ہفدہم شہر شعبان ۱۲۰۴ ھ در نادیر در مکان قاضی انورالدین بخط خام محمد حفیظ اللہ باتمام رسید برای پاس خاطر میر ہادی علی عرف حضرت صاحب نوشتہ شد .

اس رسالے کے متذکرہ بالا چھہ نسخوں میں سے چار پر مصنف کی حیثیت سے حضرت امین کا اور ایک پر برہان الدین جانم کا نام درج ہے . جانم کا نام کتب خانۂ آصفیہ کے نسخے پر ہے جس کے بارے میں اظہار خیال کیا جاچکا ہے. تاہم مصنف کے تعین کے سلسلے میں اس کا دہرانا ضروری ہے .

اس نسخے کے پہلے صفحہ کے حاشیہ پر برہان الدین جانم کا نام لکھا ہے لیکن ترقیمہ میں جو جلد بندی کے موقع پر اوپر سے کٹ گیا ہے ، حضرت امین کا نام پڑھا جاسکتا ہے . حاشیہ کی تحریر متن کے قلم سے مختلف اور بعد کی ہے . ترقیمہ متن کے قلم سے ہے . اس لئے حاشیہ کے مقابلے میں ترقیمہ پر اعتبار کیا جانا چاہیے .

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے کتب خانۂ آصفیہ کے نسخے کی صفحۂ اول کی تحریر کے پیش نظر اس رسالے کو برہان الدین جانم کی تصانیف میں شامل کیا ہے [1] انھوں نے نہ تو ترقیمہ پر توجہ دی ہے اور نہ متن پر غور کیا ہے. ورنہ وہ اس رسالے کو جانم کی تصانیف میں شامل نہ کرتیں . رسالے کے متن میں ایک مقام پر برہان الدین راز الہی کا نام اور ان کے اشعار ملتے ہیں ، یہ داخلی شہادت بجائے خود رسالے کے جانم سے انتساب کی تردید کے لئے کافی ہے . برہان الدین رازالہی ۹۹۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۰۸۳ھ میں انتقال کیا. [2] وہ حضرت امین کے ہم عمر اور ہم عصر تھے. تذکروں کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ ان دونوں بزرگوں کے درمیان گہرے دوستانہ تعلقات قائم تھے . اس لئے حضرت امین تو راز الہی کے اشعار اپنے رسالے میں نقل کرسکتے ہیں لیکن جانم کے تعلق سے یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا

---

۱ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ ، اردو نثر کا آغاز و ارتقا ، ص ۱۷۰

۲ شاہ غلام علی ، مشکوٰۃ النبوۃ ، مخطوطہ ۱۹۴ تذکرہ ، کتب خانہ آصفیہ ، حیدرآباد ، حیدرآباد

کیونکہ جانم کی وفات کے وقت راز الہی کی عمر مشکل سے نو سال کی ہوگی۔ بنابریں ہم کہہ سکتے ہیں کہ کلمۃ الاسرار میں چونکہ برہان الدین راز الہی کا نام اور ان کے اشعار ملتے ہیں اس لیے یہ رسالہ جانم کی تصنیف نہیں ہوسکتا۔

علاوہ ازیں جس کسی نے شاہ برہان الدین جانم کا نثری رسالہ کلمۃ الحقائق دیکھا ہے اور ان کے اسلوب کے کھردرے پن، دکھنی اور فارسی فقروں، جملوں اور عبارتوں سے پیدا ہونےوالی ناہمواری اور بےلطفی سے واقف ہے وہ کلمۃ الاسرار کو بھی ان سے منسوب نہیں کرسکتا۔

کلمۃ الاسرار حضرت امین کا طویل رسالہ ہے۔ ان کا کوئی اور رسالہ اتنا طویل نہیں ہے۔ ان کے بعض رسائل تو صفحے دو صفحے پر ختم ہوجاتے ہیں۔ سب سے طویل رسالہ آٹھ دس صفحوں سے زیادہ کا نہیں۔

اس رسالے میں کلمۂ طیبہ کی تشریح و تعبیر بڑے انوکھے انداز میں کی گئی ہے۔ تشریح کے سلسلے میں کلمہ کے ہر جز کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے اور محمدالرسول اللہ کی وضاحت کرتے ہوئے نورمحمدی کے مسئلہ پر جی کھول کر لکھا ہے۔

گنج مخفی کی طرح اس رسالے میں بھی نہ تو حضرت امین کا وہ مخصوص طرز فکر اور طریق تفہیم ملتا ہے جو ان کی تحریر کی عام خصوصیت ہے، نہ ان کی مخصوص اور پسندیدہ اصطلاحیں ملتی ہیں اور نہ عناصر، وجود اور مراتب وجود کی وہ تفصیل جس کی ان تھک تشریح و تفہیم سے ان کے رسالے پٹے پڑے ہیں۔ اس رسالے میں انھوں نے عام صوفیہ کا انداز بیان اختیار کیا ہے بلکہ یہ طریق فکر اور طریق تفہیم خانوادۂ عالیۂ قادریہ سے بہت قریب ہے۔

یہ رسالہ بڑے دل کش ادبی اسلوب میں لکھا گیا ہے جس کی مثال اس سے پہلے بیجاپور کے صوفیانہ ادب میں نہیں ملتی۔

اس رسالے کے طرز فکر اور اسلوب بیان کی وجہ سے شبہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ حضرت امین کی تصنیف نہ ہو لیکن بعض پہلو ایسے بھی ہیں جنھیں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

١) جہاں تک اس رسالے کے طریق فکر اور طریق تشریح و تفہیم کا تعلق ہے یقیناً امین الدین علی اعلی کے دوسرے رسالوں سے یہ رسالہ مختلف ہے۔ اس میں نہ تو وہ اصطلاحیں ملتی ہیں جو حضرت امین الدین علی اعلی کی اپنی اختراع ہیں اور

نہ عناصر و مراتب وجود کی وہ تفصیل نظر آتی ہے جس کو انہوں نے پہلی بار رواج دیا تھا بلکہ اس کے برخلاف تصوف کی عام اصطلاحیں اور مروجہ انداز تفہیم ملتا ہے ۔ یہ تبدیلی یقیناً دعوت فکر دیتی ہے ۔ لیکن یہاں ہمیں اس حقیقت کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ حضرت امین چشتی ہی نہیں قادری بھی تھے بلکہ خود ان کے اپنے بیان کے مطابق انہوں نے اپنے ماموں شیخ محمود خوش دہاں سے پہلے خلافت قادریہ اور اس کے بعد خلافت چشتیہ حاصل کی تھی [1] نیز ان سے سلسلۂ قادریہ بھی ایسا ہی جاری تھا جیسے سلسلۂ چشتیہ جاری ہوا. ان کے بعض مشہور خلفاء ایسے بھی ہیں جنھوں نے ان سے صرف سلسلۂ قادریہ ہی میں بیعت و خلافت حاصل کی تھی ۔

چونکہ حضرت امین کی چشتیہ تعلیمات اور ان تعلیمات میں ان کا اجتہاد بہت مقبول ہوا اور ان تعلیمات کو ان کے سلسلے کے بزرگ صدیوں نظم و نثر میں دہراتے رہے اس لئے ان کی قادری نسبت ، قادریہ انداز فکر اور قادریہ طریق تفہیم پر پردے پڑے رہے ۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی بعض تحریروں میں یہ طرز فکر اور طریق تفہیم ملتا ہے لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے ۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ حضرت امین نے اس رنگ میں اور بھی رسائل لکھے ہوں گے جو یا تو دست برد زمانہ کی نذر ہوگئے یا ہنوز ہماری دسترس سے باہر ہیں ۔ بحالت موجودہ جو رسائل ہمارے پیش نظر ہیں ان میں کلمۃالاسرار کی حیثیت گل سر سبد کی ہے ۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ زیر نظر رسالے میں حضرت امین نے یقیناً نہ اپنی اختراع کی ہوئی اصطلاحیں استعمال کی ہیں اور نہ اپنی اجتہادی تعلیمات کا پرچار کیا ہے ۔ لیکن کلمہ کے جزو اول کی شرح کرتے ہوئے اپنی پسندیدہ اصطلاحوں کا سہارا لئے بغیر سیدھے سادے انداز میں لا کی جو تشریح کی ہے اس پر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی بنیادی تعلیمات سے انحراف نہیں کیا ہے اس لئے کہ وہ لا کی تشریح کرتے ہوئے وہی مفہوم پیش کرتے ہیں جو ان کے دوسرے رسائل میں « خالی » کے عنصر کا ہے ۔ خالی کے عنصر کا اضافہ حضرت امین کا خاص اجتہاد ہے جو ان ہی کے اثر سے بیجاپور کی چشتیہ تعلیمات کا طرۂ امتیاز بنا ۔

---

۱ خلافت نامۂ بابا شاہ حسینی مملوکہ سید امین الدین قادری جاگیردار جمال پور

حضرت امین نے لا کی جو تشریح کی ہے وہ عام طرز فکر کے مطابق موجودات عالم کی نفیٔ محض نہیں ہے بلکہ اس لا کو وہ اس ساری کائنات کا منشا اور سرچشمہ بتاتے ہیں اور چاروں عناصر کو خالی سے مستخرج کرتے ہیں ۔

«ارے بھائی لا تو کہتے ہیں نہیں کوں ۔ او نہیں کیا ہے اوسے بوج ۔ وو نہیں کیا ہے اوسے سمج ۔ یہی اوگاں بولتے ہیں کی اول عدم تھا سو اوس عدم سوں سب عالم موجود ہوا ہور نابود سوں سب جہاں بود میں آیا ۔ اتا معلوم کرنا کی جس شے میں سوں یو سب عالم پیدا ہوا ہور اوس شے کوں نہیں کیوں کر کہنا ۔ اوس شے کوں نابود ہور عدم کس وضاں جاننا ۔ ارے بھائی چھلکا اچھیا تو اوس میں سوں مغز باہر نکلتا ہے ۔ اگر چھلکا نا ہوئے تو مغز کہاں سوں باہر نکلے ۔ کسی بزرگ نے یہ کہے ہیں اوسے خوب سمجھنا ۔ بیت :

اون کچھ نہ تھا وو نرنکھار تھا　　دونو جگ کا پیدا کرنہار تھا

«اسی بات پر حدیث قدسی بولے ہیں : کنت کنزاً مخفیاً ۔ یعنی سو عین لا ہے ۔ لا یعنی نہیں تو وو نہیں سب جاگا موجود ہے ۔ ارے بھائی نیچے زمین ہور اوپر اسمان ۔ اس زمین ہور اسمان کے درمیان جو چیز نہیں اوس نہیں میچ گرتے ہیں ۔ اوس نہیں میچ زمین ہور اسمان گھیرا ہے ۔ اگر ہمیں قصد کئے کی سات طبق اسمان کے ہور کرسی کے اور عرش کے اوپر گئے تو انگے بولتے ہیں لا مکاں ہے ۔ لا تو بولتے ہیں نہیں کوں ۔ پس معلوم ہوا کی نہیں جسے کہتے ہیں اونہیچ عرش کے اوپر ہے ۔ اوس کا ٹھاؤں پایا نہیں جاتا کی او نہیں کہاں لگ ہے ۔ اوس وضا سوں اگر سات طبق زمین کے نیچے بھی دیکھے وو نہیں ہے ۔ جسے نہیں کہتے ہیں ووہیچ بھریا ہے وو نہیں نیچے کہاں لگ ہے اس نہیں کا ٹھاؤں نہیں معلوم ہوتا کہاں لگ بھریا ہے ۔ اس جہاں کے آس پاس اُنیں ہے ہور انیں کے اوپر دریا ہے ۔ اگر ہمیں قصد کئے ہور دریا کے پیلاڑ گئے ہور اس کی حد نہایت کوں انپڑے ۔ اس کنارے کے پیلاڑ بھی جسے نہیں کہتے ہیں ووہیچ نہیں دس آوے گا ۔ ہور وو نہیں کہاں تلک انگے ہے سو اس نہیں کا انت

پایا نہیں جاتا۔ ارے بھائی عالماں بولتے ہیں کی قیامت کے دن ساتو طبق زمین ہور ساتو طبق اسمان ہور جو کچ اس دونو کے درمیانے ہے سو او سب توٹ کر نابود ہوینگے تو اس وقت یہاں سے تا وہاں تلک جسے لا کہتے ہیں ہور جسے نہیں بولتے ہیں اوچ اچھے گا ہور کچ نا اچھے گا۔ یو یہاں بھی معلوم کرنا کی سب عالماں کہاں سوں آیا ہور کہاں جاکے گم ہوا۔ البتہ اوس نہیں میں سوں باہر آیا تھا ہور اس نہیں میچ گم ہوگیا تو یہاں بوجنا کی جس شےء سوں یو سب عالم باہر آیا ہور بھی اس میچ گم ہوا، اوس شےء کوں نہیں کیوں جاننا ہور اس شےء کوں نابود ہور عدم کیوں کر بولنا۔»

یہی انداز فکر ان کے رسالہ کلمۂ طیبہ میں بھی ملتا ہے۔

۲) اب رہا اس رسالے کی غیر معمولی دلکشی اور اس کے ادبی اسلوب کا مسئلہ۔ یہ صحیح ہے کہ باستثناے «ارشادات» حضرت امین کے دوسرے نثری رسالوں میں فی الجملہ کوئی ادبیت نہیں ہے۔ لیکن ان میں بھی کہیں کہیں ایسی جھلکیاں ضرور مل جاتی ہیں جن سے رسالہ نگار کے مزاج کی شعریت اور تخئیل کی پرواز کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ وہ کبھی کبھی بڑی خوبصورت اور نادر تشبیہات دے جاتے ہیں۔ خصوصاً تشبیہ مؤکد کے برتنے کا انہیں بڑا اچھا سلیقہ ہے اور اس سلیقے سے وہ اپنی نظم و نثر دونوں میں بڑا کام لیتے ہیں۔ مدارج وجود کے سلسلے میں انہوں نے جو مثالیں دی ہیں اور استعارے کا جو اسلوب اختیار کیا ہے اس سے ان کی تخئیل کی ندرت، محاکات کے تیکھے پن اور اظہار کی بلاغت کا اندازہ ہوتاہے۔ یہ ادبی جھلکیاں اس راے کے قائم کرنے کے لئے کافی ہیں کہ ان رسالوں کا مصنف شایستہ ادبی مذاق اوو اچھوتی تخلیقی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ لیکن ان کے مزاج کی یہ شعریت، تخئیل کی بلندپروازی اور اظہار کی بلاغت ان کے چشتیہ رسالوں میں پوری طرح بروےکار نہ آسکیں اور ان کا کوئی رسالہ ابتدا سے انتہا تک ادبی رینی میں رنگا ہوا نہیں ملتا۔

۳) اس رسالے میں بے پناہ ادبیت، سلاست اور روانی کے باوجود زبان وہی ہے جو گیارھویں صدی میں رائج تھی۔ یہ زبان شمس العشاق، برہان الدین جانم اور ان کے معاصرین کی ہو سکتی ہے اور نہ حضرت امین کے بعد کے عہد کی

جب کہ لسانی اعتبار سے دکھنی بڑے تغیرات سے دوچار ہو رہی تھی۔ خود حضرت امین کے ہم عصروں میں کوئی ایسا صاحب قلم صوفی نظر نہیں آتا جو ایسی شستہ اور شگفتہ زبان میں تصوف کے مسائل سمجھا سکتا ہو۔ اس لئے ہم اس رسالے کو حضرت امین کی تصنیف قرار دئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

حضرت امین کے دوسرے رسالوں کے برخلاف چونکہ اس رسالے میں نہ تو ان کی مخصوص اصطلاحوں کی کثرت ہے اور نہ پانچ عناصر پچیس گن کے شاخ در شاخ مسائل، اس لئے عبارت اتنی حسین، رواں، سلیس، شستہ اور شگفتہ ہے کہ اس رسالے کے مسائل و مطالب کا خاکہ پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے رسالے سے عبارت کے وہ حصے پیش کئے جاتے ہیں جن سے اس کے ادبی محاسن کا بیک نظر اندازہ ہوسکے۔

نثر مرصع کا رنگ ملاحظہ ہو:

«اے مرشد برحق، شتابی سوں کلمہ کا باطنی معنا بولو ہور یو نکتہ مج پر بیگی کھولو۔ وگرنیں مج پر بہوت بیقراری ہے ہور یو دن نہیں سب رات اندھاری ہے۔ کلمہ میں لا کیا ہے ہور الا کیا ہے ہور اللہ کیا ہے ہور محمد کیا ہے ہور رسول اللہ کیا ہے۔ کیوں کر اللہ سیں سو آئے ہیں یو سب کیفیت بتلاؤ ہور سب کی حقیقت مجے دکھلاؤ۔ تب مرشد رہنما مہربان ہوکر بولے ہور یو نکتہ مرید پر کھولے۔

«ارے بھائی اوس اللہ میں یک گفت و گوئے حقیقت ہے کہ جس میں سب عاقلوں کی عقل گم گشت ہے ہور سب داناؤں کی دانائی پست ہے۔ یہاں کوئی کیا بولے ہور یہاں کوئی کیا جانے۔ یہاں بولنے چالنے کی بات نیں۔ وو لا الہ ہوکر اپس کوں اس میں پہچانا ہور کہا کی یہاں میرے سوائے دوسرا کوئی دستا نیں ہور میرے بغیر از اس خلوت میں، کنت کنزاً مخفیاً میں، کوئی دوجا بستا نیں جو کچ ہوں سو مگر میچ ہوں۔»

حضرت امین نے مضامین کی توضیح اور تشریح کے لئے جگہ جگہ دلکش تشبیہیں تمثیلیں اور کہاوتیں استعمال کی ہیں:

«یہاں دوسرا کوئی نیں یعنی لا کی خلوت میں سب اللہ بھریا ہے کیوں بھریا ہے جوں پھول میں باس جوں دود میں گھیو .

———

وو لا الہ ہوکر اس محل الا کو آکر ایسیاں صفتاں سب اپس میں پایا ہور جیوں بیج میں جھاڑ ہے ہور دریا میں لراں ہور بڑبڑے ہیں.

———

یعنی اول کچ نیں تھا تو وو نیشکر ہوا ہور نیشکر سوں رس ہوا ہور رس سوں راب ہوا ہور راب سوں شکر ہوی ہور شکر سوں طرح طرح کی مٹھائی ہوئی ہور حلوا ہوا .

تمثیلی انداز بیان دیکھئے :

مثال اوس کا یو ہے کی سورج کی دھوپ دیکھ کر معلوم کیا کی سورج ہے ہور دھوپ نکلتی ہے . اگر سورج نا ہوتا تو دھوپ نا نکلتی ولیکن سورج کوں دیکھا نہیں . یوں محمد صاحب کے معجزے دیکھ کر معلوم کیا کی اللہ ہے تب محمد صاحب کے معجزے ظاہر ہوے . اگر اللہ نا ہوتا تو محمد کوں کون پہچانتا ہور محمد کے معجزے کہاں سوں پیدا ہور ظاہر ہوتے . »

———

«ارے بھائی چھلکا اچھیا تو اس میں سوں البتہ مغز باہر نکلتا ہے . اگر چھلکا نا ہووے تو مغز کہاں سوں نکلے . »

———

اگر باطنی معنا کلمے کا بوجے گا تو برحق مسلمان ہوئے گا ہور اس وقت شرک خفی ہور شرک جلی سوں باہر آوے گا . اگر نیں تو طوطا مینا بھی بہوت زبان سوں کلمہ پڑھتے ہیں تو وو کیا مسلمان ہوئے . »

———

اسی محال میں یک مثال بولتا ہوں اوسے ٹک کان دھر کر خوب توں سن . ارے بھائی برف میں ہور پانی میں ہور گار میں ہور کھار میں کیاری کے پانی میں هور سیاہی میں ہور سیاہی کی دوات میں

ہور سونے میں سونے کی کھان میں ہور دریا میں ہور دریا کی لہراں میں ہور جھاڑ میں ہور جھاڑ کے بیج میں سورج میں ہور سورج کی دھوپ میں ہور شکر میں شکر کی لذت میں کچ بھی تفاوت ہے ۔ یو اس احد نے احمد ہوکر محمد جلوہ کیا ہے ۔»

نورمحمدی کو سمجھانے کےلئے نوشابہ اور سکندر کا ایک قصہ بیان کیاہے جس سے یہ نازک مسئلہ پوری طرح ذہن نشین ہوجاتا ہے :

«اوس احد نے احمد ہوکر محمد ہو جلوہ کیا ہے ۔ اس محل میں اوہی لا الہ الا اللہ تھا سو محمد رسول ہوکر آیا ہے ہور اپنا پیغام اپیں پونچایا ہے ۔ اس جگو ایک حکایت یاد آتی ہے ٹک چت لاکر سن ۔ نقل : کہتے ہیں نوشابہ کی سکندر نے تعریف سن کر اپیچ ہرکارہ کا لباس پہنا ہوا قاصد ہوکر نوشابہ پاس گیا ہور جو کچھ پیغام تھا سو روبرو نوشابہ کے کہا ۔ تب نوشابہ نے یہ سب حقیقت سن کر بولی ہور کہی : توں پیغام کس کا پونچاتا ہے ہور توں کون ہے ! بولیا کہ میں ہرکارہ ہوں پیغام سکندر کا پونچاتا ہوں ۔ ہور کتے ہیں کہ نوشابہ بڑی صاحب عقل ، صاحب فراست ہور دانہ تھی ۔ او نے سب بادشاہاں کیاں تصویراں ہور سکندر بادشاہ کی بی تصویر لکھ کر اپنے پاس رکھی تھی سو معلوم کیئی کے یو رسول ہور ہرکارہ نہیں یو سکندریچ ہے ۔ پھر پوچھی کہ سچ کہ توں کون ہے ہور پیغام کس کا پونچاتا ہے ۔ بھی سکندر وہیچ بولیاکے میں ہرکارہ ہوں ہور پیغام سکندر بادشاہ کا پونچاتا ہوں ۔ تب نوشابہ نے بولی کے توں رسول ہور قاصد نہیں معلوم ہوتا مگر توں سکندر بادشا ہیچ ہے کے اپنا پیغام اپیں پونچاتا ہے ۔ رد و بدل بہوت ہوا ۔ تب پیچھے اس کی تصویر اوسے بتلائی ہور عین سکندر ہے کر معلوم کیئی ۔ اس رویش حضر نبی الکریم شاہ علی گاوں دھنی کے خواب میں آئے ہور حضرت شاہ علی نے اونوں کوں عین اللہ کر پچھانے ہور ویسے وقت یو مکاشفہ بولے :

بھیدوں سیتے بھیس نہ لیائے جسے لیائے تو جانے نہ پائے الخ

« ارے بھائی یو محمد رسول اللہ تو بھی اہیں اللہ ہے ۔ جوں تعریف سن کر سکندر بادشاہ ہرکارے کا سوانگ بھرکر نوشابہ پاس گیا ہور نوشابہ وسے عین سکندر کر جانی تو بھی فراست اور دانائی کرکے موافق حدیث شریف کے انا احمد بلا میم ہور انا عرب بلا عین ہور من رانی فقد رای الحق ، محمد رسول کوں جان ۔ ارے بھائی محمد کوں رسول نا جان عین اللہ چہ کر مان ہور اس اللہ سوں اگا دھیان ہور یو بات ہماری سانچ کر مان ۔ جہاں تیں یو وجود ہور جسد نظر آتے ہین اونوں کوں بھیجے گئے اللہ کے رسول کر پچھان بلکہ بے شبہ بے شک صفات اللہ کر بوجھ ۔ »

ایک دلچسپ کہاوت ملاحظہ ہو :

« اے مرید صادق ! اب ٹک چت لگا کر سن ہور دھیان کے خطریاں کو جمع کرکر یو معنا دھیان میں لاکر خاطر جمع ہوکر سنے گا تو اس معنے سوں تیری خاطر جمع ہوے گی ۔ وگر نیں تو بیلے کے انگے ڈمکی بجائے تو وو بیلا کیا میرا بیاؤ ہوتا وو کیاجانے کیا ہوتا ۔ یوں اگر میں تیرے انگے بکوا کیا ہور تو دل سوں نا سنے گا تو تجے کیا فائدہ ہوے گا ۔ »

حضرت امین نے بعض نازک مسائل کو حکایتوں کے ذریعہ بڑے انوکھے اور دلچسپ انداز میں سمجھایا ہے ۔ چنانچہ لا کی تفہیم کے سلسلے میں یہ حکایت بیان کی ہے :

« اس محل میں ایک حکایت یاد آتی ہے ۔ حکایت کوں خوب دل سو سمج کر راکھ یعنے دھیان میں لیا ۔ ہور مچھلی کے نمن لا کا دریا سب جاگا پایا جاتا ہے ۔ حکایت : سب مچھلیاں اپس میں پانی میچ اچکر فکراں کیاں کی لوگاں کتے ہیں کی مچھلیاں کا جیو مول سو پانی ہور ہمیں تو پانی کیا ہے کر دیکھیاں نیں ۔ پانی کوں دیکھنا کے پانی ہمارے سوں کیتک دور ہے ہور کدھر ہے ۔ اپس میں آپ بھوت فکراں کیاں ہور پانی کوں بھوت دھونڈیاں ولیکن پانی وو کوں نہیں دیسا ۔ پچھیں وونوں میں سوں ایک مچھلی بولی کی پانی ہمنا کوں دس

آئیے گا چلو فلانی بڑی مچلی کے پاس جائیں وو ہمناں کوں پانی بتلائینگی ہور پانی کہاں ہے کتک دور ہے تو دکھلائینگی۔ تب اس بڑی مچھلی کے پاس سب مل کر گیاں ہور اپنی حقیقت بیان وار کیاں کے توں سب مچھلیاں سوں بڑی ہے ہور سب مچھلیاں کی سردار ہے۔ تجے پانی معلوم اچھیگا۔ سپور توں پانی کوں دیکھی اچھینگی تو خدا کے واسطے ہمناں کوں پانی دیکھا کس واسطے کی لوگاں کتے ہیں کے پانی مچھلیاں کا جیو مول ہے۔ سپور پانی مچلیاں کا ٹھکانا ہے۔ ہور مچلیاں ہمیشہ پانی مینچ رہتیاں ہے۔ سپور پانی نہوے تو مچلیاں تڑپڑاکر مرجاتیاں ہیں ہور ہمن تو پانی کہیں ہے کر دیکھیاں نیں ہور بھی یو منت کیاں کے اپس جیو مول کوں دیکھنا ہور جس مکاں میں رہتے بستے ہیں او مکان کوں نا جاننا نہایت بیوقوفی ہور بڑی احمقی ہور بڑی نادانگی ہے بلکہ جو کوئی اپنے جیو مول کو نا پچھانتا اس پر کھانا پینا حرام ہے ہور زندگی اوس کی مردار ہے۔ پچھیں اوس بڑی مچھلی تعجب ہوکر ہنسی ہور بولی کی تمنا کیا ہوا پانی کیوں دستا نیں تمھاری انکھیاں کوں کیا پردا پڑیا ہے۔ تمھارا دل کدھر گیا ہے۔ تمناں کوں کون سی غفلت گھیری ہے۔ ہور پانی تمنا نیں دستا۔ ارے دیوانیاں ہو پانی تمھارے انکھیاں میں، پانی تمھارے نیچے، اوپر۔ ڈاویں، باویں انگے، پیچھے، تمھارے مون میں، حلق میں۔ تمھارے سینےمیں۔ تمھارے دل وجان میں بھریا ہے۔ لاکن تمنا دستا نیں سو عجب بات ہے۔ پچھیں وو بڑی مچھلی یو سب کیفیت بول کر ٹولاتی ٹولاتی کنارے پاس اون سب مچھلیاں کوں لے گئی ہور جھکولا ایسا دی جو ساریاں مچھلیاں پانی سوں باہر جاکر پڑیاں ہور پھڑپھڑانے لگیاں پچھیں پوکاریاں کی بیگی ہمنا کوں پانی میں کھینچ لیو نیں تو ہمیں مرتے ہیں، تڑپڑاکر جان دیتے ہیں۔ اب حقیقت پانی کی ہمنا معلوم ہوئی۔ پانی کوں سمجھیاں ہور پانی کوں اپنا جیو مول یقین کر بوجیاں۔»

زور بیاں کا یہ عالم ہے کہ چھوٹے چھوٹے جملوں اور مترادف لفظوں کی موسیقیت لب ولہجہ کی داخلیت سے مل کر ایک سیل سبک رو کی طرح گنگناتی لچکتی رواں دواں نظر آتی ہے۔

« ارے بھائی یو نکتہ باریک ہے باریکی میں عجب تاریکی ہے ۔ اس باریکی کو خوب سمج ۔ اگر اسے خوب دل سوں سمجے گا تو دل کی حقیقت کوں پاوے گا و گر نیں تو جنم اپنا ناچیز کھوئے گا ارے بھائی جسے دل کتے سو وہی اسم ذاتی اللہ پر کا نور ہے ۔ ارے دوانے بیگی سمج ۔ ایک دریا ہے ہور جوں دریاؤ میں سوں نیاریاں لہراں ہے ہور موجاں سو بڑے بڑے بےگنت آتے ہے ۔ ہور بھی اوسی دریاؤ میں گم ہو جاتے ہیں یونچ اس دل کے دریاؤ میں سوں کروڑوں فکراں لاکھوں خطرے بےشمار ( ) گھڑی گھڑی کدھر سوں آتے ہور کدھر جاتے ۔ کہاں جاکے سماتے ہیں سو نیں توں سمجتا ہور نیں توں جانتا »

« وہی لا الہ الا اللہ بیچوں و بیچگونہ ، بےشبہ بے نمونہ ، عالم باطن میں تھا سو محمد رسول اللہ کر عالم میں ظاہر ہوا ۔»

« خدائے تعالی کتا ہے تمارے شہ رگ سوں نزدیک ہوں ۔ اللہ حاضر ہے ، اللہ ناظر ہے ، اللہ شاہد ہے ، ہور جیو کا گوپت پرگھٹ ہے ۔ اللہ اون کا شاہد ہے ۔ ہر وقت میں اللہ ہمارے سات ہے ۔ ہور یونچ لا ہمارے سات ہے ہور ہمارے جیو سوں بھی قریب‌تر ہے ۔»

کلمۃ الاسرار بڑے دلکش ادبی اسلوب میں لکھا گیا ہے ۔ فقرے چست ، جملے رواں ، صنعت ترصیع کے استعمال سے عبارت مترنم ، زور بیان میں مترادفات کا پے بہ پے استعمال ، تفہیم و تشریح کے لئے قدم قدم پر تشبیہوں ، تمثیلوں ، حکایتوں کی کثرت ، مسئلہ کی تائید و توضیح کے لئے جگہ جگہ اشعار سے استدلال ، اس رسالے کے اسلوب بیان کی وہ خصوصیات ہیں جو نہ تو خود حضرت امین کے کسی اور رسالے میں ملتی ہیں اور نہ ان کے ہم عصروں کی تحریروں میں پائی جاتی ہیں ۔ بلکہ اس سادگی و پرکاری اور شگفتگی و روانی سے تصوف کے وہ رسائل بھی محروم ہیں جو ان کے بہت بعد لکھے گئے

« اے بھائی کلمہ کے معنی کیا کوئی سمجھے گا ۔ اے بھائی کلمے کے معنی سو محمد کا نور اور کلمہ سو محمد ۔ اے بھائی کلمہ کے معنی کو کوئی سمجھے گا اور اس نور کو کوئی دیکھے گا اور مرشد اپنے

حق کر سمجھے گا. اور صدق یقین میں سجدہ کرے گا جب وہ مرشد میں ہوئے گا؛ فنا فی اللہ بقا باللہ سو یہ کلمہ ہے . لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ. جب یہ راز مرید نے سن کر لوٹنے اور تڑپنے لگا اور مرشد کے قدموں پر گرا آزجی سے کہا اے مرشد رہنما تے کامل و ہادی رہبر میرے کہ آپ یہ کلمہ کے معنی سے آگاہ کرو اور یہ راز مجھ پر کھولو . . . . »

رسالے کا اختتام اُسی عبارت پر ہوتا ہے جو دوسرے نسخوں میں ہے .

۵) کتب خانۂ انجمن ترقی اردو، پاکستان .

تعداد صفحات ۵۰

آغاز کتاب سے قبل احمد علی نام کے ایک صاحب نے کلمۃ الاسرار من تصنیف امین الدین اعلیٰ قدس سرہ لکھ دیا ہے.[1] ترقیمے میں مصنف اور رسالہ کا نام موجود ہے :

این کلمت الاسرار من تصنیف حضرت امین الدین عالی قدس سرہ

تمت تمام شد بتاریخ ۲۲ ماہ ذی الحجہ ۱۳۰۸ھ

آغاز اور خاتمہ وہی ہے جو دوسرے نسخوں کا ہے. اس نسخہ میں بھی پانچویں شعر میں رحیمی کا نام نہیں ہے . مرتب فہرست مخطوطات انجمن ترقی اردو، پاکستان ، کا خیال ہے کہ حضرت امین اس رسالے کے صرف نام کے مصنف ہیں ، اس لئے کہ اس کو ان کے ایک مرید نے مرتب کیا ہے. البتہ جوابات کو ملفوظات شاہ امین الدین کہا جاسکتا ہے.[2] فہرست نگار کی اس رائے سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا ، اس لئے کہ یہ رسالہ سوال و جواب کی ہیئت میں ہے اور اس ہیئت میں سیکڑوں رسائل ملتے ہیں جن میں کلمۃ الحقائق بھی شامل ہے .

٦) کتب خانۂ انجمن ترقی اردو ، پاکستان .

تعداد صفحات ۳۸

لوح پر ایک فارسی شعر لکھا ہے :

بجاروب لا نروبے راہ (کذا) کی رسی در سرائے الا اللہ

---

۱ افسر صدیقی امروہوی ، فہرست مخطوطات انجمن ترقی ، اردو ، پاکستان ، جلد دوم ، ص ۲۷۳

۲ ایضاً

٭ عبدالغفار شکیل

سرسید کی سب سے پہلی اور غیر مطبوعہ اردو تصنیف

سرسید کی زندگی بامقصد زندگی تھی۔ انہوں نے اپنے زندگی کے جو مقصد قرار دے لئے تھے ان کی تکمیل و ترقی کے لئے اپنی زندگی کی آخری سانسوں تک تن من، دھن سے کام کیا۔ تحریر اور تقریر سرسید کے مقاصد کی تکمیل و ترویج کے دو زبردست وسیلے تھے جن سے کام لیکر انہوں نے وہ جادو جگایا جو آج تک کسی اور کے حصہ میں نہ آیا۔ اس معاملے میں وہ اپنی نظیر آپ تھے۔ ان کی تحریریں اور تقریریں ان کے قدردانوں اور عقیدت مندوں نے محفوظ کرلیں اور آج ہمارے پاس ان کی بیشتر کتابیں، رسالے مضامین اور خطوط موجود ہیں۔ سرسید نے اپنے پیچھے تحریروں کی شکل میں جو کچھ بطور یادگار چھوڑا ہے وہ ایسا عظیم سرمایہ ہے جو ہر آنے والی نسل کے لئے، قومی فلاح و بہبود کا جذبہ رکھنے والوں کے لئے اور قومی کارکنوں کے لئے مشعل راہ کا کام دیتا رہے گا۔ یوں تو ان کی بہت سی تحریریں زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں، لیکن نہ معلوم ان کے قلم سے لکھے ہوئے ابھی کتنے گنجہائے گرانمایہ گوشۂ گمنامی میں پڑے، ان کے عقیدت مندوں کی طرف آنکھ اٹھائے منتظر بیٹھے ہیں کہ وہ آئیں اور سرسید کی ان کمیاب چیزوں کی بازیافت کریں اسے میری خوش قسمتی کہئے کہ ان کی ایک غیر مطبوعہ اور نایاب تصنیف میرے ہاتھ لگی جس کا مختصر سا تعارف یہاں پیش کر رہا ہوں۔

غیر مطبوعہ اور نایاب ہونے کی وجہ سے سرسید کی اس تصنیف کی جو اہمیت ہو سکتی ہے وہ اپنی جگہ پر مسلّم ہے ہی، لیکن اس امر کا انکشاف بھی کچھ کم باعث مسرت نہیں کہ ان کی یہ سب سے پہلی تصنیف ہے اور اس تصنیف کے بعد ھی انہوں نے متعدد کتابیں، رسالے اور مضامین لکھے۔ ان کی یہ نایاب

٭ ڈاکٹر عبد الغفار شکیل، ام۔ اے؛ پی۔ اچ ڈی؛ ریڈر، شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

اور غیر مطبوعہ تصنیف ہماری آپ کی محبوب زبان اردو کی گرامر سے متعلق ہے جس کا نام انہیں کا تجویز کردہ یہ ہے ،

«قواعد صرف و نحو زبان اُردو»

اس کتاب کا صرف ایک مخطوطہ خود سرسید کے ہاتھوں کا لکھا ہوا مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ ، مسلم یونیورسٹی ؛ علی گڑھ میں محفوظ و موجود ہے . سرسید نے یہ کتاب اردو قواعد سے متعلق اس وقت لکھی جب ان کی عمر صرف ۲۳ برس کی تھی . وہ اس وقت بالکل نوجوان تھے . ان کے آگے ایک طویل زندگی تھی جس میں انہیں ملکی ، قومی ، سیاسی ، معاشرتی ، مذہبی ، تعلیمی . لسانی وغیرہ وغیرہ بے شمار معرکے سر کرنے تھے جن کو اپنے راسخ عزم و استقلال سے سر کرکے سید احمد خاں سرسید بنے .

بوڑھے سرسید کی کتابیں اور مضامین تو ہماری آپ کی نظر سے گذر چکے ہیں . آئیے اب آپ کو نوجوان سرسید کی اس نایاب تصنیف سے متعارف کراؤں. ان کی یہ اولین تصنیف ۱۸۴۰ع میں لکھی گئی . اس وقت وہ آگرہ میں بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے . جیسے جیسے ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار ہندوستان کے طول و عرض میں بڑھتا گیا انگریز افسروں اور حکام کو ہندوستان کی مقبول و مشترک زبان اردو کا سیکھنا اور جاننا ناگزیر ہوتا گیا . ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج میں گل کرسٹ کی نگرانی میں انگریزوں کے لئے اردو کی تعلیم و تدریس کا باقاعدہ انتظام شروع ہوچکا تھا . گل کرسٹ اور دوسرے یوروپین لوگوں مثلاً جان شیکسپیر، ولیم ٹیٹ ، ایس . ڈبلیو بری ٹن ، اسٹافورڈ ارناٹ وغیرہ نے اردو قواعد اور لغت سے متعلق کتابیں لکھیں اور اہل یوروپ کی اس قسم کی کوششوں کا سلسلہ اُنیسویں صدی کے آخر تک برابر جاری رہا . اردو زبان کی گرامر یعنی قواعد پر سب سے پہلے غیروں نے توجہ کی . اہل ہند میں سب سے پہلی مرتبہ اردو قواعد پر قلم اٹھانے والوں میں انشاء اللہ خان انشاء کا نام سر فہرست ہے . ان کی کتاب دریائے لطافت کے نام سے مشہور ہے جو ۱۸۰۲ء میں نواب سعادت علی خان بہادر کے عہد میں لکھی گئی . بدقسمتی سے یہ کتاب عرصۂ دراز تک گوشۂ گمنامی میں پڑی رہی یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ سرسید کو انشاء کی دریائے لطافت کا علم تھا یا نہیں قیاس یہی کہتا ہے کہ ان کو اس کا علم نہ ہوا ہوگا .

ہندوستان میں نووارد انگریزوں کے لئے اردو نئی اور غیر زبان تھی۔ لیکن اس کا جاننا اور سیکھنا ان کے لئے بہت ضروری ہو گیا تھا۔ اردو جو انگریزوں کی مادری زبان نہیں تھی اس کو بولتے ہوئے انگریز صحیح تلفظ نہ کر پاتے ہوں گے اور اہل زبان نہ ہونے کی وجہ سے الفاظ کے تلفظ، ان کے صوتی اور صوتیاتی اختلافات اور ان کے موقع و محل کے اعتبار سے استعمال میں اُن سے اکثر غلطیاں بھی سرزد ہوا کرتی ہوں گی جیسا کہ عام طور پر نئی زبان بولنے والوں سے ہوا کرتی ہیں۔ چنانچہ سرسید نے اپنی زبان کو غیروں کے ہاتھوں بگڑنے سے بچانے اور اُس کے قواعد منضبط کرنے کے خیال سے اردو قواعد تصنیف کی۔ اس کتاب کے شروع میں وہ وجہ تصنیف بتاتے ہوئے رقم طراز ہیں:

«سبب اس کا یہ ہے کہ اہالیان سرکار کمپنی کو بمقتضائے تکلم الناس علی قدر عقولھم یہ منظور ہوا کہ زبان اردو کو رواج دیجئے اور اچھی طرح عدل وانصاف کیجئے تا ہر کہ ومہ اپنے مطلب کو پہنچے اور مطالب کو سونچے۔ مگر یہ بات بسبب منضبط نہ ہونے قواعد اس زبان کے بن نہیں پڑتی اور وہ بات ہو نہیں سکتی بلکہ اکثر لوگوں کو مبتدا اور خبر کی خبر نہیں اور نہ فاعل و مفعول کی تمیز۔ اس واسطے میں نے کہ نام میرا سید احمد خاں ہے۔ اور مسکن حضرت دہلی اور بیٹا سید محمد متقی المخاطب بہ خان بن میر ہادی المخاطب بہ جواد علی خاں بہادر اور نواسہ ہوں نواب دبیرالدولہ امین الملک خواجہ فریدالدین احمد خان بہادر مصلح جنگ کا، یہ کتاب بطور قواعد صرف و نحو زبان اُردو کے بنائی تا ہر شخص اس سے فائدہ مند ہو اور مطلب سرکار کا بآسانی حاصل ہو۔»

سرسید کی اس تصنیف کے دو باب ہیں۔ پہلا باب انہیں کے الفاظ میں «بیچ بیان قواعد بنانے الفاظ کے» اور دوسرا باب «بیچ بیان ترکیب الفاظ کے کہ لکھنا عبارت اردو کا منحصر اوس پر ہے۔» پہلے باب میں ایک مقدمہ ہے اور نو فصلیں ہیں۔ مقدمہ میں سرسید نے اردو کے الفاظ کی تین قسمیں بتائی ہیں اور وہ یہ ہیں:

(۱) اسم

(۲) فعل

(۳) حروف

پھر اسم کو انھوں نے دو قسموں میں تقسیم کیا ہے :

(۱) مشتق

(۲) جامد

اسی طرح فعل کی بھی دو قسمیں بتائی ہیں :

(۱) فعل لازم

(۲) فعل متعدی

اس کے بعد نو فصلوں کا ذکر آتا ہے . پہلی فصل « مصدر کے بیان میں » ہے جس کی تفصیل میں مصدر سے بننے والی سات اقسام کا تذکرہ ہے وہ ہیں : ماضی ، حال، امر ، نہی ، استقبال ، اسم فاعل ، اور اسم مفعول . دوسری فصل « ماضی کے بیان میں» ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ علامت فعل ماضی کی الف ہے . آخر لفظ میں اور صیغۂ جمع اور مؤنث میں سے الف بدل جاتا ہے ساتھ ہمزہ کے اور تذکیر و تانیث فعل ماضی کی فعل لازم میں باعتبار فاعل کے ہوتی ہے اور فعل متعدی میں باعتبار مفعول کے . « جانا » اور « کرنا » مصادر کی ماضی «گیا» «گئے» اور کیا ، کی» کے سلسلے میں سرسید لکھتے ہیں کہ « ان صیغوں میں بدل جانا حرفوں کا حروف مصدر کے خلاف قیاس ہے . اور اس کے تئیں ماضی من غیر نقطہ کہتے ہیں. اگرچہ ماضی «کرنا» «کی» «کرا» بھی آتی ہے . مگر فصیح اور زبان اہل سند نہیں ہے . پھر ماضی کے بارہ صیغے دئے گئے ہیں اور ماضی کی سات قسمیں مع گردان دی گئی ہیں. قسمیں یہ ہیں :

ماضی مطلق ، ماضی قریب ، ماضی بعید ، ماضی مشکوک ، ماضی مدامی ، ماضی تمنا ، اور ماضی منقطع .

تیسری فصل « حال کے بیان میں» ہے . حال کے بھی سرسید نے بارہ صیغے بتائے ہیں اور دو اقسام ، ایک حال مطلق ، اور دوسرا حال مشکوک. چوتھی فصل « امر کے بیان میں» ہے . سرسید کے زمانہ میں اہل دلی اور نواح دلی کے لوگوں میں امر بنانے کا ایک اور طریقہ بھی رائج تھا . وہ یہ کہ مصدر میں سے علامت مصدر گرانے کے بعد لفظ الف یا واؤ پر ختم ہوتا ہو تو صیغۂ امر غائب میں پہلے « ے » سے واو بھی لایا جاتا تھا . جیسے لا سے لاوے . اس کی وجہ سرسید

رفع ثقالت بتاتے ہیں ۔ آج بھی بول چال کی زبان میں دہلی اور نواح دہلی کے لوگ لاویں ، لاوے ، سوویں ، سووے کہتے ہیں ۔ پانچویں فصل « نہی کے بیان میں » ہے ۔ اس میں « نہ » اور « مت » کے استعمال سے متعلق بحث کی گئی ہے فصل چھٹی « استقبال کے بیان میں » ہے ۔ استقبال کے بارہ صیغے دئے گئے ہیں اور دو قسمیں بتائی گئی ہیں ۔ « ایک استقبال مطلق اور دوسری استقبال منقطع ۔ ساتویں فصل « اسم فاعل کے بیان میں » ہے اور اس کے بھی بارہ صیغے بتائے گئے ہیں ۔ آٹھویں فصل « اسم مفعول کے بیان میں » ہے ۔ اسم مفعول کے بھی بارہ صیغے دئے ہیں ۔ نویں اور آخری فصل « مصادر کے بیان میں » ہے :

جن مصادر کے سلسلے میں سرسید نے تفصیل سے بحث کی ہے وہ یہ ہیں:-
آنا ، اوترنا ، اولجھنا ، اوگنا ، اوڑھنا ، بسورنا ، بکھرنا ، بولنا ، پھوٹنا ، پھوڑنا ، بہنا ، بیٹھنا ، ٹوٹنا ، توڑنا ، تھرتھرانا ، جانا ، جاننا ، جاگنا ، چاٹنا ، چاہنا ، چبانا ، جلنا ، چلنا ، چمکنا ، جھاڑنا ، چھونا ، چھیدنا ، چھیلنا ، ڈالنا ، دھونا ، دھننا ، دیکھنا ، رکھنا ، رونا ، رہنا ، سونا ، سننا ، سیکھنا ، گانا ، کرنا اور ناچنا ۔

اردو میں اس سے کہیں زیادہ مصادر استعمال ہوتے ہیں ۔ لیکن اردو مصادر کے خزانے سے سرسید نے صرف مندرجہ بالا مصادر ہی کیوں چنے اور انہیں مصادر سے بحث کیوں کی ، اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اوپر جو مصادر دئے گئے ہیں وہ اپنے اپنے معنوں کے علاوہ اردو محاوروں میں مختلف معنی و مطلب دیتے ہیں ۔ اہل زبان ان محاوروں کے مفہوم و مطلب سے بخوبی واقف ہوتے ہیں لیکن جو لوگ اہل زبان نہیں ہوتے وہ اردو سیکھتے وقت اگر ان محاوروں کے معنوں سے واقف نہ ہوں تو چکرا جاتے ہیں یا اُن سے فاحش غلطیوں کے سرزد ہونے کا امکان ہے ۔ دلی والوں کو تو اپنی زبان پر ناز تھا ہی ۔ وہ زبان کی فصاحت اور بلاغت کو مجروح ہوتے دیکھ نہیں سکتے تھے ۔ سرسید بھی دہلی کے رہنے والے تھے ۔ انہیں یہ احساس ہوا ہوگا کہ انگریز اردو سیکھیں تو اردو کے مزاج سے بھی آشنا ہوں ۔ چنانچہ غیر زبان والوں کے لئے اردو کے چند خاص مصادر کے محل استعمال کے بارے میں انھوں نے چند تفصیلات اپنی قواعد میں دیدیں ۔ پہلے ہر مصدر کا تلفظ دیا گیا ہے ، پھر اس کے معنی اردو میں دئے ہیں ۔ اس کے بعد اس مصدر کا ہم معنی فارسی لفظ دیا گیا ہے اور پھر محاورہ میں اُس مصدر کا استعمال بتایا گیا

ہے۔ کہیں کہیں اردو کے استاد شعراء کے کلام سے مثالیں بھی وضاحت کے لئے دی گئی ہیں اور آخر میں مصدر سے بننے والے ماضی مطلق، ماضی قریب، ماضی بعید، ماضی مشکوک، ماضی مدامی، ماضی تمنا، ماضی منقطع، حال مطلق، حال مشکوک، امر مطلق، امر منقطع، نہی، استقبال مطلق، استقبال منقطع، اور اسم فاعل کے مختلف روپ دئے ہیں۔

جن مصادر کی تفصیل سرسید نے اپنی قواعد میں دی ہے ان کے مطالعہ سے حسب ذیل باتوں پر روشنی پڑتی ہے :

(۱) بعض مصادر (الفاظ) کا تلفظ جو سرسید کے زمانہ میں رائج تھا، مگر آج کی اردو میں مختلف تلفظ سے بولا جاتا ہے۔

(۲) تلفظ کی وجہ سے جو صوتی تبدیلیاں ہوتی ہیں، ان کا علم ہوتا ہے۔

(۳) مصادر کے معنی اور موقع و محل کے اعتبار سے ان کا استعمال۔

(۴) قواعد کی اصطلاحیں جو اس زمانہ میں رائج تھیں اور جو آج کل کی اصطلاحوں سے بالکل الگ ہیں یا زرا مختلف، مثلاً: استقبال منقطع مدامی وغیرہ۔ مگر اب اردو میں مستقبل، نا تمام وغیرہ۔

ان میں سے چند مصادر مثال کے طور پر ملاحظہ ہوں :

اولجھنا[1] ــــ اس مصدر کے تلفظ کی تفصیل یوں دی گئی ہے :

الف کو پیش ساتھ واو چھپی ہوئی کے اور لام کو فتح اور جیم ساکن ملی ہوئی ساتھ چھوٹی ہ کے اور نون کو فتح ساتھ الف کے۔ اس کے معنی خود سرسید کے الفاظ میں یہ ہیں: دامن یا کپڑا جوکہ پہنے ہوئے ہوں اور کانٹوں میں اٹک جاوے اوس کو اولجھنا کہتے ہیں اور اوس کی فارسی میں اختلاف ہے بعضے کہتے ہیں فارسی اس کی آویختن ہے اور بعضے کہتے ہیں اسکو سیدن ہے ساتھ زیر سین نقطہ دار کے اور سراج الدین علی خان آرزو لکھتا ہے کہ فارسی بےتکلف اس کی بند شدن ہے۔ مثلاً کسی کا کپڑا کانٹوں میں اٹکے تو کہتے ہیں کہ فلانی بخاری بند شد۔ اور محاورہ میں استعمال اس کا بہت ہے۔ ایک یہ کہ جو شخص فی سبب خواہ مخواہ کسے سے قضیہ اور جھگڑا کرے اوس کو اولجھنا کہتے ہیں۔ چنانچہ اکثر بولا جاتا ہے کہ صاحب، آپ کو تو خواہ مخواہ اولجھنا آتا ہے اور

۱۔ سرسید نے اس کا املا اولجھنا لکھا ہے

اوسکی مثال میں مجکو ایک شعر بہت خوب دلچسپ مولوی محمد صدرالدین خان بہادر آزردہ کا یاد آتا ہے۔ بیت:

اولجھنے کو بلا ہیں آپ بھی کچھ خیر صاحب
لگایا ہاتھ کس نے آپ کی زلف پریشاں کو

دوسرے یہ کہ سوت یا ریشم یا ڈور یا اور اس قسم کی چیز یا بال اوس میں مل جائیں اور اس میں پھندے اور گرھیں پڑجائیں، اوس کو بھی اولجھنا کہتے ہیں. جیسے کہ ڈور الجھ گئے یا بال اولجھ گئے. تیسرے یہ کہ پاؤں کسی آدمی کا کسی رسی یا کسی اور چیز سے اٹکے. اوس کو بھی اولجھنا کہتے ہیں. چنانچہ اس کی مثال میں کیا اچھا شعر ہے مومن خان مومن کا:

اولجھا ہے پانو یار کا زلف دراز میں
لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا

چوتھے یہ کہ کوئی کام درپیش ہو اور وہ بگڑ جائے اور اوس میں بہت سی تدبیریں کریں مگر اس کا انجام درست ہونا معلوم نہ ہو، اس کو بھی کہتے ہیں کہ یہ اوس سے اولجھ گئے یا اس میں اولجھاؤ پڑ گیا چنانچہ اس کی مثال میں ایک شعر کسی اوستاد کا یاد آگیا:

اولجھاؤ پڑگیا جو ہمیں اوس کے عشق میں
دل عزیز جان کا جنجال ہوگیا

اس کے بعد اس مصدر سے بننے والے مختلف افعال دئے گئے ہیں. ایک اور مصدر ملاحظہ ہو:

دیکھنا — پہلے اس لفظ کے تلفظ کی تفصیل سنیئے. دال خالی کو زیر اور یے نیچے کے دو نقطے والی ساکن ملی ہوئی ساتھ کاف مرکز والی کے اوپر چھوٹی ہ ساکن اور نون کو فتح ساتھ الف کے شعاع بصر کہ آنکھوں سے نکل کر اور کسی چیز پر پڑے اور وہ چیز معلوم و محسوس ہو. اوس کو دیکھنا کہتے ہیں اور فارسی اس کی دیدن ہے اور از روے محاورہ استعمال اس کا کئی طرح ہوتا ہے. ایک یہ کہ مثلاً: ایک شخص کہیں جاتا ہے اور اوس کے پاس کہیں راہ میں کنوا[1] یا آگ یا اور کوئی چیز کہ جس سے ضرر اور نقصان متصور ہو، آجائے تو، کہتے

---

۱ کنواں

ہیں کہ دیکھنا یعنی خبردار ہونا، اور دوسرے یہ کہ کوئی شخص کوئی بات کہے یا حرکت کرے اور دوسرا شخص کسی سے از راہ طعن و تشنع کہے کہ دیکھنا یعنی کیا سبک ہے یا کیا جھوٹا ہے یا کیا فریبی ہے۔ چنانچہ اس کی مثال میں کیا اچھا شعر ہے ابراہیم ذوق کا:

وہ جنازہ پر مرے کس وقت آیا دیکھنا
جبکہ اذن عام میرے اقربا کہنے کو ہیں

تیسرے یہ کہ کوئی کام درپیش ہو اور ایک شخص کہے کہ یہ نہیں ہووے گا اور دوسرا کہے کہ ہوگا اور اس کے جواب میں شخص اول کہے کہ دیکھیں گے یعنی نہیں ہوئے گا اور تقریر اوس کی قریب ہو جیسے کہ اس شعر خواجہ میر درد علیہ الرحمہ میں ہے:

گر ہیں یہی ڈھنگ تیرے ظالم
دیکھیں گے کوئی وفا کرے گا

چوتھے یہ کہ کسی شخص سے کچھ بات کہی اور وہ نہ مانے اور کہنے والا کہے کہ اگر یہ بات ہوئی تو دیکھیں گے کہ تم نہ کروگے۔ چنانچہ اس کی مثال میں ایک شعر خواجہ میر اثر کا یاد آیا:

دیکھیں گے اوس کی سنگدلی کو ہم اے اثر
گر کوئی نالہ ہم سے سرانجام ہوگیا

سرسید کی قواعد کا دوسرا باب "بیچ بیان ترکیب الفاظ اُردو کے کہ لکھنا عبارت اردو کا منحصر اوس پر ہے" سے متعلق ہے۔ اس باب میں پانچ فصلیں ہیں۔ پہلی فصل فاعل کے بیان میں ہے اور اس کی نشانی "نے" ہے۔ دوسری فصل مفعول کے بیان میں ہے جس کی نشانی "کو" ہے۔ تیسری فصل مبتدا اور خبر کے بیان میں ہے چوتھی فصل مضاف اور مضاف الیہ کے بیان میں ہے۔ اور پانچویں یعنی آخری فصل متفرق قاعدوں سے متعلق ہے جس میں بیان ہے حروف استثنا کا، شرط و جزا کا، حروف تشبیہ کا، حرف عطف کا، حرف اشارہ کا، حرف استفہام اور مونث سماعی کا۔

سرسید نے اپنی قواعد میں مندرجہ بالا عنوانات کا احاطہ کیا ہے اور ۲۳ برس کی عمر میں ان کی جو معلومات اردو قواعد کی تھیں اُن کو اپنے طور پر

فارسی اصطلاحوں کی مدد سے سپرد قلم کیا ہے ۔ بحیثیت مجموعی ان کی یہ تصنیف اردو قواعد پر کوئی جامع تصنیف نہیں ہے ۔ اس میں جگہ جگہ عبارت کچھ اکھڑی اکھڑی نظر آتی ہے ، چونکہ سرسید کے پیش نظر ایک مقصد تھا اور وہ مقصد اردو کے قواعد کو اردو سیکھنے والوں کے لئے منضبط کرنا تھا ، اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے انھوں نے اپنے عہد کی سلیس اور عام فہم بول چال کی زبان استعمال کی ہے ۔ سیدھی سادی اردو میں اردو کے قواعد سمجھائے ہیں اور دقیق الفاظ سے احتراز کیا ہے ۔ جہاں تک قواعد کی اصطلاحوں کا تعلق ہے سرسید نے جیسا کہ شروع ہی میں بتایا جا چکا ہے ، فارسی کی مروجہ اصطلاحوں ہی کو برقرار رکھا ہے ۔ کسی لفظ یا محاورہ کے جو مختلف معنی ہوتے تھے ان کو تفصیل سے دینے کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ اردو سیکھنے والوں سے غلطی سرزد نہ ہو ۔ سرسید کی یہ تصنیف اردو قواعد کے ابتدائی سرمائے میں ایک اہم اضافہ ہے ۔ بعد کو اور بہت سے لوگوں نے اور زیادہ جامع قواعدیں لکھیں ۔ شاید اسی لئے سرسید نے اپنی یہ کتاب نہیں چھپوائی اور یہ آج تک منظر عام پر نہ آسکی ۔

چونکہ رسالہ قواعد صرف و نحو زبان اردو سرسید کی ابتدائی اور اولیں تصنیف ہے اس لئے اس کی زبان میں وہ پختگی اور سلاست نظر نہیں آتی جو بعد کو ان کی دوسری تصانیف میں دکھائی دیتی ہے الفاظ کا املا بھی اُسی عام روش کے مطابق ہے جو اس عہد کے دیگر مصنفین کے یہاں ملتا ہے ۔ گ کو ک لکھا گیا ہے دودھ کا املا دود لکھا گیا ہے اور «جاننا» کو ‹ جانّا › تحریر کیا گیا ہے ۔ « نہ کہا » کا املا ملاکر « نکہا » ملتا ہے ۔ اسی طرح ‹ نہ ملے › کو ‹ نملی › یعنی یائے معروف اور یائے مجہول میں کوئی امتیاز نہیں برتا گیا ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ اس وقت کا عام طرز املا ایسا ہی ہو ایک جگہ «ساتھ» کو «ساتہ» لکھا گیا ہے ۔ معکوسی وقفی مُصمتے «ٹ» کو دندانی وقفی مصمتے « ت » سے لکھا گیا ہے ۔ ٹ اور ت ، کے املا میں اُس عہد میں فرق نہیں کیا جاتا تھا ۔ بعد کو سرسید کی ، تحریروں میں ٹ کا املا ث کی شکل میں بھی ملتا ہے ۔ ‹ ٹوٹنے › کو سرسید نے الگ الگ « ٹوٹ نے » لکھا ہے ۔ ان تمام باتوں کے باوجود سر سید نے جو الفاظ کی صوتیات اور تلفظ کی تفصیلات پیش کرنے کی کوشش کی ہے وہ قابل ستایش ہے

سرسید نے جس زمانہ میں یہ قواعد لکھی وہ مغلیہ سلطنت کے زوال اور اردو زبان کے عروج کا زمانہ تھا ، اردو اس وقت پورے شمالی ھند کی مقبول اور عوامی زبان تھی اور اس کی ترقی میں سرسید نے بھی حصہ لیا ۔ اردو ان کی مادری زبان تھی ۔ اس کی ترقی و ترویج کے لئے انھوں نے کیا کیا کیا اور کیا کیا سوچا اُس کی تفصیل کی یہاں گنجایش نہیں ہے ۔ جو کچھ انھوں نے کیا وہ ہم سب پر روز روشن کی طرح واضح ہے ۔ ۱۸٦۷ء میں جب بنارس میں ہندی کو رواج دینے کی تحریک شروع ہوئی تو سرسید نے اردو کی حمایت میں آواز بلند کی ۔ بعض سیاسی فرقہ وارانہ حالات نے اردو ھندی کے نزاع کو جنم دیدیا اور ہندی اور اردو الگ الگ زبانیں قرار پاگئیں تو سرسید نے اردو کے تحفظ اور اس کی ترقی و ترویج میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ۔ انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کرکے مختلف علوم کی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرواکر شائع کرا. وقتاً فوقتاً انگریزی حکام کو اردو کا جائز حق دلوانے کے لئے خطوط لکھے اور ایک خواب اردو یونیور سٹی کا بھی دیکھا ۔ وہ اردو کے تحفظ و ترقی کے لئے آخری وقت تک کوشاں رہے یہاں تک کہ اپنی وفات سے کچھ دن پہلے اپنے صوبے کے گورنر کو ایک میمورنڈم ادرو کے سلسلے میں پیش کیا ۔ وہ قوم اور ملک کے سب سے بڑے خادم تو اپنی جگہ پر ہیں ہی ، ان کی اردو زبان اور اردو و ادب کی خدمات بھی کچھ کم اہم اور کم عظیم نہیں ۔ وہ اردو کے سب سے بڑے محسن ہیں ۔ اُن کی وجہ سے جدید اردو ادب اس حیثیت کو پہنچی کہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں سے انکھ ملا سکے ۔ اردو زبان کی خدمت بھی سرسید کے عظیم مقاصد میں سے ایک تھی جس کی ابتدا انھوں نے « رسالۂ قواعد صرف و نحو زبان اردو » لکھ کر کی جس کا تعارف اس مضمون میں کرایا گیا ہے ۔ اردو کے محسنوں اور خادموں میں بےشمار لوگوں کے نام گنائے جا سکتے ہیں جن میں شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی ۔ لیکن اِن سب میں سرسید کا نام سب سے روشن ، سب سے درخشاں ، اور سب سے نمایاں ہے

* احمرلاری

«نکات سخن»

مولانا حسرت موہانی کی شاعری نے ایسی شہرت پائی کہ ان کے دوسرے کارنامے بڑی حد تک نظر انداز ہوگئے اور لوگ یہ بھول گئے کہ وہ صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ تذکرہ‌نگار، نقاد اور صحافی بھی تھے۔ تذکرہ نگاری، تنقید اور صحافت میں بھی ان کے کارنامے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ مگر کبھی کبھی کسی فن‌کار کی ایک صنعت میں شہرت دوسرے اصناف میں اس کی گمنامی کا باعث بن جاتی ہے۔ حسرت کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اُردو تنقید کا جائزہ لیتے ہوئے حسرت کی تنقید نگاری کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، حالانکہ ان کے یہاں نظریاتی اور عملی دونوں قسم کی تنقیدیں ملتی ہیں۔ ان کی تالیف «نکات سخن» نظریاتی تنقید سے متعلق ہے اور ان کی عملی تنقید کے نمونے «اُردوے معلیٰ» اور «تذکرۃ الشعرا» میں ملتے ہیں یا پھر ان مقدموں میں جو انھوں نے مختلف شعرا کے دواوین کے انتخابات مرتب کرتے ہوئے لکھے ہیں۔ یہاں صرف ان کی تالیف «نکات سخن» کا تعارف اور جائزہ مقصود ہے

«نکات سخن» نظریاتی تنقید پر اپنے طرز کی منفرد کتاب ہے۔ حسرت نے یہ کتاب اپنی دوسری قید فرنگ (مئی سنہ ۱۹۱۶ع تا دسمبر سنہ ۱۹۱۸ع) کے دوران لکھی اور تیسری قید فرنگ (۱۵ اپریل سنہ ۱۹۲۲ع تا ۱۲ اگست سنہ ۱۹۲۴ع) کے دوران اس پر نظر ثانی کی۔ اس کا دیباچہ اور اس کے باب اول کا کچھ حصہ پہلے «تذکرۃالشعرا» حصۂ دوم، جزو اول و دوم (جولائی و اگست سنہ ۱۹۱۹ع) میں شائع ہوا تھا۔ مگر رسالہ بند ہوجانے کے سبب یہ کتاب ناتمام رہ گئی۔ حسرت نے جب دوبارہ جنوری سنہ ۱۹۲۵ع میں «اردوے معلیٰ» جاری کیا تو اس میں یہ کتاب بالاقساط شائع ہوئی۔ اس کے پانچ ابواب تھے (جن کی تفصیل آگے آئے گی.) ان میں سے باب اول تا چہارم «اردوے معلی» میں سنہ ۱۹۳۴ع تک شائع ہوئے۔

* ڈاکٹر نور العین احمر لاری، ام ؛ اے ؛ پی ایچ ڈی ؛ استاد شعبۂ اردو، گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور

پانچویں باب کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ جب ایک باب «اردوئے معلی» میں چھپ جاتا تو حسرت اسے کتابی شکل میں شائع کر دیتے۔ چنانچہ باب اول (متروکات سخن) سنہ ۱۹۲۷ع میں باب دوم «معائب سخن سنہ ۱۹۲۹ع میں، باب سوم «محاسن سخن» سنہ ۱۹۳۰ع میں، اور باب چہارم (نوادر سخن) سنہ ۱۹۳۵ع میں کتابی شکل میں شائع ہوئے۔

متروکات سخن، معائب سخن اور محاسن سخن اتنے زیادہ مقبول ہوئے کہ سنہ ۱۹۴۱ع تک ان کے چھ اڈیشن نکل چکے تھے۔ بعد میں حسرت نے «نکات سخن» کے ان تینوں ابواب کو انتظامی پریس، حیدرآباد سے یکجا شائع کیا۔ اس پر سال طباعت درج نہیں۔ غالباً یہ کتاب اسی زمانے میں شائع ہوئی، جس زمانے میں حیدرآباد سے «کلیات حسرت موہانی» انتظامی پریس، سنہ ۱۹۴۳ع میں شائع ہوئی۔ اس کی فہرستِ ابواب و مضامین کے آخر میں یہ نوٹ درج ہے کہ «باب چہارم اور پنجم علیٰحدہ چھاپے گئے ہیں۔ اس مجموعے میں موجود نہیں۔»[1] حالانکہ فہرست میں پانچوں ابواب کی تفصیلات دی ہوئی ہیں۔ باب چہارم (نوادر سخن) کتابی شکل میں پہلی بار سنہ ۱۹۳۵ع میں طبع ہوا۔ اس کا کوئی دوسرا اڈیشن راقم‌السطور کی نظر سے نہیں گذرا۔ جہاں تک باب پنجم کا سوال ہے، اس کی بابت حسرت کا بیان محلِ نظر ہے۔ یہ باب نہ تو «اردوئے معلیٰ» میں شائع ہوا اور نہ کتابی شکل میں ہی منظر عام پر آیا۔

حسرت کے ایک شاگرد شفقت کاظمی نے راقم‌السطور کے نام ایک خط لکھا کہ «اصلاح سخن مولانا کی زندگی میں نہیں چھپ سکی۔ معلوم نہیں کہ ان کے اعزہ کے پاس اس کا مسودہ محفوظ بھی ہے کہ نہیں۔»[2]

حسرت نے یہ کتاب ان‌جدیہ تعلیم یافتہ شعرا کی رہنمائی کے لئے لکھی تھی جو شاعری کے فنی رموز و نکات سے پورے طور پر واقف نہیں تھے۔ چنانچہ وہ کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

---

۱ حسرت موہانی، نکات سخن، انتظامی پریس حیدرآباد، ص ۵

۲ شفقت کاظمی کا خط بنام راقم السطور، مورخہ ۶ نومبر ۱۹۶۷ع۔ عابد رضا بیدار نے بھی اپنے مقالہ «حسرت» موشوعہ برہان، دہلی شمارہ اگست ۱۹۶۱ع میں لکھا ہے کہ
«نکات سخن کی مندرجہ بالا پلان ۹ سال میں ۵/۴ مکمل ہوئی... اصلاح سخن کے بارے میں یہ بتانے سے قاصر ہوں کہ یہ حصہ لکھا بھی کیا یا نہیں»

«... دور جدید کے اکثر تعلیم یافتہ شاعر اپنے کلام میں بلندیٔ مضمون و ندرت خیال کے مقابلے میں زبان و بیان کی خوبیوں کا کافی لحاظ نہیں رکھتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے (کہ) اچھے سے اچھا مضمون محض ایک ادنیٰ خرابی کی وجہ سے بے لطف ہوکر رہ جاتا ہے» [1]

«حسرت موہانی کے دور میں استادی اور شاگردی کا سلسلہ قریب قریب ناپید ہوچکا تھا۔ اس لیے نوجوان شعرا کو شاعری کے محاسن و معائب کے متعلق صحیح اور کافی اطلاع بطور خود حاصل کرنے کے لئے ایک عرصہ درکار ہوتا تھا اور اس دوران میں وہ جو کچھ کہتے تھے اس کا معتد بہ حصہ بے مشقی اور ناتجربہ کاری کی بنا پر ضائع ہو جاتا تھا۔ نوجوان اور نومشق شعرا کو اس خسارے سے بچانے کے لئے حسرت نے یہ کتاب تالیف کی۔ حسرت کو اپنی استادی کا دعویٰ نہیں ہے۔ انھوں نے اپنے تیس سالہ تجربوں کا نچوڑ محض اس لئے پیش کیا ہے کہ اس پر طالبان فن صرف چند ماہ بلکہ چند دنوں میں حاوی ہو جائیں۔» [2]

اگرچہ حسرت نے نکات سخن، نومشق اور نوجوان شعرا کے لئے لکھی تھی، مگر بالواسطہ یہ کتاب ان کے تنقیدی نظریات کے اظہار کا وسیلہ بھی بن گئی۔ اردو تنقید کی تاریخ لکھنے والوں نے اب تک حسرت کو نظر انداز کیا ہے، مگر جدید دور کے ایک نقاد سید عابد علی عابد نے حسرت کی تنقیدی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

«اگرچہ حسرت موہانی کو مسلمہ نقادوں کی فہرست میں کم جگہ دی جاتی ہے، لیکن راقم السطور کے خیال میں ان کی تالیف نکات سخن اگرچہ مختصر ہے، لیکن بہت معرکے کی چیز ہے۔» [3]

---

۱ نکات سخن، دیباچہ، ص ۱ (موشوعہ اردوے معلیٰ، جنوری و فروری ۱۹۲۵ع

۲ ایضاً

۳ سید عابد علی عابد، اصول انشاء ادبیات، (طبع اول)، ص ۳۲۱

« نکات سخن » کے پانچ ابواب میں سے باب دوم (معائب سخن) اور باب سوم (محاسن سخن) تنقیدی نقطۂ نظر سے بہت اہم ہیں دوسرے ابواب کا تنقید سے نسبۃً کم تعلق ہے۔ پھر بھی حسرت کے تنقیدی نظریات پر ان سے کچھ نہ کچھ روشنی ضرور پڑتی ہے۔ اس لئے مناسب یہ ہوگا کہ ہر باب کا الگ الگ جائزہ لیا جائے اور حسرت کے تنقیدی نظریات پر روشنی ڈالی جائے۔

— ۲ —

باب اول یعنی « متروکات سخن » کو حسرت نے پانچ فصلوں میں تقسیم کیا ہے

فصل اول ، متروکات قدیم (یعنی وہ متروکات جو شعرائے عہد قدیم کے کلام میں پائے جاتے ہیں اور جو دور حاضر میں یک قلم متروک سمجھے جاتے ہیں)۔

فصل دوم ، متروکات معروف (یعنی وہ متروکات جو شعرائے عہد متوسط کے کلام میں پائے جاتے ہیں)۔

فصل سوم ، متروکات جائز (یعنی شعرائے دور آخر اور عہد حاضر کے وہ متروکات جن کے ترک کو راقم حروف جائز سمجھتا ہے)۔

فصل چہارم ، متروکات بےجا (یعنی شعرائے دور آخر اور عہد حاضر کے وہ متروکات جن کو ترک کرنے کی راقم حروف کے نزدیک کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

فصل پنجم ، قابل ترک (یعنی وہ الفاظ جو اس وقت تک عموماً مستعمل ہیں اور جائز سمجھے جاتے ہیں لیکن راقم حروف کے نزدیک جن کا ترک اولی ہے)[1]

حسرت کی یہ تقسیم علمی Scientific یا منطقی نہیں۔ فصل اول اور فصل دوم کی تقسیم تو بربنائے زمانہ ہے اور باقی تین فصلوں کی تقسیم مناسب یا نامناسب ہونے کی بنیاد پر ہے۔

متروکات کا تعلق لسانیات سے ہے ، تنقید سے نہیں۔ حسرت بھی اس بات سے واقف تھے۔ لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جب تک کوئی شاعر زبان کے ارتقا سے واقف نہیں ہوگا ، اس سے زبان کی غلطیاں سرزد ہوسکتی ہیں۔ اس لئے متروکات سے اتنی تفصیلی بحث کچھ نامناسب نہیں۔

---

۱ نکات سخن ، فہرست ابواب و مضامین ، ص ۴ (موشوعہ اردوئے معلی، جنوری و فروری ۱۹۲۵ع

متروکات کے باب میں حسرت نے اصولی بحث نہیں چھیڑی ہے کہ الفاظ متروک کیوں ہوجاتے ہیں ، اور کبھی کبھی بعض الفاظ ایک مدت تک متروک رہنے کے بعد پھر استعمال میں کیوں آنے لگتے ہیں . انھوں نے محض متروکات کی فہرست دینے اور ان کی مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کیا ہے .

قدما کے متروکات دینے میں حسرت کے پیش نظر ایک مقصد یہ بھی رہا ہے کہ زمانۂ حال کے شعرا کو متقدمین کا کلام دیکھنے اور سمجھنے میں دقت نہ ہو اور یہ فہرست ان کے لئے فرہنگ کا کام دے .[۱] لیکن انھوں نے بہت سے متروک الفاظ نظرانداز کردئے ہیں جس کی وجہ سے یہ مقصد بڑی حد تک فوت ہو جاتا ہے .

حسرت نے جہاں ایک طرف روشن خیالی کا ثبوت دیتے ہوئے « مت ، واں ، تلک » ، اور « سو ، بروزن فع » وغیرہ کے ترک کو نامناسب قرار دیا ہے وہیں انھوں نے بعض ایسے الفاظ کے ترک کرنے کا مشورہ بھی دیا ہے جن کا ترک کرنا کسی طرح مناسب نہیں معلوم ہوتا . جیسے یہ بمعنی اس قدر ، لگے بمعنی معلوم ہو ، دل جگر بغیر عطف ، مغاں اور خوباں . ترکیب فارسی کے ساتھ واحد کا استعمال بجائے جمع کے مثلاً : لکۂ ابر ، لخت دل ، جوہر حسن ، داغ غم الفت ، حرف آرزو وغیرہ . دیگر الفاظ کے سلسلے میں تو اختلاف رائے کی گنجائش ہے مگر ان ترکیبوں کے ترک کا مشورہ کسی طرح قابل قبول نہیں . یہ بات فارسی قواعد پر ضرورت سے زیادہ زور دینے کے سبب پیدا ہوئی ہے . یہ مشورہ دیتے وقت غالباً حسرت یہ بھول گئے کہ اردو فارسی سے الگ زبان ہے . بصورت جمع جیسے لکہ ہائے ابر لخت ہائے دل ، جوہرہائے حسن ، داغہائے غم الفت اور حرفہائے آرزو استعمال کی جائیں تو اردو کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہوسکیں گی .

علاوہ ازیں حسرت نے « متروکات سخن » میں بعض ایسے امور سے بھی بحث کی ہے جن کا تعلق لسانیات سے نہیں بلکہ تنقید سے ہے اور انھیں دوسرے ابواب کے تحت ہونا چاہئے تھا . مثلاً فصل پنجم میں الفاظ کریہہ و نیز متعلق بہ مرگ ، الفاظ رکیک و بے پردہ اور استخفاف انبیا و اولیا و ملائکہ کے بارے میں انھوں نے جوکچھ لکھا ہے اسے باب دوم یعنی معایب سخن میں ہونا چاہئے تھا .

---

۱ ایضاً ، باب اول ، متروکات سخن ، ص ۷

— ۳ —

باب دوم میں حسرت نے حسب ذیل ۳۵ عنوانات قائم کئے ہیں :

۱۔ عیب تنافر ۲۔ تکرار الفاظ قبیح ۳۔ الف بجائے ہائے مختفی ۴۔ تعقید لفظی ۵۔ حذف حروف مثل کا ، کو، تو، وہ ، پر وغیرہ ۶۔ ی کا دب کر نکلنا ۷۔ واو کا دب کر نکلنا ۸۔ الف کا دب کر نکلنا ۹۔ نقص روانی قسم اول عمومی ۱۰۔ نقص روانی قسم دوم خصوصی موسوم بہ ضعف خاتمہ ۱۱۔ تشدید یائے معروف بحالت اضافت ۱۲۔ قافیہ واو معروف و مجہول ۱۳ و ۱۴۔ ترکیب فارسی میں نون کا اعلان یا اس کے برعکس ۱۵۔ اضافت فارسی بالفاظ اردو ۱۶۔ ضلع جگت کی بے لطفی ۱۷۔ شتر گربہ ۱۸۔ الفاظ مخصوص بہ زنان و امرداں ۱۹۔ توالیء اضافات ۲۰۔ استعمال صفت بلا موصوف ۲۱۔ عطف درمیان الفاظ ہندی وفارسی ۲۲۔ ابہام واشکال مضمون ۲۳۔ استعمال الفاظ غیرشاعرانہ ۲۴۔ عیوب ایطا و دیگر عیوب قافیہ ۲۵۔ سقوط ع ، ی ، ک ۲۶۔ غلط العوام ۲۷۔ شکست ناروا ۲۸۔ حشو و زوائد ۲۹۔ ذومعنی مشتقات مصدر کا استعمال ۳۰۔ زیادتی زحاف یا رکن ۳۱۔ قافیہ ت وط وغیرہ ۳۲۔ کے سے کی جگہ کے ایسے ۳۳۔ «ہی» حرف حصر کا غلط استعمال ۳۴۔ اردو میں بعض الفاظ مثل سیہ و گنہ کا استعمال بلا اضافت ۳۵۔ بے پردگی و سخافت مضمون ۔[1]

حسرت نے عنوانات قائم کرنے میں طوالت سے کام لیا ہے. ی کا دب کر نکلنا، واو کا دب کر نکلنا اور الف کا دب کر نکلنا، کو تین عنوانات کے تحت رکھنے کے بجائے ان کے لئے ایک عنوان قائم کیا جا سکتا تھا. اسی طرح نقص روانی عمومی اور نقص روانی خصوصی کو بھی ایک ہی عنوان کے تحت رکھا جاسکتا تھا

حسرت نے عیب تنافر پر ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے . وہ عیب تنافر کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

«جب کسی شعر میں دو ایسے لفظ متصل آجاتے ہیں جن میں سے پہلے لفظ کا حرف آخر وہی ہوتاہے جو دوسرے لفظ کا حرف اول ہوتا ہے تو ان دونوں حرفوں کے ایک ساتھ تلفظ میں ایک قسم کا ثقل اور ناگواری پیدا ہوجاتی ہے. اسی کا نام عیب تنافر ہے» .[2]

---

۱ نکات سخن، فہرست ابواب مضامین ، ص ۵ - ۶ (موشوعہ اردوئے معلی، جنوری فروری ۱۹۲۵

۲ ایضاً ، باب دوم ، معائب سخن، ص ۱ (ایضاً ، جنوری ۱۹۲۷)

حسرت سے عیب تنافر کی تعریف میں تسامح ہوا ہے۔ محض متجانس حروف کے آجانے سے عیب تنافر نہیں پیدا ہوتا۔ نظم طباطبائی نے عیب تنافر کی زیادہ صحیح تعریف پیش کی ہے، لکھتے ہیں:

«کلام میں تنافر اس قدر ہے کہ کلمات اس طرح جمع ہوجائیں جن کا زبان سے نکلنا دشواری کے ساتھ ہو۔ اگرچہ سب کلمے فصیح ہوں۔ ... جیسے [پتلی بتی بت‌لی]۔ دو حروف ایک ہی جنس کے پےدرپے جمع ہوں یا نہ ہوں۔ ایک کلمہ کے آخر کا حرف اور دوسرے کلمہ کا اول حرف جب متجانس ہوں یا قریب المخرج ہوں تو کچھ ضرور نہیں کہ تنافر ہو۔ ہو بھی سکتا ہے نہیں بھی ہوتا ہے۔

اس قسم کے دو حرفوں میں اگر پہلا متحرک، دوسرا ساکن ہو ... اسے عیب تنافر نہیں کہیں گے ... اگر پہلا ساکن، دوسرا متحرک ہو تو اس میں بھی تنافر نہ ہوگا۔ ہاں اگر دونوں متحرک ہوں تو بعض صورتوں میں تنافر پیدا ہوجائے گا»[1]

عیب تنافر کی تعریف میں اسی غلطی کے سبب حسرت نے مثال کے طور پر ایسے اشعار بھی پیش کئے ہیں جن میں تنافر نہیں ہے۔ چند ایسے اشعار ملاحظہ کیجئے:

اسکی چشم سیہ ہے وہ جس نے کتنے جی مارے اک نگاہ کے بیچ
(میر)

قید ہستی سے رہائی معلوم اشک کو بے سروپا باندھتے ہیں
(غالب)

اس نازنیں کا خواب میں آنا محال ہے اے شوق بے ادب تجھے یہ کیا خیال ہے
(مجروح)

حسرت کا یہ قول صحیح نہیں کہ «ترکیب فارسی کے ساتھ ہائے مختفی کی جگہ الف کا استعمال یقیناً ناجائز ہے»[2] قاضی عبدالودود صاحب لکھتے ہیں:

! حسرت نے صراحت نہیں کی، لیکن صاف ظاہر ہے کہ ان کا یہ

---

۱ علی حیدر نظم طباطبائی، مراسلہ، ص ۱۷، موشوعہ اردوئے معلی، جون ۱۹۲۷ء

۲ نکات سخن، باب دوم معائب سخن، ص ۷، موشوعہ «اردوئے معلی» جنوری ۱۹۲۷ء

قول . . . اس خیال پر مبنی ہے کہ شعرائے ایران اس سے احتراز کرتے ہیں . »[1]

قاضی صاحب نے سعدی ، رومی ، حافظ ، جامی ، نظیری اور حزیں کے اشعار مثال کے طور پر پیش کرکے اس قول کو غلط ثابت کیا ہے . اسی لئے اردو کے تمام شعرا کے یہاں ایسے اشعار بکثرت ملتے ہیں جن عیں ترکیب فارسی کے ساتھ ہائے مختفی کی جگہ الف کا استعمال ہوتا ہے .

حذف حروف مثل کو، ہے ، تو، کا، وہ ، پر، کر، کے ، جو وغیرہ کے بارے میں حسرت لکھتے ہیں کہ

«ضرورت شعر کبھی کبھی شاعر کو بعض الفاظ کے حذف پر مجبور کر دیتی ہے . کہیں کہیں تو یہ بات بری نہیں معلوم ہوتی . مگر اکثر موقعوں پر مذاق صحیح اس عیب کو کسی طرح گوارہ نہیں کرسکتا .»[2]

لیکن مثال میں انھوں نے ایسے اشعار کثرت سے دئے ہیں جن میں ان الفاظ کا حذف ناگوار نہیں معلوم ہوتا . ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حسرت قواعد کی پابندی کے ضرورت سے زیادہ قائل ہیں . اگر شاعر قواعد کے بندھے ٹکے قاعدوں سے ایک حد تک آزاد نہ ہو تو وہ اچھے اشعار کی تخلیق نہیں کرسکتا . حسرت کی پیش کی ہوئی مثالوں میں سے چند ذیل میں درج ہیں جن میں ان الفاظ کا حذف کسی طرح ناگوار نہیں معلوم ہوتا :

[ہے]
گلوں کی جلوہ گری مہر و مہ کی بوالعجبی
تمام شعبدہ ہائے طلسم ہے سبھی
(اصغر)

[تو]
کیوں مجھ سے ہے یہ مفت کی تکرار کیا ہوا
اچھا جو میں نے کر ہی لیا پیار ، کیا ہوا
(حفیظ جون پوری)

[کا]
فنا کا ہوش آنا زندگی کا درد سر جانا
اجل کیا ہے خمار بادۂ ہستی اتر جانا
(چکبست)

---

۱ قاضی عبدالودود ، مقالہ نکات سخن موشوعۂ اردو ادب ، علی گڑھ ، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۵۱ع (حسرت نمبر) ، ص ۴۴

۲ نکات سخن ، باب دوم معائب سخن ، ص ۱۲ موشوعہ اردوئے معلی ، جون ۱۹۲۰

[وہ] گو سمجھتا نہیں پر حسن تلافی دیکھو
شکوۂ جور سے سر گرم جفا ہوتا ہے
(غالب)

[جو] تماشا عام ہوگا اور کیف بے خودی ارزاں
عجب کیا ہے قیامت صحبت مستانہ ہوجائے[۱]
(زکی دہلوی)

حروف علت یعنی الف ، واؤ اور ی کے گرنے یا دبنے کو حسرت عموماً معیوب سمجھتے ہیں. اس سلسلے میں انھوں نے نظم طباطبائی کے حوالے سے لکھا ہے کہ شیخ ناسخ نے آخر عمر میں اپنے شاگردوں کو یہ ہدایت کی تھی کہ کلمے کے آخر میں الف ، واؤ اور ی کو بے تکلف گرا دینا اچھا نہیں ، مگر اس پر کسی سے عمل نہ ہو سکا. نظم طباطبائی کا خیال ہے کہ شیخ کی ہدایت اس بنا پر تھی کہ فارسی میں کہیں ایسا نہیں دیکھا گیا.[۲] حسرت بھی اس کے مؤید ہیں. لیکن یہ خیال صحیح نہیں. فارسی شعرا کے کلام میں بھی حروف علت کے گرنے یا دبنے کی مثالیں ملتی ہیں.[۳] اردو کے حروف مثلاً میں ، سے ، کو ، کے ، کا ، تو ، جو وغیرہ ، افعال ناقصہ مثلاً ہے ، تھا اور بعض اسمائے ضمائر مثلاً مری ، تری ، مجھے ، تجھے ، اسے وغیرہ میں حروف علت کے گرنے یا دبنے کو تو حسرت جائز قرار دیتے ہیں ؛ مگر دوسرے الفاظ اور خصوصاً افعال کے سلسلے میں اسے معیوب سمجھتے ہیں. فارسی الفاظ میں حروف علت کے سقوط کو تو خاص طور سے معائب میں شمار کرتے ہیں. یہاں فارسی اور ہندی الفاظ میں تفریق کسی طرح درست نہیں. اس باب میں رشید حسن خاں کا یہ خیال زیادہ مناسب ہے کہ

« لفظ کے آخر سے حروف علت کا دبنا قابل قبول بھی ہوسکتا ہے ، اور ناقابل قبول بھی. اس کا انحصار محل استعمال پر ہے. نہ اس میں ہندی و غیر ہندی الفاظ کی تفریق کی جاسکتی ہے نہ کوئی قاعدۂ کلیہ بنایا جاسکتا ہے کہ یہاں غلط ہے ، وہاں صحیح. اصل معیار یہ

---

۱ نکات سخن ، باب دوم معائب سخن ، ص ۱۴ تا ۱۶ موشوعہ (اردوے معلی) جون ۱۹۲۷ع

۲ ایضاً ، ص ۱۷ ، موشوعہ اردوے معلی ، جولائی ، اگست ستمبر ۱۹۲۷ع

۳ قاضی عبدالودود ، مقالہ (نکات سخن) ، موشوعہ (اردو ادب) ، علی گڑھ ، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۵۱ع (حسرت نمبر) ، ص ۴۶ ، ۴۷ قاضی صاحب نے فارسی شعرا کے کلام سے حروف علت کے گرنے اور دبنے کی بہت سی مثالیں پیش کی ہیں.

ہے کہ جہاں بھی حروف علت کے دبنے سے مصرع کی روانی پر اثر پڑے، وہاں اس کا دبنا غلط ہے، خواہ وہ لفظ کسی زبان کا ہو. جہاں یہ صورت نہ ہو وہاں مطلق عیب نہیں.»[1]

حسرت نے لکھا ہے کہ

«اضافت کی حالت میں یائے معروف کی تشدید مسلمہ طور پر معیوب سمجھی جاتی ہے»[2] حسرت کا یہ خیال بھی صحیح نہیں. غالباً اس سلسلے میں وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ان کا قول شعرائے ایران کے مسلک کے مطابق ہے قاضی عبدالودود صاحب نے رومی، حافظ، جامی، نظیری اور عرفی کے کلام سے مثالیں پیش کرکے اس قول کو بھی غلط ثابت کیا ہے.[3] اسی وجہ سے «ہر عہد کی شاعری میں اس کی مثالیں پائی جاتی ہیں»[4]

حسرت کے نزدیک «اردو الفاظ کے ساتھ فارسی اضافت بھی سراسر ناجائز ہے.[5]» تمام قدامت پسند ناقد اس خیال کے حامی نظر آتے ہیں. چنانچہ قاضی عبدالودود صاحب کو بھی اس سے اصولی اختلاف نہیں. انھوں نے محض چند ترکیبوں کے سلسلے میں حسرت سے اختلاف کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ جن الفاظ کو حسرت ہندوستانی الاصل سمجھتے ہیں وہ فارسی یا ترکی ہیں یہاں بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اردو میں اضافت کا استعمال جائز ہے تو پھر اس کے لئے فارسی، ترکی یا عربی الفاظ کی قید کیوں؟ جب ایرانی اساتذہ ترکی اور عربی الفاظ کے ساتھ اضافت کے استعمال میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے تو اردو کے شاعروں اور ادیبوں پر یہ بیجا پابندی کیوں عاید کی جائے کہ وہ ہندی الفاظ کے ساتھ اضافت نہ استعمال کریں. میرے خیال میں ہندی الفاظ کے ساتھ اضافت کے استعمال میں صوتی آہنگ کو پیش نظر رکھنا چاہیے. اگر کانوں کو ناگوار نہ معلوم ہو تو ہندی الفاظ کے ساتھ اضافت کے استعمال میں کوئی حرج نہیں. یہی بات واو عطف

---

۱ مقالہ (معائب شاعری)، موشوعہ (آج کل)، دہلی، فروری ۱۹۶۵ع، ص ۲۱

۲ نکات سخن، باب دوم معائب سخن، ص ۲۵ موشوعہ (اردو معلی)، جنوری تا مارچ ۱۹۲۹ع

۳ مقالہ (نکات سخن) موشوعہ (اردو ادب)، علی گڑھ، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۵۱ع (حسرت نمبر)، ص ۴۵

۴ نکات سخن، باب دوم معائب سخن، ص ۲۵، موشوعہ (اردوئے معلی)، جنوری تا مارچ ۱۹۲۹ع

۵ نکات سخن، باب دوم معائب سخن، ص ۲۵ موشوعہ اردوئے معلی، جنوری تا مارچ ۱۹۲۹ع

کے استعمال پر بھی صادق آتی ہے قدیم دور کے شعرا نے ان دونوں قاعدوں کی اکثر خلاف ورزی کی ہے. اور جدید دور کے شعرا نے انہیں یکسر نظرانداز کر دیا ہے اور اس میں وہ حق بجانب ہیں.

معائب سخن کے باب میں حسرت سے اور بھی لغزشیں ہوئی ہیں. انہوں نے حشو کو محض قبیح تک محدود کر دیا ہے اور ملیح و متوسط کو نظر انداز کر دیا ہے. حسرت نے معائب کے سلسلے میں ایک نئی اصطلاح شکست ناروا وضع کی ہے. قاضی عبدالودود صاحب کے الفاظ میں "عروضی اس سے ناواقف ہیں اور اساتذۂ ہند و ایران کے نزدیک یہ سقم نہیں."[1] ایطاے جلی اور ایطاے خفی کے سلسلے میں حسرت نے اردو اور فارسی کے فرق کو پیش نظر نہیں رکھا ہے.

مذکورہ بالا تسامحات سے قطع نظر، حسرت نے ایسے معائب کی بھی نشاندہی کی ہے جن سے کلام کا حسن زائل ہوجاتا ہے. جیسے تعقید لفظی، نقص روانی، شتر گربہ، استعمال الفاظ غیر شاعرانہ، توالی اضافت، عیوب قافیہ، ضلع جگت، ابہام و اشکال مضمون، بے پردگی و سخافت مضمون وغیرہ. یہ ضرور ہے کہ حسرت کی نظر زبان و بیان کے عیوب پر زیادہ پڑتی ہے، موضوع و مواد کے عیوب پر کم. انہوں نے معائب سخن کے باب میں ۳۵ عنوانات قائم کئے ہیں. ان میں سے صرف دو عنوانات یعنی ابہام و اشکال مضمون اور بےپردگی و سخافت مضمون کا تعلق موضوع و مواد سے ہے. باقی ۳۳ عنوانات زبان و بیان سے متعلق ہیں.

۴

حسرت نے باب سوم یعنی محاسن سخن میں حسب ذیل ۱۷ عنوانات قایم کئے ہیں:

۱۔ تکرار الفاظ حسین، ۲۔ صدق محاورہ، صفائی بیان، سادگی زبان، ۳۔ ترجمۂ محاورۂ فارسی، ۴۔ شوخیء کلام ورندیء مضمون، ۵۔ تازگیء بیان و ندرت مضمون، ۶۔ خوبیء ترکیب، حسن استعارہ و لطف تشبیہ، ۷۔ حسن استعمال الفاظ جمع مخصوص بہ خاندان مومن، ۸۔ واقعہ گذاری، جذبہ نگاری و معاملہ بندی، ۹۔ متانت و بلندیء جذبات، مسائل تصوف، ۱۰۔ مطابقت الفاظ و مضمون، ۱۱۔ نقل قول کی تازگی، ۱۲۔ کنایہ، ۱۳۔ سوز و گداز، ۱۴۔ الفاظ کا الٹ پھیر اور مصرعوں

---

۱ مقالہ (نکات سخن، موشوعہ (اردو ادب، علی گڑھ، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۵۱ء حسرت نمبر) ص ۴۹

کا تقابل، ۱۵۔ استعمال جملہ انشائیہ بجائے جملہ خبریہ ۱۶۔ تعدد الفاظ و فقرات موزوں، ۱۷۔ سہل ممتنع[۱]

تنقیدی نقطۂ نظر سے یہ بات «نکات سخن» کی جان ہے۔ اسی باب سے حسرت کے تنقیدی نظریات کا واضح طور پر پتہ چلتا ہے۔ «معاملہ بندی، واقعہ گزاری و جذبہ نگاری» کے عنوان کے تحت وہ لکھتے ہیں:

«ارباب نظر نے شاعری اور مصوری کو جو ایک ہی قبیل سے قرار دیا ہے اس کی بنیاد یہ ہے کہ جس طرح کامیاب مصور کے لئے لازم ہے کہ جس چیز کی نقل اتاری جائے صحیح اتاری جائے، اسی طرح سے حقیقی شاعری کے لئے بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ واقعات محبت کے بیان میں تصنع سے کام نہ لیا گیا ہو اور جذبات کی صحیح ترجمانی کی گئی ہو، عام اس سے کہ وہ جذبات علوی ہوں یا سفلی۔ اگر جذبات عالی ہوں گے تو شاعری جذبہ نگاری اور واقعہ گزاری کی شکل اختیار کرے گی ورنہ معاملہ بندی ہو جائے گی۔ اور ہمارے نزدیک یہی تینوں چیزیں شاعری کا بہترین نمونہ ہیں۔»[۲]

اس اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حسرت کے نزدیک شاعری جذبات کی صحیح ترجمانی کا نام ہے، چاہے وہ جذبات علوی ہوں یا سفلی وہ شاعری کی بنیاد صداقت کو قرار دیتے ہیں۔ اسی لئے وہ معاملہ بندی کے اشعار کو بھی اچھی شاعری کا نمونہ سمجھتے ہیں، بشرطیکہ ان میں جذبات کی صحیح عکاسی کی گئی ہو۔ حسرت شاعری میں جس صداقت کے قائل ہیں وہ جذباتی صداقت ہے، اخلاقی صداقت نہیں۔ ممتاز حسین کی یہ رائے بڑی حد تک صحیح ہے کہ

«حسرت بہ نسبت مولانا حالی کے نیچرل شاعری کے مفہوم کو بہتر طریقے سے سمجھتے تھے۔ حالی نیچرل پر اخلاقیات کی قدغن لگاتے ہیں، حسرت اسے رد کرتے ہیں۔ لیکن دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ نیچرل شاعری وہ ہے جو کہ معناً اور لفظاً دونوں اعتبار سے نیچرل ہو۔»

---

۱ نکات سخن، فہرست ابواب و مضامین، ص ۶ [موشوعہ (اردوئے معلی)، جنوری فروری ۱۹۲۵ع]

۲ ایضاً، باب سوم (محاسن سخن)، ص ۴۴ [" " فروری مارچ ۱۹۳۰ع]

۳ ذوق ادب اور شعور، مقالہ (حسرت کی غزل گوئی)، ص ۲۹۵، ۲۹۶

حسرت نے اس خیال کا اظہار دوسرے موقعوں پر بھی کیا ہے۔ سنہ ۱۹۴۵ء میں حیدرآباد میں ترقی پسند مصنفین کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس کانفرنس میں ڈاکٹر عبدالعلیم نے فحش نگاری کے خلاف ایک قرارداد پیش کی، جسے تمام حاضرین کی تائید حاصل تھی۔ بقول سجاد ظہیر اس قرارداد کے الفاظ یہ تھے:

«یہ کانفرنس پھر اس بات کو صاف کر دینا چاہتی ہے کہ ترقی پسند ادیب ادب میں فحش نگاری کے خلاف ہیں اور اسے برا سمجھتے ہیں۔۔۔۔»[۱]

حسرت نے اس قرارداد میں یہ ترمیم پیش کی کہ اس جملے کے آگے یہ بڑھا دیا جائے: «لیکن وہ لطیف ہوسناکی کے اظہار میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔»[۲] اور اس ترمیم کی موافقت میں انھوں نے جو تقریر کی اس میں اسی منطق کو پیش کیا جس کا اوپر ذکر ہوچکا ہے۔ انھوں نے ایک غیر مطبوعہ مقالے میں بھی جس کے اقتباسات عبدالشکور صاحب نے اپنی تالیف «حسرت موہانی» میں دئے ہیں، اس خیال کا اعادہ کیا ہے۔»[۳]

محولہ بالا اقتباس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حسرت کے نزدیک شاعری میں سب سے بڑا عیب تصنع ہے۔ ان کے خیال میں کلام میں سوقیانہ پن اور ابتذال جذبات ہوس کے اظہار سے نہیں بلکہ طریقِ بیان (Treatment) میں تصنع سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی نقطۂ نظر کی بنیاد پر انھوں نے مکاتیب امیر مینائی (مرتبہ احسن اللہ خان ثاقب) پر تبصرہ کرتے ہوئے مرتب کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ داغ کی شاعری بہ اعتبار موضوع سوقیانہ اور مبتذل ہے ان کی رائے میں داغ کے کلام میں سوقیانہ پن اور ابتذال طریق بیان میں تصنع کے سبب ہے نہ کہ جذبات ہوس کے اظہار کے باعث۔ حسرت کے الفاظ یہ ہیں:

«جذبات رومانی تو درکنار ہم یہ کہتے ہیں کہ داغ نے خواہشاتِ نفسانی کی بھی صحیح تصویر بہت کم کھینچی ہے۔ جرأت و انشا کے یہاں اس قسم کے خیالات میں چونکہ صداقت کا رنگ موجود

---

۱ روشنائی، ص ۴۵۶
۲ سجاد ظہیر، روشنائی، ص ۴۵۶
۳ ص ۴۴ تا ۴۸

ہوتا ہے اس لئے ان کی غیر متین اور غیر مہذب شاعری بھی حسن سے خالی نہیں ، کیونکہ حسن و صداقت کا لازم و ملزوم ہونا مسلم ہے . برخلاف اس کے داغ کی معاملہ بندیوں اور عیاشانہ چوچلوں کو تصنع کا عیب اس قدر مبتذل اور بدنما کر دیتا ہے کہ مذاق صحیح ان سے کسی طرح لذت یاب نہیں ہو سکتا . »[1]

جہاں تک زبان اور اسلوب کا سوال ہے ، حسرت صدقِ محاورہ ، صفائی زبان اور سادگی بیان پر زور دیتے ہیں . بقول سید عابد علی عابد « شعری تخلیقات میں روز مرہ کی اہمیت نثر سے بھی زیادہ ہوتی ہے کہ واردات ، کیفیات اور جذبات کے اظہار میں شاعر قریب ترین راستوں سے پڑھنے والوں کے ذہن تک پہنچتا ہے . »[2] اس لئے حسرت تراکیب کے استعمال کی زیادتی اور دشوار گوئی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے . اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

« دور حاضر میں بعض شعرا کا رجحان زیادہ تر اس جانب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے کلام کی خوبی کا دار و مدار استعمال تراکیب فارسی اور دشوار گوئی پر رکھیں جس کو وہ پیروی غالب کے مرعوب کن نام سے موسوم کرتے ہیں . حالانکہ حقیقت حال یہ ہے کہ غالب کے بھی بہترین اشعار وہی ہیں جن کی برتری صدق محاورہ یا صفائی زبان اور سادگی بیان کی مرہون منت ہے . »[3]

لیکن حسرت سادگیِ بیان کے ساتھ ساتھ جدت بیان کی اہمیت کے بھی قائل ہیں جدت بیان کو انہوں نے تازگی بیان کے نام سے موسوم کیا ہے[4] سادگی میں بھی ایک حسن ہے مگر جدت بیان کی وجہ سے شعر کا حسن دو بالا ہوجاتا ہے . حسرت نے صرف جدت بیان ہی کو نہیں بلکہ ندرت مضمون کو بھی شعر کے محاسن میں شمار کیا ہے[5] اس سے حسرت کی تنقیدی بصیرت کا واضح ثبوت ملتا ہے .

حسرت نے اپنے ذوقِ سلیم کی بنا پر یہ نکتہ دریافت کر لیا تھا کہ اچھی تشبیہیں ، اچھے استعارے اور نئی ترکیبیں ساتھ ساتھ پائی جاتی ہیں . اسی لئے وہ رقمطراز ہیں :

---

۱ مقالہ مکتوبات امیرمینائی ، اردوئے معلی ، اپریل ۱۹۱۱ع ، ص ۱۶

۲ اصول انتقاد ادبیات (طبع اول) ، ص ۲۱۷

۳ نکات سخن ، باب سوم محاسن سخن ، ص ۲۱ [موشوعہ اردوئے معلی ، دسمبر ۱۹۲۹ع]

۴و۵ نکات سخن ، باب سوم ، محاسن سخن ، ص۲۱ [موشوعہ اردو معلی ، دسمبر ۱۹۲۹ع]

«تازگیِ کلام و ندرت مضمون کے مانند، حسن ترکیب، خوبی استعارہ اور لطف تشبیہہ کو پیش گاہ سخن میں بہت بڑا درجہ حاصل ہے اشعار میں یہ تینوں خوبیاں اس قدر متصل اور اکثر اس طرح دست و گریباں پائی جاتی ہیں کہ ان سب کی مثالوں کو علیحدہ علیحدہ پیش کرنے کے بجائے ایک ہی جگہ درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے»[1]

لیکن حسرت اس کی توجیہ کرنے سے قاصر رہے۔ اصلاً تشبیہہ، استعارہ اور تراکیب کا تعلق ایجاز سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تینوں خوبیاں ساتھ پائی جاتی ہیں۔

حسرت کی نظر شعر میں ڈرامائی عنصر پر بھی پڑی ہے جسے انہوں نے «نقل قول کی تازگی» کے نام سے پیش کیا ہے[2] یہ ضرور ہے کہ حسرت نے ڈرامائی عنصر کو محض مکالمہ تک محدود کردیا ہے۔ ڈرامے کا بنیادی عنصر دراصل تصادم اور کشمکش ہے۔ اردو میں ایسے اشعار بھی کثرت سے ملتے ہیں جن میں ڈرامے کا یہ بنیادی عنصر پایا جاتا ہے۔ مگر حسرت کی نگاہ وہاں تک نہیں پہنچ سکی۔

جدید تنقید میں مطابقت الفاظ و معانی Concordance of Substance and expression پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ قدیم تنقید میں اس کو فصاحت کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا[3] حسرت نے اسے مطابقت الفاظ و مضمون کہا ہے اور اس کی اہمیت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

«مضمون شعر اور الفاظ شعر میں مطابقت کا قائم کرنا منجملہ کمالات شاعری بہت کچھ اہم سمجھا جاتا ہے اور عموماً بہت بڑی قوت اور مشق سخن کا نتیجہ ہوا کرتا ہے»[4]

حسرت نے سہل ممتنع کی صحیح تعریف کی ہے کہ «سہل ممتنع سادگی و حسن بیان کی اس صنف کا نام ہے جس کو دیکھ کر ہر شخص بظاہر یہ سمجھے

---

۱ ایضاً، ص ۴۵ [موشوعہ اردوئے معلی، جنوری ۱۹۳۰ء]
۲ ایضاً، ص ۵۲، ۵۳ [" " اپریل ۱۹۳۰ء]
۳ سید عابد علی عابد، اصول انتقاد ادبیات (طبع اول) ص ۲۶۹
۴ نکات سخن، باب سوم محاسن سخن، ص ۵۱ (موشوعہ اردوئے معلی، اپریل ۱۹۳۰)

کہ یہ بات میرے دل میں بھی تھی اور ایسا کہنا ہر شاعر کے لئے آسان ہے ، مگر جب خود کوشش کرکے ویسا لکھنا چاہیے تو نہ لکھ سکے[1] حسرت نے سہل ممتنع کو محض سادگی تک محدود نہیں کیا ہے ، بلکہ اس کے ساتھ حسن بیان کی شرط بھی لگائی ہے جس کے تحت تشبیہ ، استعارہ ، کنایہ ، نئی تراکیب اور جدت بیان ، سبھی کچھ آجاتا ہے ۔ اس کے علاوہ مضمون ایسا ہونا چاہئے کہ شعر سنتے ہی سامع کا ذہن بغیر کسی دشواری کے ادھر منتقل ہوجائے ۔ حسرت کے نزدیک سہل ممتنع شاعری کی معراج ہے ۔

حسرت نے محاسن سخن کے باب میں مثال کے طور پر زیادہ تر اچھے اشعار پیش کئے ہیں ۔ لیکن کہیں کہیں ایسے اشعار ضرور ملتے ہیں ، گو ان کی تعداد بہت کم ہے ، جنھیں معائب سخن کے باب میں دیا جانا چاہئے تھا ۔ ان میں سے چند اشعار یہ ہیں :

(۱) وہ خط اس روے کتابی پہ بہم پہنچا ہے
سینکڑوں مشق سخن کے ہیں مضامیں جس میں (سودا)

---

(۲) اودے پاجامے پر اس کے غیرایں جب چٹکیاں
کیوں نہ اس دل پر لگے غم کی کٹاری ان دنوں (صفت مرادآبادی)

---

(۳) گر وہ ہاتھ آئے تو زانو پہ بٹھائے رکھئے
لب سے لب سینہ سے سینہ کو ملائے رکھئے

(۴) بیٹھیں کیا دور کہ چاہے ہے یہی کثرت شوق
آپ کے زانو سے زانو کو بھڑائے رکھئے (جرأت)

(۵) استخارہ جو سحر وصل پہ واجب آیا
مسکرا کر وہی کنٹھار مرے منھ پر مارا (سحر)

شعر نمبر (۱) میں ناگوار رعایت لفظی ہے اور الفاظ مخصوص بہ امرداں بھی موجود ہیں ، جو خود حسرت کے نزدیک عیب ہے ۔[2] شعر نمبر (۲) تا (۵) میں بے پردگی و سخافت مضمون کا عیب پایا جاتا ہے ۔[3]

---

۱ نکات سخن ، باب سوم ، محاسن سخن ، ص ۶۱ (موشوعہ اردوے معلی ، مئی ۱۹۲۰)
۲ ایضاً ، باب دوم ، معائب سخن ، ص ۳۴ (ایضاً جولائی ۱۹۲۹)
۳ ایضاً ص ۵۶ (ایضاً اگست ۱۹۲۹)

حسرت نے «ترجمۂ محاورۂ فارسی» کو معلوم نہیں کس بنا پر محاسن سخن میں شمار کیا ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب کا یہ کہنا بجا ہے کہ انہوں نے «اس فصل میں جو الفاظ دئے ہیں وہ بیشتر متروک ہیں اور ان کا اندراج باب متروکات میں ہونا چاہئے تھا۔»[1]

— ۵ —

«نکات سخن» کا چوتھا باب «نوادر سخن» بہت مختصر ہے اور کتابی صورت میں صرف بارہ صفحات پر مشتمل ہے۔ حسرت نے اس باب کے آغاز میں لکھا ہے کہ «واضح ہو کہ نوادر سخن کے سلسلے میں ہم نے زیادہ تر انہیں چیزوں کو لیا ہے جن میں اردو زبان کے مقررہ قواعد کے علاوہ یا خلاف کوئی غیرمعمولی جدت یا ندرت نظر آئی ہے۔»[2] اس میں شک نہیں کہ اس میں کئی باتیں ایسی ہیں جن پر حسرت سے پہلے شاید ہی کسی کی نظر پڑی ہو۔

اردو قواعد کا یہ عام کلیہ ہے کہ فعل لازم کے ساتھ علامت فاعلی «نے» کا استعمال نہیں ہوتا۔ مگر حسرت نے متقدمین، متوسطین اور متأخرین، سب کے کلام سے ایسی مثالیں پیش کی ہیں جن میں بعض الفاظ مثلاً «ہنسنا» اور «رونا» کے ساتھ علامت فاعلی «نے» کا استعمال ملتا ہے اور یہ بہر حال جائز سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً:-

کسی نے بات کہی اور رو دیا اس نے   یہ حال اب دل زار و نزار کا پہنچا
(میر حسن)

لطف اس درجہ اٹھایا ہے گرفتاری میں   رو دیا ہم نے جو بندہ کوئی آزاد ہوا
(اسیر)

دیکھ کر چشم غضب کو اس کی ہم نے رو دیا   چاہئے پانی ملا لینا شراب تیز میں
(شیفتہ)

میں نے جو آہ سرد بھری اس نے ہنس دیا   گل کی کلی نسیم سحر سے چٹک گئی
(وزیر)

---

۱ مقالہ «نکات سخن» موشوعہ اردو ادب، علی گڑھ، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۵۱، (حسرت نمبر)، ص ۵۵

۲ طبع اول، ۱۹۳۵ ص ۲

سوال وصل پر ان سے نیا فقرہ چلا میں نے مسافر ہوں نظر کرنی پڑے گی میری غربت پر[1]

(بیخود دہلوی)

حسرت نے بعض ایسے الفاظ کے استعمال کو نوادر سخن کے تحت پیش کیا ہے جنھیں جائز نہیں قرار دیا جاسکتا، گو اس کی مثالیں بعض اساتذہ کے یہاں ملتی ہیں. جیسے «وہ خبر نہ ہوا.» بجائے اسے خبر نہ ہوئی ».[2] اس کی مثال میں حسرت نے نادر شاگردِ ناسخ، داغ اور خود اپنا ایک شعر پیش کیا ہے. نادر کا شعر یہ ہے:-

پہنچے تا آسماں مرے نالے اپنے کوٹھے پہ وہ خبر نہ ہوا

اس باب کا تعلق در اصل قواعد اور لسانیات سے ہے مگر حسرت چونکہ قدیم (مشرقی) طرز تنقید کے پیرو ہیں، اس لئے ان کی نظر الفاظ کی صحت اور ان کے حسن و قبح پر زیادہ رہتی ہے. اسی لئے انھوں نے اس بات کو «نکات سخن» میں شامل کیا ہے.

باب پنجم یعنی «اصلاح سخن» کے بارے میں حسرت نے «نکات سخن» کے دیباچے میں لکھا ہے کہ:

«اصلاح سخن» کا باب نوخیز شاعروں کے لئے خصوصیت کے ساتھ قابل مطالعہ ہے. اگر وہ اس کتاب کو بغور پڑھ کر اپنے کلام کی اصلاح بھی اس باب میں بیان کئے ہوئے طرز پر خود کر لیا کریں تو ان شاء اللہ ان کو کسی استاد کی ضرورت نہ ہوگی.»[3]

چونکہ یہ باب شائع نہیں ہوا اور نہ ہی اس کا مسودہ دستیاب ہے، اس لئے اس کے بارے میں اظہار رائے ممکن نہیں.

الغرض «نکات سخن» حسرت کی ایک اہم تالیف ہے اور بقول سید عابد علی عابد اردو ادب کا کوئی نقاد اس کے مطالعے سے بےنیاز نہیں ہوسکتا؛[4] کیونکہ اس سے نہ صرف حسرت کے تنقیدی نظریات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، بلکہ یہ قدیم (مشرقی) طرز تنقید کی بھرپور نمایندگی بھی کرتی ہے.

---

۱ نوادر سخن، ص ۳۰۲

۲ ایضاً، ص ۱۰

۳ دیباچہ، ص ۳ (موشوعہ اردوئے معلی، جنوری و فروری ۱۹۲۵ء)

۴ اصول انتقاد ادبیات، طبع اول، ص ۴۲۴

* شاکرہ بیگم

اردو میں لائبریری سائنس سے متعلق سرمایہ

لائبریری سائنس کی مندرجۂ ذیل شاخیں ہیں :

تنظیم و اہتمام کتب خانہ (Organisation and Administration) :

اس میں کتب خانوں کی تاریخ، محل وقوع اور اس کا انتخاب، تعمیر و نگرانی کتابوں کا انتخاب، ان کی خریداری، داد دستد تحفظ (عملہ) اس کی صلاحیتیں، فرائض و حقوق، کتب خانوں کے اقسام، ان کے قوانین و ضوابط، حکومت کے نافذ کردہ قوانین و ضوابط وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے۔

کتابیات و فہرست سازی :

کتابیات یا Bibliography کا لفظ انگریزی میں کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ کتاب کی ظاہری ساخت اور معنوی اجزا، دونوں کے لئے ببلیوگرافی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ کسی زبان میں کسی مخصوص موضوع پر یا کسی مختص مقام پر شائع ہونے والی کتابوں کی فہرست اور ان کی فہرست سازی کے طریقے، دونوں کے لئے لفظ ببلیوگرافی ہی استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں ہر قسم کی فہرستوں کے لئے صرف فہرست کا لفظ استعمال ہوتا ہے جبکہ انگریزی میں کسی کتب خانہ کی فہرست کو Catalogue اور کسی مخصوص موضوع کی کتابوں کی فہرست کو ببلیوگرافی کہا جاتا ہے

تحولات Reference Service :

اس میں حوالے کی کتابوں اور کتاب اور ناظر کے درمیان ربط قائم کرنے کے طریقۂ کار سے بحث ہوتی ہے کیونکہ کتابیں بے جان ہیں اور ناظر انجان۔

انتخاب کتب :

کسی بھی کتب خانہ کے لئے کتابوں کی خریدی کے لئے کتابوں کا انتخاب

* امۃ الواحد شاکرہ بیگم، ام. اے. (اردو)، ام. اے. (ہندی)؛ ی. لب؛ اسسٹنٹ لائبریرین، عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری، حیدرآباد؛ سکریٹری، آندھرا پردیش لائبریریز ایسوسی ایشن، حیدرآباد۔

مختلف ذرائع سے کیا جاتا ہے۔ ان کتابی ذرائع کی ترتیب و تیاری بھی لابریری سائنس کا ایک اہم موضوع ہے۔

تبویب:

فہرست سازی کے ساتھ کتابوں کی کتب خانوں میں ترتیب و تنظیم اپنی ایک علاحدہ حیثیت رکھتی ہے۔ اور اسے کتاب داری میں سب سے اہم مقام حاصل ہے۔ ایک عرصہ تک صرف فہرست سازی اور تبویب کو ہی لائبریری سائنس سمجھا جاتا رہا ہے۔

اسنادیات (Documentation):

لائبریری سائنس کی جدید شاخ ڈاکومنیٹشن یا اسنادیات ہے۔ اس کو اب اس قدر ترقی ہورہی ہے کہ اسے لائبریری سائنس سے الگ سائنس کا درجہ حاصل ہوچکا ہے۔ اس میں کتابوں سے قطع نظر مختصر مواد یعنی رسائل و اخبارات کو موضوع بحث بنایا جاتا ہے۔

اب ہر ایک شاخ کو لیکر دیکھا جائے گا کہ اردو میں اس پر کیا کچھ لکھا گیا ہے۔

ببلیوگرافی یا فہرست سازی لائبریری سائنس کی قدیم ترین شکل ہے۔ اس کی عملی شکل یہ ہے کہ مخصوص موضوعات یا مختص مقام سے یا کسی زبان میں شائع ہونے والی تمام کتابوں کی فہرست مرتب کی جاتی ہے۔ اردو میں بھی اس کی بہتات ہے۔ لیکن اب بھی کئی کتب خانے ایسے ہیں جن میں بڑی تعداد میں کمیاب و نادر کتابیں موجود ہیں مگر وسائل کی کمی کی وجہ ان کی فہرستیں ترتیب نہیں دی گئی ہیں، اور کئی موضوع ایسے ہیں جن کی ببلیوگرافی تیار کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں میری معلومات کی حد تک اردو کی کتابوں کی پہلی مطبوعہ فہرست اسپرنگر کی ہے جو اسی نے لارڈ ہارڈنگ کے حکم سے نوابین اودھ کے کتب خانوں کی کتابوں کی فہرست تیار کی تھی۔ اس فہرست کی پہلی جلد فارسی اور اردو نظم سے متعلق کلکتہ سے ۱۸۵۴ع میں شائع ہوئی تھی۔

دوسرا نام سر سید کا آتا ہے جنھوں نے اردو کو علمی اور فنی زبان بنانے کی بھرپور کوشش کی تھی اور اردو کی نیشنل ببلیوگرافی ترتیب دینے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔ چنانچہ ۱۸٦۸ع میں علی گڑھ سائنٹفک سوسایٹی کی طرف سے جو

ایڈریس سر ولیم میور لفٹننٹ گورنر صوبہ شمال مغربی (یو پی) کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا ۔ اسی میں یہ بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ منجملہ ان کتابوں کے جو اردو زبان میں سوسائٹی تیار کر رہی ہے دو کتابیں سید احمد خاں ، آنریری سکریٹری تیار کر رہے ہیں ، ایک اردو لٹریچر کی تاریخ اور دوسری ایسی فہرست جس میں تمام کتابوں کا جو ابتدا سے آج تک چھپی ہیں نام آسکے ۔ مصنف کا حال ، تصنیف کا زمانہ ، طرز بیان اور مختلف مقامات سے اس کی عبارت کے چند نمونے اور بعض مضامین کا خلاصہ ہوگا ۔ اس فہرست کے لکھنے کی نوبت نہیں آئی ۔

۱۹۰۲ع میں انجمن ترقی اردو ، ہند ، کی بنیاد پڑی تو اس کے ابتدائی پروگرام میں اس قسم کی ایسی فہرست کی ترتیب بھی تھی ۔ بقول مولوی عبدالحق پروفیسر سجاد مرزا بیگ نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور بیس سال بعد ۱۹۲۳ع میں اس کی تکمیل ہوئی اور الفہرست کے نام سے حیدرآباد سے چھپی ۔ یہ بے حد ناقص ہے ۔ خود سجاد مرزا صاحب کو اس نقص کا احساس تھا ۔ اس کی وجہ وہ وسائل اور وقت کی کمی کو ٹھہراتے ہیں وہ یہ بھی لکھتے ہیں ۔ کہ اس کی تحریک آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرس میں شبلی نے کی تھی ۔

آگے چل کر مولوی عبدالحق کے زیر نگرانی انجمن ترقی اردو نے الفہرست سے زیادہ مکمل اور مبسوط ببلیوگرافی کی تیاری شروع کی ۔ ۱۹۶۱ع میں پاکستان کی انجمن ترقی اردو کی جانب سے قاموس الکتب کے نام سے اس ببلیوگرافی کا پہلا حصہ شائع ہوا جو صرف مذہبیات پر مشتمل ہے ۔ دوسرے حصوں کی اشاعت کا مضمون نگار کو کوئی علم نہیں ہے ۔

آزادی کے بعد کلکتہ کی امپریل لائبریری کو نیشنل لائبریری کا درجہ مل گیا Central ref. library delivery of books & news papers ایکٹ کے تحت ملک بھر میں شائع ہونے والی مطبوعات کا ایک ایک نسخہ اس کتب خانہ کو بھیجا جاتا ہے اور نیشنل ببلیوگرافی کے نام سے ہر سہ ماہی میں ان کتابوں کی فہرست مرتب اور شائع کی جاتی ہے ۔ اس میں انگریزی اور دستور کی چودہ زبانوں میں شائع ہونے والی سرکاری اور غیر سرکاری مطبوعات کا اندراج ہوتا ہے ۔ یہ رومن رسم الخط میں

---

۱ حیات جاوید ، دوسرا حصہ ، ص ۳۸

۲ قاموس الکتب ، مقدمہ از مولوی عبدالحق ، ص ی

شائع کی جاتی ہے۔ اس خیال سے کہ اس کی قیمت کے پیش نظر چھوٹے کتب خانوں، اسکولوں اور کالجوں کے لئے اس کا خریدنا آسان نہیں ہے، ریاستی حکومتوں نے مرکزی حکومت کے تعاون سے یہ فیصلہ کیا کہ نیشنل لائبریری کلکتہ کو وصول ہونے والی مطبوعات کی کتابیات متعلقہ ریاستوں کی زبان کے رسم الخط میں الگ الگ شائع کی جائے۔ ہندی اور اردو کی کتابیات کی اشاعت کا کام اتر پردیش سرکار نے اپنے ذمہ لیا اور وہ اب تک اردو کی ۱۹۵۸ع، ۱۹۵۹ع، ۱۹۶۰ع اور ۱۹۶۱ع کی مطبوعات کی فہرست قومی کتابیات کے نام سے شائع کرچکی ہے۔ اس کی ترکیب ڈیسیمل کلاسیفیکیشن کے مطابق ہوئی ہے۔ اور کولن نمبر بھی ہر اندراج کے بعد دے دیا گیا ہے۔ یہ ایک بہت مفید اقدام ہے مگر اشاعت دفتری تاخیر کا نام۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ناشرین کتابیں فوراً روانہ نہیں کرتے۔ اشاعت میں تاخیر کی وجہ سے اسکی افادیت کم ہوجاتی ہے دوسری خامی اس میں یہ ہے کہ اندراجات، خاصکر مصنفین کے ناموں کے اندراج کے لئے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی واضح ضابطے نہیں بنائے گئے ہیں۔ اسی طرح تبویب کی بھی غلطیاں ہوتی ہیں۔

اس موقع پر فضل اللہ احمد مرحوم کی فہرست کتب خانۂ حیدری، حیدرآباد، کا ذکر بھی ضروری ہے۔ انھوں نے بھی اردو کتابوں کی ایک مفصل فہرست مرتب کرنا شروع کی تھی۔ کام تقریباً مکمل ہوچکا تھا مگر ان کی بےوقت موت کی وجہ سے ناتمام رہ گیا۔

ببلیوگرافی کی دوسری شکل وہ ہے جس میں مختص موضوعات پر یا مخصوص مقام پر یا کسی بڑے کتب‌خانہ کے کسی ایک شعبہ کی فہرست مرتب کی جاتی ہے۔ اردو میں اسے بھی فہرست ہی کہا جاتا ہے۔ ایسی فہرستیں بھی اردو میں کافی شائع ہو چکی ہیں۔

بلوم ہارٹ نے ۱۸۷۴ع میں انڈیا آفس لائبریری، لندن کے اردو مخطوطات کی فہرست مرتب کرکے شائع کی۔ نصیرالدین ہاشمی مرحوم نے اپنے تحقیقاتی کاموں کے سلسلے میں محسوس کیا کہ اس میں بہت سی غلطیاں ہیں اس غرض سے وہ سرکاری خرچہ سے انگلستان اور یورپ کے سفر پر روانہ ہوئے۔ اس وقت کی ایک معاصرانہ چشمک کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

ہاشمی صاحب کی یورپ کو روانگی کے بعد انجمن ترقی اردو ہند، کے رسالۂ اردو میں دکنی ادب کے ایک اور مؤرخ شمس اللہ قادری نے Hindustani manuscripts in the library of India Office, London کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جو بعد میں کتابی شکل میں بھی شائع ہوا جس میں بلوم ہارٹ کی مرتبہ فہرست کی غلطیوں کی تصحیح کی گئی ہے۔ پیش لفظ میں وہ لکھتے ہیں :

« غرضکہ انڈیا آفس میں اردو ادبیات کا جو ذخیرہ جمع ہے وہ ہمارے لئے نایاب نہیں ہے ۔ حیدر آباد اور انجمن ترقی اردو کے عظیم الشان کتب خانوں میں یہ سب بلکہ اس سے کہیں زیادہ ایسی کتابیں موجود ہیں جن کا پتہ انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کے کتب خانوں میں نہیں ہے ایسی حالت میں جو لوگ اردو زبان کی ریسرچ کے لئے ولایت کو قدم رنجہ فرماتے ہیں وہ اپنے نفس اور اپنے ملک دونوں کو دھوکہ دیتے ہیں ۔ »

ہاشمی صاحب نے اپنی کتاب ‹ یورپ میں دکھنی مخطوطات › کے پیش لفظ میں بلا اظہار نام یہ جملے نقل کئے ہیں اور اس خیال کی تردید کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ کئی کتابیں ایسی ہیں جو صرف انڈیا آفس میں موجود ہیں ۔ نیز کسی کتاب کے متعدد نسخوں سے مقابلہ کرکے اختلافات معلوم کرنے کی اہمیت ظاہر کی ہے ۔ دکھنی مثنویوں کے فارسی ماخذوں کی موجودگی اور ان کی اہمیت بتلاتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ صرف انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کے کتب خانوں میں اردو کا اس قدر مواد موجود ہے کہ اس پر تحقیق کرنے کے لئے برسوں صرف ہونگے ، اور ایک نہیں بلکہ متعدد شخص ریسرچ کرسکتے ہیں ۔

یورپ میں دکھنی مخطوطات ، اردو کی اہم وضاحتی فہرستوں میں ہے ۔ مختلف اہم کتب خانوں کی فہرستوں کا سرسری تذکرہ بھی بیان کرنا مناسب ہے

ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد، کی مخطوطات کی فہرست ڈاکٹر زور نے چھ جلدوں میں مرتب کی ہے ۔ مطبوعہ کتابوں کی فہرست بھی علاحدہ شائع ہوئی ہے ۔

ہاشمی صاحب نے کتب خانۂ سالار جنگ اور کتب خانۂ آصفیہ کے مخطوطات کی فہرستیں بھی مرتب کیں جو شائع ہوچکی ہیں ۔ اگر چہ ان پر کئی اعتراضات ہوئے ہیں اور کئی خامیوں کی نشان دہی کی گئی ہے، لیکن اس کے باوجود ان کی

اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا. حیدر آباد کے ایک اور قدیم کتب خانے جامعۂ نظامیہ کی کتابوں کی فہرست بھی وہ مرتب کر رہے تھے. مگر موت نے انہیں اسکی تکمیل کی فرصت نہیں دی .

اہم موضوعات اور مشہور مصنفین کی اور ان پر لکھی ہوئی کتابوں اور دوسرے مواد کی ببلیوگرافی کی تحقیق کے میدان میں جو اہمیت ہے اسے محققین ہی سمجھ سکتے ہیں . اس قبیل کی چیزیں اردو میں ابھی کم ہی ہیں. غالب ، اقبال اور ابوالکلام آزاد سے متعلق ببلیوگرافی کا کام اطمینان بخش حد تک ہوا ہے .

ناشروں اور کتب فروشوں کی مرتبہ فہرستوں کی بھی اپنی اہمیت ہے . صدیق بکڈپو لکھنؤ کی شائع کردہ فہرست کتب جو مصنف وار ہے ، خصوصاً قابل ذکر ہے. یہ ۱۹۴۱ع میں شائع ہوئی تھی. اس میں ہندوستان کے تقریباً دو ہزار سے زیادہ مصنفین اور ساٹھ سے زیاد مصنفات کی تقریباً تمام تصانیف کا نام اور قیمت درج ہے. اور تمام کتابوں کی مختصر فہرست دی گئی ہے. اس فہرست کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مرتبین، فہرست سازی میں مصنفین کے ناموں کے اندراج کے تقاضوں سے واقف نظر آتے ہیں . چنانچہ تمہید میں بتایا گیا ہے کہ « اس فہرست میں مصنفین اور مؤلفین کے نام سے تعظیمی الفاظ کو مجبوراً نکال دیا گیا ہے اور صرف نام یا تخلص مختصر یا اور نام جو زیادہ مشہور ہے ، اس کو لیا گیا ہے اور اس فہرست کی ترتیب میں حروف تہجی کی ترتیب کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے تاکہ تلاش میں آسانی ہو. » جس مصنف کا نام مطلوب ہو ڈکشنری (لغت) کے الفاظ کی ترکیب سے مل جاتے ہیں .

اس طرح مختلف قسم کی فہرستیں تو اردو میں ترتیب دی گئی ہیں مگر خود فہرست سازی کے بارے میں تقریباً کچھ نہیں لکھا گیا ہے. مرتبہ فہرستوں کو بھی عموماً سائینسی بنیادوں پر ترتیب نہیں دیا گیا ہے اور اس بارے میں جدید تعلیم پائے ہوئے اردو داں خاموش ہی ہیں فہرست سازی پر اردو میں واحد کتاب محمد زبیرصاحب ، سابق اسسٹنٹ لائبریرین، مولانا آزاد لائبریری ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی لکھی ہوئی ہے جو ۱۹۶۳ع میں شائع ہوئی تھی اور اب اشاعت سے باہر ہے. اس کتاب کو اردو میں فہرست سازی کا نقش اول سمجھنا چاہئیے . اس میں جدید اصولوں پر فہرست سازی کے ابتدائی اور بنیادی اصولوں کو واضح کیا گیا ہے

عربی ، فارسی زبان سے شروع کرتے ہوئے فہرست سازی کی تاریخ پر نظر ڈالی گئی ہے ۔ ایک باب میں امیر خسرو سے لے کر حفیظ جالندھری تک تمام اہم مصنفین اردو کے نام اور ان کی تاریخ پیدائش درج کی گئی ہے ۔ ایک باب میں انگریزی اصطلاحات کے اردو مترادفات دیتے ہوئے مختصر سی تشریح کی گئی ہے ۔ لیکن خود کتاب میں زیادہ تر انگریزی اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں ۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد انگلستان اور امریکہ کی لائبریری ایسوسی ایشنوں کا مرتبہ کیٹلاگ کوڈ شائع ہوا ہے اور ڈاکٹر رنگھناتھن بھی اپنے کوڈ میں کافی ترمیم کر چکے ہیں ۔ ضرورت ہے کہ اس کتاب پر نظر ثانی کر کے اسے دوبارہ شائع کیا جائے ۔ زبیر صاحب نے اردو زبان کی ایک کمی کو پورا کرنے کی بہت اچھی کوشش کی ۔

تبویب :

کتب خانوں میں کتابوں کو ترتیب سے رکھنے کا فن بھی اتنا ہی پرانا ہے جتنا خود کتب خانے ۔ ایک عرصہ تک کتب خانوں کی الماریوں کو فن وار مختص کر دیا جاتا تھا ۔ آگے چل کر کتابوں کو متعین نمبر دئے جانے لگے ۔ اس تبویب نمبر کے دو اجزا ہوتے ہیں ۔ پہلا تبویب نمبر ، دوسرا مصنف یا کتاب نمبر ۔ اس کے لحاظ سے ایک ہی فن کی مختلف کتابوں کی جگہ متعین کی جاتی ہے ۔ ان دونوں نمبروں کو ملا کر انگریزی میں کال نمبر اور اردو میں طابی نمبر کہا جاتا ہے ۔ فن تبویب پر بہت کچھ کام دنیا کی مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے ۔ مگر چار طریقے عالمی شہرت رکھتے ہیں ڈیوی ڈسیمل ، یونیورسل ڈسیمل ، لائبریری آف کانگریس کلاسیفکیشن سسٹم اور کولن ۔

یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ اردو میں تبویب کے متعلق اب تک کچھ کام نہیں ہوا ہے ، البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جدید سائنس یا ٹکنک کو پیش نظر رکھ کر کوئی نظام تبویب مرتب نہیں ہوا ہے ۔ اور نہ کسی عالمی نظام تبویب پر کچھ لکھا گیا ہے ۔ اوپر اردو کی مختلف فہرستوں کا ذکر کیا گیا ہے ۔ سبھی مرتبین نے اپنی اپنی تبویب اور اپنے اپنے موضوعی عنوان استعمال کئے ہیں جن میں مزید وسعت اور پھیلاؤ کی گنجائش کم ہے ۔ اس موضوع پر جو کام ہوا ہے وہ یہ ہے :

حیدرآباد کے ایک کالج ، سٹی کالج ، کے کتب خانے کی مطبوعہ فہرست موسومہ « فہرس » کولن طریقہ پر ترتیب دی گئی ہے ۔ تمام نشانات بجنسہ استعمال

ہوئے ہیں۔ موضوع اردو میں لکھے گئے ہیں۔ ابتدا میں کولن طریقے کی مختصر سی تشریح کی گئی ہے اور اہم موضوعات کے نمبر دیدئے گئے ہیں۔ اس طرح «فہرس» کو کولن نظام کے تعارفی کتاب کی حیثیت دی جا سکتی ہے۔

جامعۂ عثمانیہ کے کتب خانہ میں اردو، فارسی، عربی کتابوں کی مناسب تبویب کے لئے ڈاکٹر نظام الدین نے ڈیوی اعشاری نظام کی تطبیق کی ہے۔ اردو، فارسی، عربی ادب، اسلامیات، تاریخ ہند و اسلام کے لئے انھوں نے تطبیقی نشانات وضع کئے ہیں۔ اس کی خامی یہ ہے کہ ان نشانات کو وضع کرتے ہوئے وہ فن تبویب کے بنیادی فلسفہ یا اصول کو نظر انداز کر گئے۔ نتیجہ میں ان کے نمبروں میں اور ڈیوی کے بعد کے اڈیشنوں کے نمبروں میں خلط ملط ہوگیا ہے۔

حیدرآباد کے کتب خانۂ آصفیہ (حال اسٹیٹ سنٹرل لائبریری) نے براؤن کے طریقے Subject Classification کی مطابقت میں اپنا نظام تبویب رائج کیا تھا۔ اسی طرح ادارۂ ادبیات اردو کی مطبوعہ کتابوں کے لئے راحت اللہ خاں، غلام رسول وغیرہ نے مل کر ایک طریقہ مرتب کیا تھا۔ ان طریقوں میں بنیادی اصولوں کو نظرانداز کردیا گیا ہے جس کی وجہ سے آئندہ توسیع کا امکان کم رہ جاتا ہے۔ نئے موضوع آپس میں بغیر کسی مطابقت کے ہی وضع کئے جا سکیں گے۔

ریاست حیدرآباد کے پہلے اردو گشتی کتب خانہ کے بانی فضل اللہ احمد مرحوم نے تبویب پر اردو میں پہلی کتاب یا پہلا نظام مرتب کیا تھا۔ یہ کتاب تبویب حیدری کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ ان کے بقول انھوں نے پیچیدہ کولن نظام اوز مشرقی علوم و ادب کے لئے غیر مفید ڈوئی نظام میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اردو میں اس موضوع پر اب تک اسی کو پہلی اور آخری کتاب سمجھا جاسکتا ہے۔ اس کی بنیاد پر اردو والے آگے بڑھ سکتے ہیں۔

طلبی نمبر کے دوسرے جز کتاب نمبر یا مصنف نمبر کے استعمال کی اردو مطبوعہ فہرستوں میں کوئی مثال نہیں ملتی، سوائے سلسلہ نمبر کے۔

اس موضوع پر واحد کتاب محمد زبیر صاحب ہی نے لکھی ہے۔ اس کا نام ہے «کتاب نمبر کیا ہے»۔ اس میں انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق اور کشمیر یونیورسٹی کے حالیہ لائبریرین بشیر احمد صاحب کے وضع کردہ نمبروں کی تشریح کی ہے۔ غالباً یہ نمبر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں عربی، فارسی، اردو

وغیرہ میں لکھی ہوئی کتابوں کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ اپنی موجودہ شکل میں ان نمبروں کو ترقی دینے کی ضرورت بھی ہے اور گنجائش بھی۔

لائبریری سائنس کے دوسرے موضوعات پر علاحدہ کتابیں تو نہیں لکھی گئی ہیں مگر کتب خانوں کی ترتیب، تنظیم، ترقی اور افادیت کے متعلق گاہے گاہے کچھ نہ کچھ مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ خاص لائبریری سائنس پر بھی اب تک اردو میں ایک ہی کتاب لکھی گئی ہے۔ کتاب کا نام ہے «رہ نمائے کتاب داری» اور لکھنے والے ہیں غلام رسول صاحب، سابق لائبریرین، سٹی کالج، حیدرآباد، جنھوں نے فہرس مرتب کرکے اردو والوں کو کولن نظام تبویب سے واقف کرایا اور اپنے کتب خانہ میں اس کا کامیاب تجربہ بھی کیا۔ یہ کتاب حیدرآباد کی ساہتیہ اکاڈیمی نے شائع کی ہے۔ کیٹلاگ سازی کی طرح رہ نمائے کتاب داری بھی مبتدیوں کے لئے لکھی گئی ہے اور لائبریری سائنس میں سرٹیفکٹ کورس کرنے والوں کے لئے موزوں ہے۔

لائبریری سائنس کا دوسرا موضوع جس پر اردو میں کتابیں اور مضامین بڑی تعداد میں ملتے ہیں، کتب خانوں خاص کر مشرقی زبانوں کے ادب کے کتب خانوں کی تاریخ و تذکرہ پر مشتمل ہے۔ اس میدان کے اہم پیش رو شبلی ہیں جنھوں نے اسلامی تاریخوں کو کھنگال ڈالا تھا۔ انھوں نے کتب خانۂ اسکندریہ کی تاریخ پر مفصل مضمون لکھا اور تاریخی دلائل سے ثابت کیا کہ مسلمانوں یا حضرت عمر پر اس کتب خانے کے جلادینے کا الزام بے بنیاد ہے۔ شبلی کا ایک اور مضمون «اسلامی کتب خانے» کے عنوان سے شائع ہوا اس میں انھوں نے مسلمانوں کے قائم کردہ اہم کتب خانوں کی تفصیل دی ہے۔ پھر اس مضمون کے لکھے جانے کے ایک طویل عرصہ کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے محمد زبیر صاحب نے اسلامی کتب خانوں کی سیر (۱۹۵۷ع) اور اسلامی کتب خانے (۱۹۶۱ع) تالیف کیں ابھی حال میں افضل اقبال نے حیدرآباد کے ایک مشہور کتب خانے کتب خانۂ سعیدیہ پر کتاب شائع کی ہے۔ دراصل یہ ان کا مضمون ہے جو «برہان» دہلی میں شائع ہوا تھا۔

اس سلسلے کے ایک دو تراجم بھی قابل ذکر ہیں۔ ایک تو اوکونر کی کتاب کا ترجمہ مبارز الدین رفعت نے «ایک مشرقی کتب خانہ» کے نام سے کیا ہے جس میں پٹنہ کی مشہور عالم خدا بخش خاں لائبریری کی مختصر تاریخ اور چند اہم ترین کتابوں کی تفصیل دی ہے۔ عرصہ پیشتر ایک مضمون اطالوی زبان میں «اسلامی

کتب خانے » کے عنوان سے شائع ہوا تھا ۔ اس کا ترجمہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی نے کیا اور اس پر مفید حواشی بھی لکھے تھے ۔ یہ ترجمہ کتابی شکل میں « اسلامی کتب خانے عہد عباسیہ میں » کے نام سے الناظر پریس ، لکھنؤ سے ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا

مذکورہ بالا مضمون کے بارے میں شبلی نے لکھا تھا کہ عنوان کے لحاظ سے مضمون کو نہایت مفصل اور وسیع ہونا چاہئے تھا لیکن جن واقعات کو قدما نے نظر انداز کر دیا ہو ان کے متعلق مشکل سے کچھ اجمالی حالات مل سکتے ہیں. مفصل تو بالکل نہیں ملتے ۔

معارف ، برہان ، نوائے ادب وغیرہ میں ہندوستان اور غیر ممالک کے اہم کتب خانوں پر مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں ۔ مختلف سفر ناموں ، تاریخوں ، تذکروں اور تاریخ ادب کی کتابوں میں بھی اردو کے کتب خانوں کا تذکرہ ضمناً آجاتا ہے ۔ خالص اردو زبان کی کتابوں پر مشتمل کتب خانے ملک بھر میں پھیلے ہوئے ہیں. کم از کم ان کی ایک ڈائرکٹری ہی تیار ہوجائے تو بہت سارے پوشیدہ خزانوں کا پتہ آسانی سے مل سکتا ہے ۔ مختلف کانفرنسوں میں بھی کتب خانوں کی ترقی و اشاعت پر زور دیا جاتا رہا ہے۔

لائبریری سائنس کی سابقہ شاخ اور آج کے نئے سائنس اسنادیات کی مثال نوائے ادب کے مقالہ نما میں ملتی ہے جس میں مختصر مواد کی اشارہ سازی ہوتی ہے ۔ اس موضوع پر بھی اصول مرتب ہونے ضروری ہیں ۔

لائبریری سائنس کے متعلقہ علوم و فنون پر بھی اردو میں کچھ نہ کچھ لکھا گیا ہے ۔ فن تحریر کی تاریخ پر حال ہی میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے ۔ صحیفۂ خوش نویساں نام کی کتاب کا اشتہار بھی نظر سے گذرا ہے ۔ سرمشق کے عنوان سے (۱۸۶۶ء) حروف و الفاظ لکھنے کی مشق پر ایک کتاب بمبئی میں شائع ہوئی تھی ۔ روشنائی اور کاغذ سازی پر بھی ایک آدھ کتاب شائع ہوئی ہے ۔

راقم الحروف نے لائبریری سائنس کے مختلف عنوانوں پر کچھ مضامین لکھے ہیں جو مختلف اخبارات میں شائع ہوئے ہیں ۔

خوشی کی بات ہے کہ اب حکومت ہند کے قائم کردہ اردو بورڈ نے لائبریری سائنس کے موضوع کو بھی اپنے اشاعتی پروگرام میں شامل کر لیا ہے ۔ یقین ہے کہ کچھ نہ کچھ مفید کام ہوجائے گا ۔

ڈاکٹر عبدالعلیم نامی ، ,, صوبۂ بمبئی کے قدیم اردو مطابع مطبوعات ۱۸۷۰ء سے قبل ،، اردو ادب ، شمارہ ۴ ، ۱۹۷۱ء

بسم اللہ الرحمان الرحیم

ابوالنصر محمد خالدی

مخمس
از
سیلان

ادارۂ ادبیات اردو ، حیدرآباد ،

ڈاکٹر محی الدین زور نے تذکرۂ مخطوطات ، کی چوتھی جلد میں بسلسلۂ مجموعۂ مناقب (ص ۲۵۱) لکھا ہے کہ مشہور منقبت گو برہان قندہار سے بلدۂ حیدرآباد آگئے تھے ۔ انھوں نے بارہ سو نو ہجری سے پہلے وفات پائی ۔ ان کے شاگردوں میں من جملہ اور شاعروں کے سیلان بھی تھے ۔

اس مختصر حوالے کے سوا سیلان کے متعلق اور بات معلوم نہ ہوسکی ۔

مذکورۂ صدر مجموعۂ مناقب میں وہ مخمس نہیں ہے جو یہاں پیش کیا جارہا ہے ۔ اس کا صرف ایک ہی نسخہ دستیاب ہو سکا جو کتب خانۂ مختاریہ میں ہے ۔ ملاحظہ ہو فہرست کتب خانۂ مذکور ، صفحہ ۵۱۷ ۔

سیلان بکسر سین مہملہ و بیائے معروف بر وزن جیلان عربی ہے ۔ اس کے معنی ہیں قیمتی پتھر ۔ فارسی میں کھجور کے شربت یا اس کے شہد کے لئے بھی بولا جاتا ہے ۔

نقب کے اصلی معنی کسی شے کو کھولنا ہیں اور عن کے صلہ یا باب تفعیل مع عن یعنی نقب عن یا نقّب عن کے معنی ہیں پھیلانا ، شہرت دینا ، منقبۃ بر وزن منفعت کے معنی « فعل حسن » اسی سے ماخوذ ہیں ۔ اس کی ضد ہے مثلبۃ ، جمع مناقب بر وزن مثالب و مطالب ادیبوں اور شاعروں نے اس لفظ کو

---

* ڈاکٹر ابوالنصر محمد خالدی ، ام ۔ اے ۔ (عثمانیہ) ، ڈی ۔ لٹ ۔ (قاہرہ) ، ریڈر ، شعبۂ تاریخ ، جامعہ عثمانیہ ، حیدرآباد

سیدنا علی کرم اللہ وجہہ اور ان کے بیوی بچوں، خصوصاً حسن و حسین کی تعریف و توصیف و مدح کے لئے خاص کر لیا ہے۔ یہ اصطلاح کب اور کیوں بنی، راقم الحروف اس سے ناواقف ہے۔ صرف اتنی بات یقینی ہے کہ اس کی ابتدا ایران میں ہوئی اور ایرانیوں کی تقلید میں یہ اصطلاح اردو والوں نے بھی اختیار کرلی۔

دکھن میں منقبت گوئی نے باصطلاح عمرانیات، ایک ادارہ کی شکل اختیار کرلی ہے۔ عشرۂ محرم بلکہ بارہ تاریخ تک کی مصروفیتیں اتنی زیادہ ہوتی تھیں کہ منقبت کی محفلوں کے لئے وقت نکالنا ممکن نہیں تھا۔ اس لئے یہ محفلیں بارہ محرم کے بعد سے شروع ہوتیں اور انیس بیس صفر تک جاری رہتی تھیں۔ کسی جگہ ایسی محفلیں ہوتی تھیں، جہاں صرف ایک ہی منقبت گو ہوتا تھا، کہیں کسی سر بر آوردہ منقبت گو کے ساتھ اس کے شاگرد بھی ہوتے تھے۔ لیکن اکثر تو یہ ہوتا کہ دو منقبت گو اپنے اپنے شاگردوں کے ساتھ ایک دوسرے کے مد مقابل ہوکر مسابقت میں حصہ لیتے تھے۔ اس کے لئے کئی مہینے پہلے ہی سے تیاریاں کی جاتی تھیں۔ نئے نئے شاگرد تیار کئے جاتے تھے، اور اس طرح ہر ممتاز منقبت گو کا ایک گروہ بن جاتا۔ جس طرح قوالوں کے گروہ کو، جس میں سازندے اور گویئے دونوں ہوں «چوکی» اور مولود خوانوں کے گروہ کو، جس میں ہادی و رڈادی دونوں ہوں «جماعت» کہا جاتا تھا اسی طرح منقبت گو گروہ «جوق» کہلاتا تھا۔

منقبت گو شاعر ہو یا نہ ہو پرگو و زودگو ضرور ہوتا تھا۔ منقبت گوئی کی بعض محفلیں تو خاصی شایستہ ہوتی تھیں، لیکن ایسی محفلیں بھی بہت سی ہوتی تھیں جہاں نام تو تھا مناقبہ مگر ہوتا تھا ایک دوسرے کا مثالبہ ہنگامہ پسند کرنے والے جوشیلوں نے ایسی محفلوں کو صرف ایام عزا تک ہی محدود نہیں رکھا تھا بلکہ وہ عرسوں کی بھیڑ میں بھی مناقب گوئی کے نام سے ایسے بازار گرم کرنے لگے تھے جن کو ثقہ لوگوں نے بجا طور پر مناقب بازی کا اکھاڑہ یا دنگل کا لقب دیا تھا۔ دکھن میں مناقب بازی کے ایسے جلسے اب بھی ہوتے ہیں اور محنت کش عوام ان کی سرپرستی شوق و ذوق سے کیا کرتے ہیں۔

سیلان کا مخمس تیرہویں صدی ہجری کی منقبت گوئی کا ایک نمایندہ نمونہ

ہے کیوں کہ اس میں کسی طرح کا بازاری پن نہیں آنے پایا۔ اسلوب بھی وہی ہے جو ایک متوسط درجہ کے منقبت گو کا ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں حقیقی شاعری کے اوصاف کی تلاش فضول ہے دکھن کی تہذیبی تاریخ میں ایسے منظومات بڑی اہمیت رکھتے ہیں کیوں کہ ان سے اپنے زمانۂ تصنیف کے ناخواندہ یا نیم شایستہ طبقہ کی ذہنی سطح کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے جس میں بے قاعدہ فوج کے سپاہی، جاگیرداروں کے متوسلین، چھوٹے انعام دار، یومیہ پانے والے دعاگو، چھوٹے تاجر اور اسی طرح کے کم آمدنی رکھنے والے ناخواندہ افراد ہی زیادہ تعداد میں شریک ہوتے تھے۔

اس مخمس پر نظر ڈالنے سے واضح ہوگا کہ اس کا موضوع بھی وہی ہے جو امین کے قصیدے اور کمین کی مثنوی کا تھا۔ موضوع سے قطع نظر زبان کی عہد بہ عہد تبدیلی کو سمجھنے میں بھی اس سے کچھ نہ کچھ مدد ضرور ملے گی۔ انشاء اللہ۔

عجب یہ روایت ہے غم کی مکدّر سنو دوستاں ٹک ایدھر کان دھر کر
کہ یک روز شب کوں مدینے کے اندر خوشی ساتھ حضرت گئے تھے جو بستر
دو ہی لحظہ آرام پائے پیمبر

ہوا حکم خالق کا روح الامیں پر کہ تو بیگی جا پردا زمیں[1] اوپر
یہی وحی پونچادے اس مرسلیں پر مرا دوست غفلت کی ہے گلشنی پر
درود اور صلوات جا بھیجو ان پر

کہو دوست میرے کو کس کام میں ہے سبب کیا جو بے فکر آرام میں ہے
چھڑا[2] اپنی امت کو کس فام میں ہے نہایت گناہوں کے الزام میں ہے
کہو قہر نازل ہو امت کے اوپر

وحی لے کے جبریل او سون پونچا جو سوتے پیمبر کو حجرے میں دیکھا
ادب سے ہی جا پاس بستر کے بیٹھا قدم کے مبارک انگوٹھوں کو چوسا
اٹھے ہڑبڑا کے رسول پیمبر

---

۱ میم مشدد
۲ چھوڑ (کر)

پیمبر کو جبریل جس وقت[1] جگایا کہا تم ہو صلوات حق نے بھیجایا[2]
جو کچھ امر حق تھا حقیقت سنایا کہو آج تم نے کیوں آرام پایا
ہوا قہر نازل یو امت کے سرور

رسول خدا سن کر احوال امت اٹھے پا برهنه بصد الم[3] و رقت
چلے روتے کہتے او امتی امت مری بخش امت کو یا ربِّ عزّت
مری داد دے جلد خالقِ[4] اکبر

کہ یک کوہ صحرا مین جاکر پیمبر کئے سجدۂ حق مین سر کو جھکا کر
ہے فریٗد فریاد اے ناز پرور اگرچه مری داد نا دیوے داور
اٹھاؤں گا نا سر اپنا روز محشر

اسی آہ و زاری میں حق کا پیارا کیا تین شب وہ دشت[5] میں گزارا
پڑا ہے مدینے میں اس کا پکارا شفیع اعنی[6] امت کدھر کو سدھارا
مدینے میں ڈھونڈے صحابوں نے گھر گھر

کہوں کیا میں اس دن کا احوال یاراں سبھی ڈھونڈھتے پھرتے اصحاب حیراں
نہ پائے کہیں کھوج حضرت کا امکاں کئے سب نے جب چاک اپنے گریباں
اڑاتے ہیں لے خاک کو اپنے سر پر

علی اور ولی جن کے سنگ (سب) محباں چلے ڈھونڈتے اوٹھ کے صحرا کے درمیاں
گئے تین فرسنگ[7] نکل دیں کے سلطاں دیکھے کُہ کے دامن میں یک شخص ہے واں
کھڑا بکریاں یک چراتا ہے دھنگر

کہے: پوچھنا جاکو اس ساتھ مولا کہ دھنگر بتا کئیں محمد کو دیکھا؟
نہیں جانتا کرکے احمق نے بولا محمد وہ ہے کون بتلاؤ اپنا
لگے اس سے کہنے کو پھر حق کے مظہر

---

۱ تائے قرشت خت
۲ بھیجایا - یائے اول خت
۳ بسکون لام
۴ قاف مشدد
۵ شین متحرک
۶ مخطوطہ میں شفیمان ہے ، اور غالباً یہی صحیح ہے بشرطہ ایں کہ شفیمان کو اولیاء کی طرح جمع تعظیمی سمجھا جائے .
۷ نون خت

یہ کہتے تھے سب مل کے اصحاب سارے کہ والی ہمارے کدھر کو سدھارے
کوئی کرتا ماتم کوئی آہ مارے کوئی پٹکے سر کو کوئی رو پکارے
بہت ڈھونڈے ہم نے نہ پائے ہیں سرور

نہیں جانتا تو وہ حق کا پیارا؟ کہ جس کے لئے حق نے دوجگ سنوارا؟
شفیع اعنی[1] امت کا بخشانے ہارا یہ سنتے ہی دھنگر نے پھر یوں پکارا
مگر فکر آتی مجھ دل کے اوپر

میں ہوں تین دن سے گرفتار[2] سراپا نہیں بکریاں میری چرتی ہیں چارا
اسی کُہ کے دامن میں یک شخص روتا کہ سجدے میں سر ہے وہ امت (ہے) کہتا
شفیع اعنی امت وہی (ہے) مقرر

یہ سنتے ہی دھنگر سے پھر بات حیدر گئے دوڑتے جلد اس کُہ کے اندر
دیکھے[3] سجدۂ حق میں ہیں گے پیمبر کہ آنکھوں کے سیلاب سے سب زمیں تر
لپٹ رہی ہے سب خاک حضرت کے موں پر

کئے عرض مولا رسالت پناہ[4] سے اٹھاؤ سر اپنے کوں اب سجدہ گاہ[5] سے
کہے مصطفی نے کہ اے شیر اللہ[6] کے اگر چھوٹے امت عذاب و گناہ[7] سے
میں سجدے سے اپنا اٹھاؤں گا جب سر

کہے مرتضی نے کہ شاہ ولایت اگرچہ مرے نئیں کو ہووے اجازت
میں بخشا ہوں اپنی ولایت شجاعت جو کچھ کی ہوا ہو سوا اور سخاوت
اگرچہ شفاعت ہو امت کی رہبر

وحی لے کے جبریل اس وقت آیا کیا مجرا صلوات پھر سر جھکایا
کہا اے محمد یہ ہے حکم رب کا کہ امت تمہاری کا چھٹکار ہوگا
کٹاویں گے سر اپنا شبیر (و) شبر

---

۱ شفیعان ۔ وضاحت کے لئے ملاحظہ ہو آٹھواں بند .
۲ الف خت
۳ بائے اول ۔ خت
۴ الف خت
۵ الف خت
۶ بتخفیف الہ
۷ الف خت

یہ سنتے ہی جبریل سے امر سبحاں کہے مصطفی نے کہ اے شیر مرداں
عوض عاصی امت کا ہے حق کا فرماں کریں ہم[١] نواسوں کے تئیں اپنے قرباں
کہ نا ہووے محشر میں امت گناہ گر[٢]

نبی نے کہے سن کے پھر بات اظہر جو راضی خدا کی سو راضی پیمبر
میں پوچھوں گا دونوں برادر سے یوں کر کہ چاہتے ہو امت تو دیو اپنا تم سر
کہ ویسے میں آئے وو دونوں برادر

جو دیکھے نواسوں نے نانا (سوں) پوچھے دونوں شاہ زادوں نے جا پاس پوچھے
کہ اے آج نانا ھو تم غم میں کس کے[٣] کہے مرتضی (نے) حسین اور حسن سے
میں چاهتا[٤] ہوں چھوٹے (وہ) امت گناہ گر

یہ سنتے ھی شبیر خوش ھو پکارے نہ کچھ دل میں لاے وہ حق کے پیارے
کہ اے نانا کٹنے سے سر کے ہمارے گناہاں عفو ہوویں امت کے سارے
شہادت ہماری ہے کیا اس سے بہتر

ہوے جب وہ راضی سر اپنا کٹانے وہیں بھیجا جبریل کو پھر خدا نے
لگے وہ ملائک اسے یہ سنانے کہ سر دیتے حسنین[٥] امت چھڑانے
رضا مند ہووے جو خاتون محشر

کہے فاطمہ نے کہو امر ہے کیا کٹے تب تو اظہار بی بی سے مولا
یہ سنتے ہی بی بی نے خوش ہوکے بولا یہ (ہے) کام افضل پھر اس سے بھلا کیا
وہ وھیں حکم آیا لکھو ایک محضر

لگے جب وہ لکھنے کو محضر شہادت لکھے پہلے حضرت حسن کی عبارت
لگے جب کہ لکھنے (وہ) شاہ ولایت جو شبیر کا نام صاحب سلامت
اٹھا اس پو یک سبز یک سرخ اوپر

---

١ ط: کریں ہیں
٢ گار کا مخفف
٣ ط: کہ اے آج نانا ہو غم میں تم کس کے
٤ الف اول خت
٥ بسکون سین دندانہ دار

وہ سبزی و سرخی کے تیں دیکھ زہرا کہ پوچھے علی سے یہ ہے یہ رنگ کیسا
کہے تب تو پھر کر وہ بی بی سے مولا کہ نام حسن جو سبز[1] رنگ ہے گا
شہید[2] ہوں گے زہر ہلاہل کوں پی کر

وہ سرخی جو ہے نام شبیر اوپر کہ یک روز کربل میں ہوں گا مسافر
وہ تشنہ گرسنہ وو لاچار ہو کر سبھی خویش اپنے برادر کھپا کر
گھسے گا اوسے حلق پر دھار خنجر

جفا ظلم اور اپنے سر پر سہے گا وہ مظلوم کے خوں کا دریا بہے گا
وہ چالیس دن خاک پر تن رہے گا کٹا سر وہ نیزے کے اوپر چڑے گا
مسافر ہو جاوے گا شام سفر کر

یہ سنتے زہرا نے کر آہ ماری لگا چھاتی حسنین کو ایک باری
پھرا ہاتھ سر پر کہے اے میں واری جو راضی خدا کی سو راضی ہماری
رضا مند دل بند صبر و رضا پر

شہادت کی کر فرد تیار جس دم علی اور حسنین پھر ہو کے باہم
کہ جس جائے بیٹھے نبی مکرم کہ فرد ان کو لا کر دئے شاہ عالم
کہے مہربانی کرو اس کے اوپر

رسول خدا نے کئے جب گواہی وو جبریل لایا وہ حکم الٰہی
کہا اے محمد گئی سب تباہی کہ امت کے اوپر ہوی ہے پناہی
زمیں سے پیمبر اٹھائے ہیں جب سر

محبو اگرچہ وہ محشر کا دن ہو کہ قضی حاجات کا کل رتن ہو
وہاں کیا سبب ہے وہ رنج و محن ہو وسیلہ جس امت کا وہ پنجتن ہو
درود اور صلوات (دائم ہو ا) نہر[3]

یہ سیلان کمتر نپٹ ناتواں ہو یہی عرض کرتا بہ آہ و فغاں ہو
یہ گردون گردش سے مج پر اماں ہو یہ سب دور دل سے وھم[4] و فغاں ہو
نگہ یک تفضیل کرو پاک سرور

---

۱ موحدہ متحرک
۲ خت
۳ کرم خوردہ
۴ ہائے ہوز متحرک

* اشفاق احمد

ریسلاس

(اردو میں ناول کا پہلا ترجمہ)

ڈاکٹر جانسن نے ۱۷۵۹ع میں اپنا پہلا اور آخری ناول ریسلاس Ressalas لکھا۔ اس وقت تک انگریزی ادب کے دور اول کے دو اہم ناول نگاروں، رچرڈسن اور فیلڈنگ کے تمام ناول منظر عام پر آچکے تھےاور اسمولٹ اور لارنس اسٹرلی کے بھی کچھ ناول تصنیف ہوچکے تھے۔ انگریزی ناول کی تاریخ میں ڈاکٹر جانسن کی خاص اہمیت کا حامل نہیں۔ ڈبلیو۔ ایل۔ کراس (W. L. Cross) نے جانسن کو انگریزی ادب کے دور اول کے دو تین غیر اہم ناول نگاروں میں شمار کیا ہے۔ رچرڈسن، فیلڈنگ، اسٹرلی اور اسمولٹ اس دور کے بڑے ناول نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ناول کی بعض تاریخوں میں ان کے ساتھ ہی کم اہم ناول نگار سارہ فیلڈنگ Sarah Fielding ڈاکٹر سموئیل جانسن Dr. Samuel Jonson اور گولڈاسمتھ Oliver Goldsmith کا نام بھی آجاتا ہے۔

ڈاکٹر جانسن پوپ اور ورتھ ورس کے درمیانی عہد کے انگریزی ادب کی سب سے اہم شخصیت تھا۔ اس پر جوزف اڈیسن اور رچرڈ اسٹیل کی فکر کا کافی اثر ملتا ہے جو جدید انگریزی سوسائٹی کے جنم دینے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ دی اسپیکٹیٹر The Spectator کے نہج پر جانسن نے دی ریمبلر Rambler اور دی آئیڈلر Idler رسالے بھی جاری کئے تھے۔ اس نے دی ایڈونچر Adventure نام کا بھی ایک رسالہ جاری کیا تھا وہ شاعر بھی تھا۔ اسکی دو طنزیہ نظمیں «لندن» اور انسانی خواہشات کا حشر The Vanity of Human Wishes اور ایک حزنیہ نظم آرینی Irene بہت مشہور ہیں۔ جانسن پہلا شخص ہے جس نے انگریزی زبان کے لغت (۱۷۴۷ع تا ۱۷۵۵ع) کی تالیف کی۔ علم زبان

---

* جناب اشفاق احمد اعظمی، ام۔ اے ؛ ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور، یو۔ پی۔

Philology کے نقطۂ نظر سے جانسن کا یہ کارنامہ ناقص ہے کیونکہ اس وقت تک یہ علم اپنی ابتدائی منزلوں میں تھا پھر بھی اس کے اسی کام سے انگریزی زبان میں تدوین لغت کی بنیاد پڑتی ہے۔ جانسن نے لارڈ چسٹر فیلڈ کو بہت خوبصورت خطوط تحریر کئے ہیں جو انشاپردازی کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ کزامیاں نے ریسلاس، انگریزی کے مشہور شاعروں کے سوانح اور شیکسپیر کو جانسن کے مستقل کارناموں میں شمار کیا ہے۔

ریسلاس ہیئت کے اعتبار سے کہانیوں کا مجموعہ معلوم ہوتا ہے۔ اس میں شہزادے کی کہانی کے علاوہ املاک، درویش، ریاضی داں اور پیکوہ کی گمشدگی کے حالات وغیرہ پر کئی کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔ اس کے پلاٹ کو مختلف موضوعات پر طویل بحثوں، فلسفیانہ خیالوں اور نظریوں سے سجایاگیا ہے۔ اس میں ایک قافلے کے مہماتی واقعات بھی ہیں اور شہزادے، شہزادی اور دیگر کرداروں کی ذہنی کیفیات کے مرقعے بھی۔

ایل کزامیاں ریسلاس کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے لکھتا ہے:

> « ریسلاس ایک ایشیائی قصہ Oriental Tale ہے جو قدرے گنجلک اور پیچیدہ اور سنجیدہ اسلوب میں بیان ہوا ہے۔ اس قصے میں عام کلاسکی خیالات بیان کئے گئے ہیں۔ اس کی زبان رنگین اور آرائشی ہے۔ ... جانسن کا تخئیل قلم کی ایک جنبش سے ماحول کی تصویر کشی کردیتا ہے اور بلا تکان اس کی تفصیلات بھی بیان کرتا چلاجاتا ہے۔ اس کا قلم ہمہ وقت مستقل انسانی فطرت کی بنیاد کی تلاش میں بےتاب رہتا ہے۔ زبان میں قدرے تصنع ملتا ہے لیکن جانسن اس کو اپنی سلامت روی اور سلاست سے فطری بنا دیتا ہے۔ اور اپنے متوازی احساسات کے ذریعہ وعظ کی تلخی و کم کردیتا ہے۔ اس کے خیالات محض الفاظ کے پلندے نہیں بلکہ ان کی بنیاد منطق پر رکھی جاتی ہے۔ جانسن کے یہاں الفاظ کے بڑے ذخیرے ملتے ہیں جو نماشی اور پرشکوہ ہوتے ہیں لیکن معنی کے صحیح شعور اور استعمال کے اچھوتےپن سے نکھر جاتے ہیں۔ (اس ناول میں) عام خیالات کو بھی زندگی کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کے لئے استقرائی

> Intictive انداز فکر کے ذریعے اس کو عمومیت اور یکسانیت کے عیب سے بچا لیا گیا ہے ۔ ... پس جانسن کی عقل پسندی مکمل طور پر منطقی حدود کے ایک گہرے احساس سے ظاہر ہوتی ہے اور اس کی دانشمندی انسانی تجربات کو سب سے زیادہ اہمیت دیتی ہے ۔"[1]

ریسلاس کی دلکشی کا راز خاص طور سے جانسن کے اعلیٰ شعور اور اس کی طرفہ عقل پسندی میں پوشیدہ ہے ۔ ریسلاس والٹیر کی کاندیدہ[2] Candide سے سے چند ہفتے بعد منظر عام پر آئی ۔ دونوں قصوں میں اخلاقی درس قریب قریب یکساں انداز کے ہیں لیکن دونوں میں روح مختلف قسم کی ملتی ہے ۔ جانسن کی یاسیت زندگی کی ناکامیوں اور محرومیوں کی پیداوار ہے لیکن کاندیدہ میں حالات سے ایک طرح کا سمجھوتہ والٹیر کی ذہنی توانائی کا مرہون منت ہے ۔ جانسن کی یاسیت میں انسانی اوصاف کی برتری پر ایک طرح کا پختہ ایمان ملتا ہے ۔ لیکن وہ ان خوبیوں کو خوشیوں کی بنیاد بنانے کے لئے تیار نہیں ۔ جانسن اس مکمل قسم کے احساس برتری کو نہیں مانتا جس پر انگریزوں کے فرائض کے تصور کی بنیاد ہے ۔ اس کے خیال میں بہت سے واقعات غیر متوقع طور پر رونما ہوتے رہتے ہیں جو انسانی خوبیوں اور خرابیوں میں کسی قسم کی بھی تخصیص نہیں کرتے ۔ انسان کی دانشمندی اسی میں ہے کہ وہ بلا چون و چرا خود کو ان حادثات کے رحم و کرم پر چھوڑ دے ۔ جانسن کی یاس انگیز اخلاقی تعلیمات کی بنیاد زندگی کے ٹھوس تجربات پر ہے ۔ اس کے اس قسم کے خیالات میں شکست خوردہ دل و دماغ کے لئے قوت شفا پوشیدہ ہے ۔ جانسن رچرڈسن اور فیلڈنگ دونوں کے مقابلے میں زندگی کی صداقتوں سے زیادہ قریب ہے ۔ اس طرح رومان سے حقیقت نگاری کی طرف جانسن نے ایک اہم قدم اٹھایا ہے ۔

کزامیان نے اپنی اسی تصنیف میں جس کا اقتباس پہلے پیش کیا جا چکا ہے اس ناول کی خاص کمزوری کی طرف بھی واضح اشارہ کیا ہے ۔ اس کا کہنا ہے کہ اس ناول کے کردار اپنے اندر کافی ٹھوس مواد رکھنے کے باوجود اس کی حیثیت ادبی اور فنی اعتبار سے کم کردیتے ہیں کیونکہ وہ اکثر براہ راست اخلاقی

---

۱ A History of English Literature, by L. Cazamian, p 808

۲ والٹیر کے اس ناول کا سید سجاد ظہیر نے چند سال قبل اردو زبان میں ترجمہ کیا ۔

درس دینے لگتے ہیں. اس قسم کی کمزوری اخـــلاقی قصوں میں عـام طور سے ملتی ہے .

کزامیان نے جس انداز سے جانسن کے خیـالات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے ، اس سے جانسن انگریزی ناول نگاری کے دور اول کے اهـم ناول نگاروں کے مقابلے میں حقیقت نگاری کے لحاظ سے کافی آگے نکل جاتا ہے اس کے یہاں شیفٹس بری اور پوپ کے احساس برتری کے خـلاف بھرپور بغاوت ملتی ہے . چونکه جانسن کے سر میں یه سودا خود اپنی زندگی کے ٹھوس تجربات سے پیـدا ہوا تھا اس لئے اس کو زندگی کا ایک جـــدید شعور حاصل ہوتا ہے . اس طرح جانسن کے یہاں بےحد اعلی نمونه کسی مخصوص نظریے یا مفروضے سے وجود میں نہیں آتا بلکه زندگی کے حقیقی شعور سے پیدا ہوتا ہے . اس حیثیت سے وه ناش ، ڈفو اور اسمولٹ کی روایت کو تازه خون عطا کرتا ہے اور قصے کو ناول کی فکر سے بہت حد تک ہم آہنگ کردیتا ہے . جانسن اپنی اعلی دماغی صلاحیت سے رومانی انداز فکر کی بنیادوں پر کامیاب ضرب لگاتا ہے لیکن جانسن کے اس ناول میں فنی کوتاهیاں بےشمار پائی جاتی ہیں جس کی وجه سے وه ناول نگاری میں زیاده اہمیت حاصل نه کرسکا اس کا موعظتی انداز بیـــان ناول کے فن کو مجروح کر دیتا ہے کیونکه ناقابل برداشت حد تک نمایاں ہے . جانسن اپنے کرداروں کے ذریعه براہ راست اپنے خیالوں کی اشاعت کرتا ہے . اس کے باوجود چونکه اس کے خیالات سطحی اور عمومی نہیں ہیں (اس کے دور میں یه بات زیاده صداقت پر مبنی تھی) بلکه فلسفیانه اور اعلی کلاسکی ہیں اس لئے اس کے پلاٹ میں کہیں کہیں رمزیت پیدا ہوگئی ہے . اور جانسن کی اعلی اور معیـاری زبان اور انگریزی زبان پر اس کی قدرت نے اس ناول کو تعلیمی اور مقصدی ناول نگاروں کی سطحیت اور یکسانیت سے بھی بچا لیا ہے .

المختصر ریسلاس میں بھی جانسن کی حیثیت ایک اعلی مفکر، مایۂ ناز انشـا پرداز اور مقاله نگار ہی کی زیاده رہتی ہے جو اس کی شخصیت کا امتیـازی وصف ہے . اور یہی خصوصیت اس کی عظمت کی ذمه دار ہے . جانسن نے فکر کے اعتبار سے ناول کی سطح کو کافی بلند کیا . آئنـــده چل کر اس کی اسی فکر پر تھامسن ہارڈی نے اپنے ناولوں میں اپنی فکر کی بنیاد رکھی اور ناول نگاری میں پیغمبرانه

قدرت حاصل کی۔ لیکن ناول نگاری کے اعتبار سے وہ اپنے پیش روؤں کی فنی خصوصیات کو بھی سمیٹنے سے قاصر رہا جانسن کو مقصدی اور تعلیمی ناول نگاروں کابجا طور پر پیشرو کہا جاسکتا ہے اور اپنے پیغمبرانہ فکر و شعور کے اعتبار سے وہ تھامسن ہارڈی کا بھی پیشرو ہے جس کے یہاں انسان ایک اندھی قوت کے ہاتھوں میں ایک کھلونے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

— ۲ —

ہندوستان میں مغرب کے اثرات کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ مغربی ادیبوں اور شاعروں کے کارناموں سے بھی لوگ روشناس ہونے لگے۔ جانسن کی شخصیت اس وقت تک انگریزی ادب میں بہت زیادہ اہمیت اختیار کرچکی تھی اس لئے اس کی تصنیفات کا ہندوستان میں پہنچ جانا حیرت کی بات نہیں ہے۔ جانسن کے ناول ریسلاس سے قدیم دہلی کالج کے عروج سے قبل ہی لوگ واقف ہو چکے تھے۔ یہاں تک کہ اس ناول کو اردو میں ترجمہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ آخر سنہ ۱۸۳۹ع میں کمال الدین حیدر عرف محمد میر حسین الحسینی[1] نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا۔ محمد میر نے اپنے مختصر دیباچہ میں لکھا ہے کہ

> صاحبان عالی شان آگرہ اسکول بک سوسائٹی کی تاریخ راسلیس شہزادے کی کہ جسے ڈاکٹر جانسن صاحب نے بکمال فصاحت اور بلاغت تحریر کیا ہے اور صاحبان عالی شان بھی اس رسالے کو بہت عزیز رکھتے ہیں، زبان اردو میں ترجمہ کیا کہ صاحبان فہم و فراست کو تہذیب اخلاق بخوبی دریافت ہو۔»[2]

ریسلاس انگریزی زبان کا پہلا قصہ ہے جس کا اردو میں ترجمہ کیا گیا۔ ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی نے اپنے تحقیقی مقالہ «اردو ناول کا آغاز و ارتقا سنہ ۱۸۵۷ع سے ۱۹۱۴ع» کے آخر میں اردو میں قصوں کے ترجموں کی فہرستیں بھی دی ہیں۔ اس میں ریسلاس کے اس ترجمہ کا نام شامل نہیں انگریزی زبان سے اردو ترجموں میں بابو شیوپرساد کے ترجمہ «دنالن قشرینہ» کو سرفہرست

۱ اس دور کے مشہور تاریخ نویس تھے۔ قیصر التواریخ ان کا ایک اہم کارنامہ ہے جو اس دور کے مؤرخ کے لئے سب سے اہم ماخذ ہے۔ نوابین اودھ سے محمد میر کے گہرے تعلقات تھے۔ انہوں نے انگلستان کا سفر بھی کیا تھا۔

۲ اردو دیباچہ ریسلاس، ص ۱

رکھا گیا ہے۔ اس پر سنہ ترجمہ تحریر نہیں ہے دوسرے نمبر پر قصہ « سینڈ فورڈ اینڈ مرٹن » کا ترجمہ رکھا گیا ہے اس پر سال ترجمہ سنہ ١٨٥٥ ع دیا گیا ہے ؛ حالانکہ اس سنہ میں اس قصے کا ایک ہندی ترجمہ ہوا تھا۔ بابو شیو پرساد اس قصہ کو سنہ ١٨٥٤ ع سے قبل اردو میں ترجمہ کرچکے تھے۔[١] صدیقی صاحب نے ترجموں کے باب میں جو کچھ تحریر کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سنہ ١٨٥٠ ع کے قبل کے کسی ترجمے سے واقف نہیں۔ حقیقت یہ ہے، جیساکہ اوپر لکھا گیا، انگریزی زبان سے اردو میں قصوں کے ترجمہ کی تاریخ میں ریسلاس کے اس ترجمہ کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔

یہ ترجمہ آگرہ بک سوسائٹی کی فرمائش پر کیا گیا۔ اسے پادری جان جیمس مور نے منشی فتح اللہ اکبرآبادی کی مدد سے تصحیح کرکے کرین وے صاحب کے چھاپہ خانے میں طبع کرایا۔ سرورق کی عبارت یہ ہے :

« تواریخ
راسلس شہزادہ حبش کی
جسکو عالم متبحر جانسن صاحب نے تصنیف کیا
سید محمد میر لکھنوی نے آگرہ اسکول بک سوسائٹی کے واسطے
اردو زبان میں اسکو ترجمہ کیا
اور
پادری جان جیمس مور صاحب نے منشی فتح اللہ اکبرآبادی کی
استعانت سے تصحیح کرکے کرین وے کے چھاپہ خانے میں چھپوایا
سنہ ١٨٣٩ مسیحی »

ترجمے کے آخر میں انگریزی میں بھی اسی مفہوم کا سرورق دیا ہوا ہے اور اس کے ساتھ ہی انگریزی میں لکھا ہوا ڈھائی صفحے کا ایک دیباچہ بھی شامل ہے جس کے خاتمے پر دسمبر سنہ ١٨٣٩ ع تحریر ہے۔ دیباچہ نگار کا نام درج نہیں۔ غالباً پادری جان جیمس مور کا لکھا ہوا ہے۔ دیباچے میں اردو زبان

---

١ پنڈت بنسی دھر نے اس کا ترجمہ اردو سے سینڈ فورڈ اور برٹن کی کہانی (١٨٥٥ع) کے نام سے کیا۔ راجہ شیو پرشاد، ستارۂ ہند نے پہلے اردو پھر ہندی ترجمہ کیا تھا۔ ممکن ہے کہ پنڈت بنسی دھر کا ترجمہ ستارۂ ہند کے ہی اردو ترجمہ پر مبنی ہو۔ (ہندی ناول کا پس منظر اور روائت از ڈاکٹر بدری داس ص ١٨٠ تا ١٨١

میں ترجمے کے مسائل پر زیادہ روشنی ڈالی گئی ہے . اس میں جانسن کے اس ناول کو ایک خوبصورت قصے Beautiful Tale سے تعبیر کیا گیا ہے . اس کے علاوہ اس سے اور کچھ بھی بحث نہیں کی گئی ہے .

اردو زبان میں ایسے قصوں کے ترجمے کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس وقت ہندوستانیوں کو اس قسم کے اصلاحی اور تعلیمی قصوں کی ضرورت تھی کہ ان کے اخلاق و عادات کی اصلاح بھی ہو اور وہ مغربی علوم و خیالات سے بھی واقف ہوجائیں اور ان کے دلوں میں علوم جدیدہ کو حاصل کرنے کی تحریک پیدا ہو . اسی اصلاحی نقطۂ نظر نے اس دور کے لکھنے والوں کو انگریزی ادب کی اس قسم کی تحریروں کی طرف متوجہ کیا . اس کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ قصہ کافی مختصر ہے ، کل سو ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ہے . پیش نظر ترجمہ ۲۵۵ صفحات میں ختم ہوگیا ہے . اس کے برعکس انگریزی کے اہم ناول نگاروں کے ناول نہایت ضخیم ہیں . رچرڈسن کا پہلا ناول پانچ جلدوں پر مشتمل ہے . باقی دو ناول سات سات جلدوں میں ختم ہوتے ہیں ٹرسٹرم شیڈی تو نو جلدوں تک لکھا گیا پھر بھی نامکمل رہ گیا . اس قسم کے ناولوں کا ترجمہ ہی پرانا نہیں بلکہ پڑھانا بھی دشوار امر تھا . ارباب حکومت اور سر رشتۂ تعلیم سے منسلک لوگ نصاب کی فراہمی میں جلد ازجلد کتابیں تیار کروانا چاہتے تھے اسی وجہ سے رچرڈ سن کے کسی مکمل ناول کے بجائے اس کے ناولوں کا ایک مختصر انتخاب جو اخلاقی تعلیمات پر مشتمل تھا ، دہلی کالج کے انگریزی نصاب میں داخل کیا گیا .

اخلاقی اور تعلیمی پہلوؤں کے علاوہ ہندوستانی عوام کو جانسن کی اس تصنیف نے اس وجہ سے اور بھی متاثر کیا کہ اس میں یاسیت کا رنگ ملتا ہے جس کی بنا پر لوگوں کو مصنف کی آواز مسلسل شکستوں سے چور اپنے دل کی آواز سے ہم آہنگ معلوم ہوئی قدیم داستانوں کے خلاف دہلی میں پہلے ہی ردعمل شروع ہوچکا تھا . اس قسم کے قصوں کی بلند آہنگی اور ان سے جھلکتا ہوا احساس برتری شکست خوردہ اور بےحقیقت ثابت ہو چکے تھے اور الف لیلوی قسم کے عشقیہ واقعات بھی اپنی دلکشی کھوتے جارہے تھے . جانسن کی آواز صداقت سے زیادہ قریب تھی اس لئے اس کی اس تصنیف میں لوگوں کو زیادہ کشش محسوس ہوئی .

مولوی کریم الدین ، عزیز الدین اور ایسے دوسروں کے اصلاحی قصوں اور نذیراحمد کے ابتدائی ناولوں پر ریسلاس کے اس ترجمہ کا کافی اثر معلوم ہوتا ہے ریسلاس میں شہزادی « نکایا » قصے کے آخر میں اس نتیجے پر پہنچتی ہے :

« ایک مدرسہ کامل عورتوں کی تعلیم کے لئے مقرر کیا جائے جس میں سرگروہ رہوں . . . اپنے وقت کو تحقیق اور واقفیت علم میں تقسیم کروں . »[1]

مولوی کریم الدین نے « خط تقدیر » کی تصنیف کا یہی مقصد قرار دیا ہے کہ لوگ تحصیل علم کی طرف مائل ہوں . ان کے خیال میں اس دور کے ہندوستانیوں کی شکست خوردگی اور مفلوک الحالی کا مداوا علوم جدیدہ کی تحصیل میں پوشیدہ تھا . اس کے بعد نذیر احمد اپنے ابتدائی دو ناولوں میں عورتوں کی تعلیم کو موضوع قصہ بناتے ہیں مرآۃ العروس میں مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کے فرسودہ طریقوں کی مذمت کی گئی ہے اور جدید خیالوں پر مبنی ایک مدرسے کا نقشہ پیش کیا گیا ہے . ویسے اس ناول کا اصل موضوع امور خانہ داری ہے . تعلیمی مقاصد کے لئے نذیراحمد نے بنات النعش کو خاص طور سے تصنیف کیا .

ریسلاس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں عشقیہ جذبات اور واقعات سے قصداً گریز کیا گیا ہے . در اصل یہ بھی رومان سے ایک طرح کی بغاوت تھی . نذیر احمد نے بھی اپنے ابتدائی ناولوں میں اس طرح کے جذبات اور واقعات سے شعوری طور پر گریز کیا ہے اس طرح ان کے یہاں بھی داستانوں کے روایتی عشق سے واضح بغاوت ملتی ہے . اس سے ریسلاس کے اس ترجمے کی اہمیت ظاہر ہے . اس نے اردو کی ابتدائی جدید قصہ نویسی کو بڑی حد تک متاثر کیا ہے . یہی جدید قصہ نویسی کا پہلا نمونہ ہے جس سے اردو داں طبقہ واقف ہوا اور اسی کی بنیاد پر اردو میں جدید قصہ نگاری کی عمارت کھڑی کی گئی .

اس ترجمہ کے متعلق مترجم کے دعوے کو انگریزی دیباچہ نگار نے اس طرح پیش کیا ہے :

« پھر بھی وہ سوچتا ہے کہ ترجمے کے اعتبار سے یہ ان تصنیفات سے حقیر نہیں ہے جو اب تک انڈین پریس سے شائع ہوئیں . »[2]

---

۱ تواریخ راسلس شہزادہ حبش کی ، ص ۲۵۸

۲ ریسلاس کا انگریزی دیباچہ ، ص ۱ و ۲

اس دعوٰی کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ یہ ترجمہ جانسن کے ناول کی اصل روح کو اپنی گرفت میں نہیں لا سکا ہے جس کی وجہ سے وعظوں اور بحثوں کا ایک مجموعہ ہوکر رہ گیا ہے، جبکہ کزامیاں کے خیال کے مطابق جانسن کی اعلازبان کے سبب اصل تصنیف میں اس قسم کا احساس نہیں پیدا ہوتا۔ اس میں اتنی کشش ہے کہ اخلاقی درس کی تلخی سے قاری اس قدر اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا۔

ریسلاس کے مترجم سید محمد میر لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ اس کے باوجود ان کے ترجمے کی زبان پر لکھنؤ اسکول کے اسلوب تحریر کا اثر نہیں ملتا۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جن اشخاص کی رہنمائی میں یہ ترجمہ کیا گیا وہ زبان کے جدید رجحانات سے واقفیت رکھتے تھے اور مترجم بھی ان سے ناآشنا نہیں تھا۔ ریسلاس کے ترجمہ میں فسانۂ عجائب کی زبان سے کام نہیں چل سکتا تھا۔ اس میں عشقیہ مضامین کے برخلاف زندگی کے بہت سے ٹھوس مسائل پر سنجیدہ بحث و مباحثے ملتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ یہ ترجمہ ایک ایسی زبان سے کیا جا رہا تھا جس کی نوعیت فارسی زبان سے بالکل مختلف تھی۔ مزید برآں اردو کی مشہور داستانیں فارسی کا ترجمہ نہیں تھیں بلکہ ماخوذ تھیں فسانۂ عجائب اور رانی کیتکی تو طبعزاد داستانیں ہیں۔ لیکن نو طرز مرصع فارسی زبان سے ایک ترجمہ کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے اس کی زبان بے ہنگم ہے۔ اس میں باغ و بہار اور فسانۂ عجائب کی سی دلکشی نہیں ملتی۔ ریسلاس بھی فارسی سے زیادہ ایک اجنبی زبان انگریزی سے ترجمہ ہے اس لئے اس کی زبان اتنی رواں اور سلیس نہیں ہے جتنی اردو کی جدید داستانوں کی۔ مترجم بعض مقامات پر جملے کی ساخت بھی اردو زبان کی قواعد کے مطابق درست نہیں کر سکا ہے۔ لیکن اس ترجمے کی زبان بعض جدید رجحانات کی حامل ضرور کہی جا سکتی ہے۔ پہلا رجحان تو یہی ہے کہ اس ترجمے میں لکھنؤ اور دہلی اسکولوں کی زبانوں کی کوئی پابندی نہیں ملتی اور نہ اس میں کیتکی کے مصنف کی طرح کسی قسم کی غیرفطری شرطیں ہی عائد کر لی گئی ہیں کہ ذہنی ورزش کا نمونہ بن جائے۔ اس کا مترجم اور اس سے منسلک دوسرے افراد اچھی طرح واقف تھے کہ دوسری زبانوں کی مدد سے اپنی زبان کو آزادانہ طور پر کیسے فروغ دیا جاسکتا ہے۔ دیباچہ نگار سرچشمہ زبانوں اور ملکی بولیوں کے متعلق اپنے خیالات کا اس طرح اظہار کرتا ہے:

« یہ اور بھی ناگزیر ہو گیا کہ اصطلاحات اور خیالات کے اظہار کے لئے مناسب الفاظ کی تلاش ایشیا کی کلاسکی زبانوں میں کی جائے . ہندوستانی بولیوں کی ترقی اور رفتہ رفتہ اس کی تکمیل کے نقطۂ نظر سے بھی مشرق کی ان زبانوں سے ایک حد تک تعلق لازمی ہے . یا کسی تصنیف کے موزوں ترجمہ کے لئے بھی خواہ وہ سائنسی تصنیف ہو یا ادبی یہ بات لازمی ہو جاتی ہے . ... المختصر ان بولیوں کی شستگی اور ان کی تکمیل جس حد تک بھی ہوئی ہے وہ انھیں کلاسکی زبانوں سے ہے ، بالکل اسی طرح جیسے کہ مغرب کی جدید زبانیں جتنی بھی ترقی کرسکی ہیں اور جس قدر بھی آگے بڑھ چکی ہیں وہ یونانی اور روم کی کلاسکی زبانوں ہی کی بدولت .

« ان باتوں کا جائزہ لینا اس لئے یہاں ضروری ہوگیا کہ ایشیائی کلاسکی زبانوں کا رواج اس طرح کم ہوتا جا رہا ہے جس طرح ان کا مطالعہ پہلے لازمی تھا . اس وقت ہندوستانی زبانوں کو عام طور سے نظرانداز کیاجاتا تھا اور اب یہ زبانیں بےتوجہی کی آخری حدود میں داخل ہو چکی ہیں ان سرچشمہ زبانوں کو اس طرح نظرانداز کردینے سے — جن سے ہندوستان کی مختلف بولیوں کا جنم ہوا ہے — اور بغیر ان سے کچھ تعلق کے لوگوں کے عادات و اطوار اور ان کے رسم و رواج سے ہماری واقفیت سطحی ہوگی . »[۱]

اس کے بعد دیباچہ نگار اس ترجمے میں مترجم کی کاوشوں اور ترجمے کو معیاری بنانے کے ضمن میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے اور اس ترجمے کو اور بھی سلیس بنانے کا مشورہ دیتا ہے . اس ترجمے میں مناسب ہندوستانی محاوروں کو کلاسکی زبانوں کے الفاظ کی جگہ استعمال کرنے کی بھی اجازت دینے کا ذکر کرتا ہے اور اس پر نظر ثانی اور غلطیوں کی درستی کے متعلق بھی اشارہ کرتا ہے .

آخر میں دیباچہ نگار اس ترجمے کو ہندوستانی ادب میں ایک اضافے کی حیثیت عطا کرتا ہے . اس کا یہ خیال غلط بھی نہیں کہا جا سکتا . یہ ترجمہ اردو زبان کے نقش اولین کا درجہ رکھتا ہے جو زبان کی ترقی کے جدید طریقوں کا

---

۱ ریسلاس کا ترجمہ ، ص ۱

حامل ہے۔ اردو داں طبقہ جو صرف فارسی زبان سے چمٹ کر رہ گیا تھا اور پھر فارسی زبان کی بالا دستی سے گھبرا کر اس کے دامن سے الگ ہونے کی کوشش میں اردو زبان کے محـــدود سرمایے پر قانع ہو رہا تھا، یہ ترجمہ اس کے لئے ایک زیادہ وسیع میدان عمل کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اس ترجمہ میں مختلف سرچشمہ زبانوں سے استفادہ کرنے اور ان کے الفاظ کو اردو زبان سے ہم آہنگ کرنے کا سلیقـہ ملتـا ہے۔ اس قسم کی اولین کوشش کے لئے مترجم بلاشبـہ قابل ستایش ہے اس نے ان زبانوں کے بہت سے الفاظ کو اپنی زبان میں مکمل طور سے جذب کر لیا ہے۔ کہیں کہیں ان پر مکمل تصرف کرنے میں وہ ناکام بھی رہا ہے لیکن ایسی مثالیں کم ہیں۔ اس ترجمے کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس میں جملوں کی ساخت اکثر قدیم معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً :

« جو لوگ کہ بگوش دل و وہم و خیال کے باتوں کو سننے پر متوجہ ہوتے اور صورتہـائے خیال کی دل سے ... اور نقش آج کے دن کے کل کمال کو پہنچیں گے۔ »[1]

« ان کی ولایت کی اپنے دشمنوں کا تعـــاقب کریں یا ان کے سامھنے سے پس پا ہوں۔ »[2]

« جس پر تاڑ کے درختوں کا سایہ تھا اور دریائے نیل کے آبشار سے . . اندیشنـاک ہوکر فکر و تأمل کی طرف رجوع ہوتا تھـا۔ علی الخصوص جس وقت ہوا چلتی .. اول یہ غار بہت بے قرینـہ تھا آخرش محنت و صفت انسانی سے ایسا طیار ہوا کہ اس میں کئی کمرے مرتب ہوگئے۔ »

« آخرش دار السلطنت سے فرمان معزولی کا آیا اور وہ پا بہ زنجیر ہوکر شہر استنبول گیا۔ اس کا حـال پھر کچھ نہ سنا کہ اس پر کیـا گذرا۔ »[4]

---

۱ ریسلاس کا ترجمہ، ص ۱
۲ ایضاً، ص ۱۵۲
۳ ایضاً، ص ۱۱۳
۴ ایضاً، ص ۱۲۸

ان اقتباسات سے ظاہر ہے کہ عبارت کہیں کہیں کافی رواں بھی ہو جاتی ہے اور کہیں کہیں جملے کی قدیم ساخت کی وجہ سے روانی میں کمی آجاتی ہے اور سمجھنے میں بھی دقت ہوتی ہے۔ بعض الفاظ بھی جیسے «سامھنے» قدیم لسانی شکل میں ہیں۔ ترجمہ میں عربی اور فارسی دونوں زبانوں کے الفاظ آزادانہ مستعمل ہوئے ہیں۔ جدید اردو میں اس ترجمے کی کم و بیش وہی حیثیت ہے جو نوطرز مرصع کی حیثیت باغ و بہار اور فسانۂ عجائب کے مقابلے میں ہے نوطرز مرصع فارسی سے اردو میں ایک ناقص ترجمہ ہے جس سے ایک مخصوص طرح کی زبان بنانے کی تحریک پیدا ہوئی اور اس میں اضافے اور نکھار کے ذریعہ اردو زبان ایک خاص منزل پر پہنچی۔ اردو زبان کا ایک دوسرا موڑ ریسلاس کے اس ترجمہ یا اسی قسم کی دوسری تحریروں سے شروع ہوتا ہے۔ اس طرح ریسلاس کے اس ترجمہ کو اردو زبان کی تشکیل میں اس تحریک کا پیش خیمہ کہا جاسکتا ہے جو تھوڑے ہی دنوں بعد ماسٹر رامچندر اور قدیم دہلی کالج کی دیگر تصانیف میں ظاہر ہوا

ایک غلطی کی تصحیح

جولائی ۱۹۷۰ع کے نوائے ادب میں ڈاکٹر حسینی شاہد کا ایک مضمون کلمۃالحقائق — اردو نثر کا پہلا مستند نقش شائع ہوا تھا۔ اس میں برہان الدین جانم کی وفات کا مادۂ تاریخ غلطی سے «عزیز از جان چشتیاں جانم» چھپ گیا صحیح مادہ یہ ہے:

عزیزا جان چشتیاں جانم

(مرتب)

*

مولانا احسن مارہروی کی ادبی خدمات

ہندوستان کی علمی تاریخ میں یہ امر کس قدر عجیب ہے کہ یہاں کے اکثر علما، فضلا، مشائخ اور شعرا کی ولادت اور ابتدائی نشوونما بڑے شہروں میں نہیں، بلکہ چھوٹی بستیوں، قصبوں اور گاؤوں میں ہوئی۔ اگر چہ بعد کو ان کے علم و عمل اور فضل و کمال کی روشنی شہروں، بلکہ اکناف ہند اور بیرون ہند تک پہنچ گئی۔ گویا یہ چھوٹی بستیاں Feeding grouud تھیں جن سے تمام ملک علمی غذا حاصل کرتا تھا۔ مثال کے طور پر روہیل کھنڈ میں امروہہ، سنبھل، بدایوں، سہوان اور اودھ میں بلگرام، خیرآباد، کاکوری، امیٹھی، سہالی، کوپا مئو کے نام پیش کئے جا سکتے ہیں

حضرۃ مولانا مارہروی مرحوم (۱۸۷۶-۱۹۴۰ء) جن کا نام زیر عنوان ہے در اصل سادات بلگرام ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ مرزا غالب نے سچ کہا ہے کہ بلگرام وہ خطہ ہے جس کے ہر فرد کو میں نے جوہر قابل پایا مولانا کے ایک بزرگ[1] بلگرام سے آکر قصبۂ مارہرہ، ضلع ایٹہ، میں سکونت پذیر ہوگئے اور یہیں ہدایت و ارشاد کی طرح ڈالی چنانچہ بلگرام ہی کی مانند یہ مقام بھی فضل و کمال کا مرکز بن گیا جہاں کی خاک سے بڑے بڑے علما و صلحا اٹھے اور آج بھی اسی خاک میں آسودہ ہیں۔

مولانا نے اپنے والد ماجد اور دوسرے اساتذہ سے تعلیم پائی۔ اور نو برس کی عمر میں حفظ قرآن سے فارغ ہوئے۔ عربی کے اساتذہ میں حضرت مولانا محب احمد قادری بدایونیؒ[2] کا نام نامی خاص طور پر قابل ذکر ہے جو ممتاز عالم دین ہونے کے علاوہ منطق و فلسفہ میں بھی دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ چونکہ اس زمانے میں مذہبی حلقے انگریزی تعلیم سے متنفر تھے۔ اس لئے مولانا خواش

۱ حضرت شاہ سید برکت اللہ جن کی نسبت سے یہ خاندان، خاندان برکاتیہ کہلاتا ہے۔

۲ راقم الحروف کو یہ فخر ہے کہ وہ بھی حضرت مولانا محب احمد بدایونی کے آخری دور حیات میں حضرت ممدوح کا شاگرد رہا ہے۔

* پروفیسر ضیاء احمد بدایونی، ام۔ اے؛ سابق صدر شعبۂ فارسی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، مدیر اعلا، شعبۂ لغت نویسی، دہلی یونیورسٹی، دہلی، مصنف مباحث و مسائل، مرتب دیوان مومن وغیرہ۔

کے باوجود انگریزی کی تعلیم سے مستفیض نہ ہو سکے ۔ ابتدائے عمر میں انہوں نے ایک دن ترکی ٹوپی جو انگریزی وابستگی کی نشانی سمجھی جاتی تھی پہن لی جس پر بزرگوں نے سخت سرزنش کی [۱]

مولانا کے خاندان میں علوم دینی کے بعد اگر چرچا تھا تو شعر و سخن کا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لڑکپن ہی سے شاعری کی طرف راغب ہوگئے ۔ اسی شوق نے ان کو چند سال کے بعد جہاں استاد ، فصیح الملک مرزا داغ دہلوی کے حلقۂ تلمذ میں داخل کیا ۔ داغ میر محبوب علی خان ، نظام حیدرآباد ، کے استاد تھے ، اور نہ صرف حیدرآباد بلکہ تمام ہند میں ان کا طوطی بولتا تھا ۔ مولانا تحریر کے ذریعے سے شاگرد ہوئے تھے ۔ مگر خدمت استاد اور اکتساب فن کے ذوق نے انہیں حیدرآباد ، دکن ، پہنچایا جہاں موصوف کا قیام ۱۸۹۶ء سے ۱۹۰۲ء تک رہا ۔ اس لئے اگر وہ اُسی زمانے میں استاد کے عزیز اور محبوب شاگرد اور شعری و ادبی صلاحیتوں کے مالک ہوگئے تو مقام حیرت نہیں ۔ یہ حقیقت ہے کہ مولانا کی طرح اپنے استاد کے پرستار بھی کم ہوں گے ۔ اگرچہ ان کا خاندان پیرزادوں کا خاندان تھا ۔ لیکن جہاں تک مجھے علم ہے انہوں نے کبھی کسی کو مرید نہیں کیا بلکہ جب لوگ [۲] فرط عقیدت سے دست بوسی یا قدم بوسی کی غرض سے بڑھتے تو مولانا حتی الامکان احتراز فرماتے ۔ وہ دراصل صحیح معنی میں طالب علم تھے اور جب تک زندہ رہے ان کو حصول علم کی لگن رہی ۔ ان کا ذاتی کتب خانہ کئی ہزار قیمتی مخطوطات و مطبوعات پر مشتمل تھا جو ان کی وصیت کے مطابق ان کی اولاد نے مسلم یونیورسٹی ، علی گڑھ ، کی نذر کر دیا ۔ مولانا شاعر کی حیثیت سے مشہور تھے اور استاد داغ کے شاگردوں میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے ۔ لیکن سچ پوچھئے تو ان کی نثری خدمات نے اردو کو جو فائدہ پہنچایا اس کی مثالیں بہت کم یاب ہیں

یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہ ہوگا کہ مولانا احسن اردو کے سچے عاشق تھے جوانی سے لےکر آخر عمر تک وہ برابر اردو کی خدمت میں لگے رہے ۔ زبان و ادب کا مسئلہ ہو یا شعر و سخن کی صحبت ، سفر ہو یا حضر ، طلبہ کا مجمع ہو

---

۱ مولانا احسن نے اس کوتاہی کی تلافی اس طرح کی کہ اپنی سب اولاد کو علوم مغربی کی اعلی تعلیم دلائی ۔ چنانچہ سادات مارہرہ میں جہاں سب سے پہلے موجودہ تعلیم کی روشنی پہنچی ، یہی گھر تھا ۔

۲ خود راقم نے معزز علما کو دیکھا ہے کہ پیر زادگی کی نسبت سے مولانا کی جوتیاں سیدھی کرتے تھے ۔

یا احباب کا جلسہ، وہ ہمیشہ اپنی لگن (خدمت اردو) میں مشغول رہتے زبان و محاورہ کی غلطی کسی سے بھی ہو وہ فوراً ٹوک دیتے۔ کسی لفظ یا ترکیب پر خود شبہہ ہوتا یا کوئی دوسرا معترض ہوتا تو جب تک بحث و تمحیص و مراجعت کتب سے امر نزاعی حل نہ ہو جاتا موصوف کو چین نہ آتا۔

ذیل کی فہرست تصانیف سے ان کی جامعیت، تنوع اور افادیت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ مولانا کے یہ رشحات قلم ان کے تجسس اور تحقیق کے ائینہ دار ہیں جن کو یہاں مختصر تعارف کے ساتھ درج کیا جاتا ہے۔ چونکہ بعض تصانیف کا سال تحریر یا سال اشاعت نہ مل سکا اس لئے ترتیب تاریخی کا التزام نہ ہوسکا۔ لیکن اس سے پہلے مولانا کی شاعری اور نثر کے بارے میں اظہار خیال ضرری معلوم ہوتا ہے۔

مولانا کے سامنے شاعری میں سب سے اہم نمونہ استاد داغ کا تھا جو حسن و عشق کی چھیڑ چھاڑ، شوخی، تیکھے پن اور لطف زبان میں بےنظیر تھے مولاُنا کے عشقیہ کلام میں یہ اوصاف تو نہیں البتہ زبان کی صفائی اور بندش کی چستی میں کوئی شک نہیں۔ خیالات قدیم ہیں۔ تاہم وہ جدید شاعری کے محاسن کے بھی قدر شناس تھے تھے۔ انھوں نے عمدہ نئے اور نیچرل افکار کی تحسین سے کبھی دریغ نہیں کیا۔ مگر یہ چیز ان کے یہاں تلاش کرنا عبث ہے۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ رنگ زمانہ کے اثر سے وہ مبالغہ، تضع، ابتذال اور رعایات سے کنارہ کش ہوگئے۔ جب کوئی شخص دیوان کی اشاعت کا ان سے تقاضا کرتا تو فرماتے کہ جی، ابھی اتنا دیوانہ نہیں ہوا ہوں۔ غرض ان کی غزل کسی طرز خاص کی حامل نہیں ہے۔ لیکن ان کی اکثر نظمیں صحت زبان و سلاست بیان کے ساتھ خلوص و صداقت کا آئینہ ہیں۔

مولانا کی نثر میں لطف بیان، زور استدلال، کس کس صنائع کا استعمال اور آیات قرآنی و اقوال عربی کا اقتباس بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اُردو کے ساتھ ہندی کی پُٹ اکثر مزہ دے جاتی ہے۔

اب ہم مولانا کی تصانیف پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں جس سے ان کی خدمت اردو کا کچھ اندازہ ہوگا۔ یہ حسب ذیل ہیں:-

---

۱ ملاحظہ ہو کلیات ولی و ریختہ ولی از ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی

(۱) مجمع البرکات فارسی - یہ حضرت سید برکت اللہ شاہ کا کلام ہے جس کو جناب احسن نے ایڈٹ کرکے شائع کیا۔

(۲) جلوۂ داغ - مرزا داغ کی سوانح عمری جو غالباً سب سے پہلی سوانح ہے۔ اس سے مصنف (مؤلف) کی ابتدائی کوشش کے آثار ظاہر ہیں۔

(۳) یادگار داغ - استاد کا چوتھا اور آخری دیوان۔

(۴) کلیات ولی - یہ سنہ ۱۹۲۷ء میں انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، کی طرف سے شائع ہوا۔ مولانا نے شروع میں ایک مفصل و مدلل مقدمہ تحریر کیا ہے جو ولی کے سوانح حیات، کلام کی خصوصیات اور موجودہ نسخے کی ترتیب کے حالات پر مشتمل ہے۔ مولانا نے بتایا ہے کہ انھوں نے کن کن لائبریریوں اور نسخوں سے استفادہ اور مقابلہ کا صبرآزما مرحلہ طے کیا۔ ولی پر یہ پہلا مبسوط اور تحقیقی کام ہے۔ ولی کے نام، سال ولادت و وفات، نیز وطن پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ مولانا کے خیال میں ان کا نام ولی اللہ یا ولی محمد تھا۔ ولادت اورنگ آباد میں سنہ ۱۰۷۹ء میں اور وفات احمدآباد میں سنہ ۱۱۵۵ء میں واقع ہوئی۔ نیز یہ کہ وہ گجراتی نہیں بلکہ دکنی تھے کیونکہ ان کی زبان میں دکنی عنصر بکثرت ہے۔ ولی کے بارے میں حال کی تحقیقات اِس سے قدرے مختلف ہے۔[1] کلیات مذکور میں بعض استدراکات اور ضمیمہ جات بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق کے قلم سے ہے۔

(۵) نمونۂ منثورات - یہ دراصل تاریخ نثر اردو ہے جس کی پہلی جلد سنہ ۱۹۲۹ء میں مرتب ہوئی۔ دوسری جلد بھی تیار تھی مگر افسوس کہ طباعت کی نوبت نہ آئی۔ مولانا نے اپنے ذاتی کتب خانے کے علاوہ نہ جانے کتنے پبلک اور پرائیویٹ کتب خانوں کے ذخیرے چھان ڈالے۔ ہزاروں کتابوں، رسالوں اور اخباروں کی ورق گردانی کی اور ہر نوع کے نثری نمونے جمع کئے تب یہ کتاب مرتب ہوئی۔ یہ متعدد بیش قیمت دستاویزوں کا مجموعہ ہے جن سے آئندہ اِس موضوع پر کام کرنے والے ہرگز بےنیاز نہیں ہوسکتے۔ پہلی جلد کی ترتیب حسب ذیل ہے:

(الف) عام تصنیف و تالیف - ٦ دور اور نمونے - ۱۳۹۸ء تا ۱۹۲۰ مع تبصرہ و کیفیت۔

---

۱ - ملاحظہ ہو "کلیات ولی" و "ریختہ ولی از ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی"

(ب) دفاتر سلطنت -۲ دور اور نمونے - ۱۸۴۱ء - ۱۹۳۰ء

(ج) اخبارات -۴ دور۱۸۴۷ء - ۱۹۲۰ء

(د) قانونی تراجم ۲ دور - ۱۸۵۱ء - ۱۹۳۰ء

(ہ) تقریظ و تنقید -۲ دور - ۱۸۴۲ء - ۱۹۳۰ء

(و) خطوط -۲ دور - ۱۸۵۲ء - ۱۹۳۰ء

یہ صحیح ہے کہ بعض تحقیقات اب out of date ہوگئی ہیں۔ مثلاً خالق باری کو امیر خسرو سے منسوب کرنا۔ تاہم کتاب کی افادیت اور دلچسپی میں کوئی شک نہیں۔

(۶) مثنوی حزن اختر اور خصوصیات مصنف یہ ایک مقالہ ہے جس میں مولانا نے واجد علی شاہ اختر جان عالم والیء لکھنؤ کی مثنوی پر تنقید کی ہے اور بتایا ہے کہ مثنوئ مذکور میں خارجی اور سطحی شاعری ہے۔ جذباتی اور داخلی رنگ نہیں ہے۔ ۱۹۳۱ء- یہ مقالہ رسالۂ ہندستانی الہ آباد میں شائع ہوا۔

(۷) شاہکار عثمانی- مولانا احسن کی یہ مثنوی سنہ ۱۹۳۷ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ « ہے یہ القائے ظلّ ربّانی » سے ہجری تاریخ برآمد ہوتی ہے اس کی شان تصنیف بہت پُر لطف ہے۔ قصہ وہ۔ خاک ۱۳۵۶ء نہیں۔ ہوا یہ کہ میر عثمان علی خان، نظام حیدرآباد، کا یک سالہ بچہ جواد جاہ ایک طبیب کے غلط علاج سے فوت ہوگیا۔ جس کا ان کو قدرۃً بہت رنج ہوا۔ اسی زمانے میں نواب قدرت نواز جنگ نے (جو بیگم نظام کے بھائی تھے) ایک خوب صورت نسخۂ قرآن مجید مزار شاہزادہ پر رکھے جانے کے لئے حضور نظام کو نذر کیا پھر نظام کو « القا » ہوا کہ اس کلام پاک کو جوبلی پویلین کی جدید عمارت میں دوسرے نوادر کے ساتھ محفوظ کردیا جائے۔ اس مضمون کو ہوش بلگرامی نے اردو میں لکھا اور نظام نے اُس پر چند سطور فارسی میں تحریر کردیں۔ اِن سطور میں قدرت نواز کے حق میں مژدۂ حیات دوام، رعایا کے لئے پیام حفظ و امان اور « قاتل ملعون » (طبیب) کے واسطے وعید خسران و عذاب تھی۔ یہ پورا مضمون ڈاکٹر ضیاءالدین احمد، وائس چانسلر، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، کی فرمایش پر مولانا احسن نے اردو مثنوی کی شکل میں ڈھالا اور اس کو شاہکار عثمانی کے نام سے موسوم کیا جب یہ شاہکار نظام کے ملاحظے میں آیا تو وہاں سے مولانا کے پاس بقلم خاص پروانۂ خوشنودی مزاج (بہ دستخط آصف سابع) « شرف درود » لایا۔

اے وائے ز ناکامی تقدیر دگر ہیچ ۔ درحقیقت زبان کی لطافت اور بندش کی جرالت کے لحاظ سے یہ مثنوی ایک شاہکار ہے ۔ کاش یہ قوت نظم کسی معقول موضوع پر صرف ہوتی !

(۸) کارنامۂ غم (۱۹۳۸ء) یہ حضرت سید الشہداءٔ علیٰ جدّہ و علیہ السلام کے مناقب و مصائب کی نظموں کا مجموعہ ہے جس میں سلام ، خمسے اور دوسری اضافہ میں اور جن کا پختگی ، صفائی ، سوز و گداز کے اعتبار سے خاص درجہ ہے ۔

(۹) منتخب داغ - مولانا اس نکتے کے قائل تھے کہ شعر اگر اعجاز باشد بے بلند پست ۔ اسی خیال سے انہوں نے استاد داغ کے دو اوین کا انتخاب شائع کیا ۔ اس کے دو حصے ہیں ایک میں وہ کلام ہے جو بے عطف و اضافت ہونے کے باعث روز مرہ کا عمدہ نمونہ ہے ۔ دوسرے میں عام منتخب اشعار ہیں ۔

(۱۰) انشائے داغ - داغ کے خطوط کا مجموعہ ۔

تصنیفات بالا کے علاوہ مرثیۂ داغ (ترکیب بند) ، کسوف الشمسین (مسدس - شمس العماء حالی اور شمس العماء شبلی کی رحلت سے متعلق) ، اردو لشکر (نظم) ، تخمیسیں ، چند منظوم ، قوم کا مطالبہ (نظم) ، علی گڑھ کالج کی فریاد (نظم) بھی اپنی جگہ خوب ہیں ۔

آج اردو دوست حضرات اردو زبان و املا کے بارے میں جن امور پر زور دیتے ہیں مولانا کو ستر برس پہلے ان کی ضرورت کا احساس ہوگیا تھا ۔ وہ اصول فن قواعد اردو اور مسائل املا پر گہری نظر رکھتے تھے ۔ خود پابندی سے عمل کرتے اور اپنے احباب و تلامذہ کو برابر توجہ دلاتے رہتے تھے ۔ اُس وقت یہ آواز نئی معلوم ہوتی تھی یا ایں ہمہ سب چونک گئے اور بعض اُس پر عمل پیرا بھی ہوگئے ۔ ہمارا خیال ہے کہ جب مصلحین زبان کا تذکرہ آئے گا تو مولانا کا نام نامی بھی ضرور لیا جائے گا ۔ موصوف نے اپنی تحریروں میں جن امور پر بار بار اصرار کیا ہے ان میں سے چند یہ ہیں :

بے ضرورت غیر مانوس عربی و فارسی الفاظ و تراکیب سے پرہیز کیا جائے ۔

زبان اور محاورے میں صحت کا خیال لازم ہے ۔ البتہ جو الفاظ غلط العام ہیں (غلط العوام نہیں) ان کو اردو کا تصرف جاننا اور فصیح ماننا چاہئے ۔

جو بولو وہ لکھو - یعنی تحریر تلفظ کی پابند ہو ۔

املا کے سلسلے میں مولانا کا فتویٰ یہ تھا کہ مرکبات کو حتی الامکان توڑ کر لکھا جائے مثلاً ستمگر کی جگہ ستم گر۔ ہندی میں ہائے مختفی کا وجود نہیں ہے۔ لہٰذا اس کے بدلے الف تحریر کیا جائے جیسے راجہ کی جگہ راجا۔ تم ہی کو، تمھیں، چاہئے کو چاہیے (بغیر ہمزہ) تحریر میں لایا جائے۔ علیٰ ہذا نون ظاہر اور نون غیر ظاہر کا فرق، ہائے مخلوط، یائے ماقبل مفتوح کی خاص شکل ملحوظ رکھی جائے تاکہ التباس کی گنجایش نہ رہے۔ وغیرہ وغیرہ

اِن شواہد کے پیش نظر یہ دعویٰ ہرگز مبالغہ نہیں کہ مولانا احسن کی زندگی کا ہر لمحہ دوسرے فرائض کے ساتھ ساتھ اردو ہی کی خدمت میں بسر ہوا۔ وہ اردو ہی کے لئے جئے اور اسی کی دھن میں اپنے پیدا کرنے والے سے جاملے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔ ہوگئی کہ مرض الموت کی شدت میں وفات سے کچھ روز پہلے جب پروفیسر رشید احمد صدیقی ان کی عیادت کو آئے تو مولانا نے از سے ان کی تازہ تصنیف دیکھنے کا کمال اشتیاق ظاہر کیا۔

ایڈیٹر : عبدالرزاق قریشی

پرنٹر پبلشر سید شہاب الدین دسنوی نے ادبی پرنٹنگ پریس ، ۸ ، شیفرڈ روڈ ، بمبئی ۸ ، میں چھپوا کر ، مالکان انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ، ۹۲ ، دادا بھائی نوروجی روڈ ، بمبئی ۱ ، کے لئے شائع کیا۔

Publications of the Islamic Research Association, Bombay

1. **Diwan of Khaki Khorasani.** Persian text, edited by W. Ivanow. Rs. 6-00

2. **Two Early Ismaili Treatises (Haft Babi Baba Sayyidna and Matlubu'l-Mu'minin)** by Nasiru'd-din Tusi. Persian text, edited by W. Ivanow. Rs. 4-00

3. **True Meaning of Religion (Risala Dar Haqiqati Din)** by Shihabu'd-din Shah. Persian text, with English translation by W. Ivanow. Rs. 4-00

4. **Kalami Pir**, or **Haft Babi Sayyid Nasir.** Persian text, edited and translated into English by W. Ivanow. Rs. 7-50

5. **Arabon-ki Jahaz-Rani (Arab Navigation)** by Syed Sulaiman Nadwi. In Urdu (Revised Edition). Rs. 6-00

6. **The Book of Truthfulness (Kitab al-Sidq)** by Abu Sa'id al-Kharraz. Arabic text, edited and translated by A. J. Arberry. Rs. 4-00

7. **Al-Hidayatu'l-Amiriya.** Arabic text, edited by Asaf A. A. Fyzee. Rs. 5-00

8. **Islamic Research Association, Miscellany, Volume I,** edited by Asaf A. A. Fyzee, Rs. 12-50

9. **The Nuh Sipihr of Amir Khusraw.** Persian text, edited by Mohammad Wahid Mirza. Rs. 15-00

10. **Kitabu'l Kashf of Ja'far B. Mansuri'l Yaman.** Arabic text, edited by R. Strothmann. Rs. 25-00

ملنے کا پتہ:

ادبی پبلشرس، ۸ شیفرڈ روڈ، بمبئی ۸

Adabi Publishers, 8, Shepherd Road

BOMBAY-8

Nawa-e-Adab

A QUARTERLY JOURNAL OF

THE ANJUMAN-I-ISLAM URDU RESEARCH INSTITUTE

Annual Subscription :

Inland & Pakistan : Rs. 6 Foreign : Shillings 12
(inclusive of postage)

Price per copy: Rupee one & Paise fifty

[Vol. 22 1971 APRIL - JUNE No. 2]

All remittances to be made to

THE ADABI PUBLISHERS

8 Shepherd Road, Bombay 8 (India)

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

کا

سہ ماہی رسالہ

نوائے ادب

ناشر

ادبی پبلشرس (شعبۂ اشاعت انجمن اسلام) بمبئی ۸

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

(بمبئی یونیورسٹی سے ملحق)

کے

اغراض و مقاصد

۱. ایم اے کی تعلیم کا انتظام
۲. پی ایچ ڈی اور دوسرے تحقیقاتی کام کرنے والوں کی اعانت ۔
۳. تحقیقاتی کام کرنے والے اداروں اور جامعوں سے تعاون ۔
۴. ایک جامع کتب خانہ کا قیام ۔
۵. مختلف کتب خانوں کے اردو کے مخطوطات کی فہرست کی ترتیب ۔
۶. نایاب مخطوطات و مطبوعات کی اشاعت
۷. اردو سے متعلق ایک علمی و تحقیقاتی سہ ماہی رسالہ کا اجراء ۔

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

کے

سہ ماہی رسالہ نوائے ادب کی خصوصیات

۱. اردو زبان و ادب سے متعلق مختلف پہلوؤں پر بحث و تحقیق ۔
۲. گجرات و دکن کی غیر مطبوعہ اردو تصانیف کی اشاعت
۳. اردو سے تعلق تحقیقاتی کاموں کی اطلاع ۔
۴. اردو کے علمی و ادبی رسائل کے مضامین کی تلخیص و اشاعت ۔

رسالہ سال میں چار بار شائع ہوگا

جنوری اپریل جولائی اکتوبر

چندہ سالانہ :- چھ روپے
فی پرچہ :- ڈیڑھ روپیہ
} مع محصول ڈاک

ایڈیٹر: عبدالرزاق قریشی

ترسیل مضامین و خط و کتابت

ڈائرکٹر

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

۹۱. دادا بھائی نوروجی روڈ

بمبئی ۱

خریداری و ترسیل زر

ہندوستان میں :-

ادبی پبلشرز

۸ شیفرڈ روڈ ، بمبئی ۸

نواے ادب بمبئی

تاریخ اشاعت ۱۵ اکتوبر ۱۹۷۱ع

جلد ۲۲ — اکتوبر ۱۹۷۱ — شمارہ ۴

شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ	حسینی شاہد	۱
۲	تاریخ کتابت متن	تنویر احمد	۴۵
۳	انشاے اردو	خواجہ احمد فاروقی	۶۷
۴	نقد ابوالکلام	عبد الحلیم ساحل	۷۳
۵	تبصرے		

٭ ڈاکٹر حسینی شاہد

سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ

سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ نہ صرف اپنے زمانے کے شیخ کامل اور ولیء واصل تھے بلکہ سلوک و طریقت کے میدان میں بھی عہد آفرین شخصیت کے مالک تھے۔ وہ دودمان شمس العشاق کے روشن چراغ، صوفیائے چشت اہل بہشت کی آبرو اور بوستان بندہ نواز کے گل سرسبد تھے۔ جنوبی ہند میں خواجہ بندہ نواز گیسودراز کے بعد صوفیائے چشت کا فیض انہیں کے دم سے جاری تھا۔ انہیں کے توسط سے کعبۂ[1] دکن کا فیضان آندھرا، مہاراشٹرا، کرناٹک اور تاملناڈ کے گوشے گوشے میں ایسا عام ہوا کہ زنّار میں تسبیح کے دانے جگمگانے لگے اور خانقاہوں میں پانچ عناصر پچیس گن کا طوطی بولنے لگا۔

نام :

دارالسرور بیجاپور کے اس روحانی تاجدار کا نام سید امین الدین علی تھا۔ ان کے نام کے ساتھ اعلیٰ کا اضافہ بہت بعد میں ہوا جب کہ اس نام کے دوسرے بزرگوں سے امتیاز کی ضرورت پیش آئی۔ حضرت کے اور ان کے خلفاء کے خاندانوں میں احترام، عقیدت اور برکت کے خیال سے امین الدین اور امین الدین علی کے نام بارہا دہرائے گئے ہیں اور آج بھی دہرائے جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کی پانچویں اور ساتویں پشت میں جو سجادہ نشین ہوئے ہیں ان کے نام بھی امین الدین علی تھے۔ ان تینوں بزرگوں میں امتیاز کرنے کے لئے حضرت کے نام کے ساتھ اعلیٰ اور امین الدین علی بن بابا شاہ حسینی عرف حسینی پیر کے نام کے آخر میں ثانی بڑھا دیا گیا اور امین الدین علی بن سید محمد حسینی کے نام سے پہلے ثانی

---

۱ نیست کعبہ در دکن جز درگۂ بندہ‌نواز   بادشاہ دین و دنیا تا ابد گیسو دراز

---

* ڈاکٹر حسینی شاہد، ام، اے؛ پی اچ۔ ڈی؛ پرنسپل اردو آرٹس کالج، حیدرآباد؛ رکن سینٹ، عثمانیہ یونیورسٹی۔ حیدرآباد، رکن ساہتیہ اکیڈمی، آندھرا پردیس، حیدرآباد وغیرہ۔

لکھنے لگے ۔ یعنی انہیں علی الترتیب امین الدین علی اعلیٰ ، امین الدین علی ثانی اور ثانی امین الدین علی لکھا جانے لگا ۔ علی اور اعلیٰ قریب المخرج ہیں ۔ غالباً اسی لئے حضرت کے نام سے علی کا لفظ متروک ہوگیا اور انہیں عام طور پر امین الدین اعلی لکھنے اور بولنے لگے ۔

امین الدین علی اعلی کو ان کے سلسلے کے بزرگ اور عقیدت مند معشوق ربانی ، معشوق سبحانی ، محبوب سبحانی ، قطب ربانی ، علیء ثانی ، ولیء ہردو جہانی قطب الحق ، حقیقت آگاہ ، غفران پناہ ، ہادیء دوجہاں ، آفتاب علم و یقین ، علی الحق والدین ، ولیء ازل ، معشوق لم یزل ، شمس العشاق ، شمس العاشقین ، امام الواصلین اور شیر خدا کے القاب سے یاد کرتے رہے ہیں ۔ ان میں شیر خدا کو سب سے زیادہ مقبولیت ہوئی اور یہ لقب ان کے نام کا جزو بن گیا ۔ آج بھی لوگ انہیں امین الدین اعلی شیر خدا کے نام سے ہی یاد کرتے ہیں ۔

تخلص :

امین الدین علی اعلی امین تخلص کرتے تھے ۔ کہیں کہیں پورا نام امین الدین بھی تخلص کے طور پر باندھا ہے :

میں امین میرا نام کیا ہے شاہدی سوں کام[۱]

آکھے امیں خادم کمیں دم دم سرن گل بر زمیں
مقبول ہو گفتار امیں برہان بن میراں اُپر[۲]

ایک غزل میں تخلص ہی ردیف کے طور پر استعمال کیا ہے :

تمت کیا یک غزل میں ابیات خامی پنج دہ
مفہوم کر ستار ہو نا عیب جو ہونا امیں[۳]

سب سوں بن سب آپ ابھیمان دیکھو آپ پچھان
برہان مکمل صورت میان استے قائم قرب مکان
آکھے شاہ امین دین روپ روپ بھرپور اپیں ندھان[۴]

---

۱ سید شاہ امین الدین علی اعلی ، قربیہ ، مخطوطہ ۹۸ تصوف ، کتب خانۂ سالار جنگ ، حیدر آباد
۲ سید شاہ امین الدین علی اعلی ، مدح جائم ، بیاض قلمی مملوکہ راقم الحروف
۳ ایضاً ، غزل
۴ ایضاً ، حقیقت

نسب اور خاندان :

انوارلاخیار ، مشکواۃ النبوۃ ، تذکرۃ القادری ، حدیقۂ رحمانی ، محبوب ذی المنن اور تذکرۃ الانساب کی بموجب امین الدین علی اعلی صحیح النسب سید تھے ۔ ان کے والد سید شاہ برہان الدین جانم اور دادا میراں جی شمس العشاق دونوں صاحب علم و عرفان بزرگ ہوئے ہیں اور ان سے خلق اللہ کو بڑا فیض پہنچا ہے ۔ میراں جی کی ایک مختصر خود نوشت ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد، میں محفوظ ہے ۔ اس میں انھوں نے اپنے والد کا نام حاجی شریف دوام الدین بتایا ہے ۔ وہ مکۂ معظمہ کے رہنے والے تھے لیکن شادی ہندوستان میں کی تھی ۔ میراں جی مکۂ معظمہ ہی میں پیدا ہوئے ۔[1] انھوں نے خود نوشت میں اپنا نسب نامہ بھی دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا سلسلہ تیرہ واسطوں[2] سے زید شہید سے اور سترہ واسطوں[3] سے حضرت علی کرم اللہ وجہ سے ملتا ہے ۔

تذکرۃ الانساب سادات سکنۂ بیجاپور اور مجمع الانساب کے مرتبین کو امین الدین علی اعلی کی سیادت سے اختلاف ہے ۔ صاحب تذکرۃ الانساب لکھتا ہے :

> « بدان کہ از ثقات بہ ثبوت پیوستہ کہ شاہ امین الدین بیجاپوری قدس سرہ از قدیم الایام در اہل بیجاپور از قوم مغل مشہور و معروف ہستند ۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال ۔»[4]

صاحب مجمع الانساب نے سید محمد حسینی بن سید امین الدین ثانی سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ تک نسب نامہ دینے کے بعد لکھا ہے :

> « این نسب نامہ بر رسالۂ دکنی کہ از بزرگان صاحب حسینی بود ، مرقوم شدہ بود ۔ درویشی آن رسالہ را بتاریخ دہم جمادی الاول سنہ

---

۱ میراں جی شمس العشاق ، خود نوشت و نسل نامہ ، مخطوطہ ۸۶۳ ، ادارۂ ادبیات اردو ، حیدر آباد خودنوشت کا دوسرا نسخہ کتب خانۂ درگاہ شریف میں اور تیسرا نسخہ کتب خانۂ آصفیہ ، حیدر آباد ، (۱۶۹ فلسفہ) میں محفوظ ہے ۔

۲ واسطوں میں اختلاف ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی ۔

۳ میراں جی شمس العشاق اور حضرت علی کے درمیان جو طویل مدت ہے اس کے پیش نظر سترہ واسطے بظاہر بہت کم معلوم ہوتے ہیں ۔

۴ تذکرۃ الانساب سادات سکنۂ بیجاپور ، مخطوطہ مملوکہ سید عبداللطیف پیر قادری ، کرنول ۔

۱۲۱۷ھ نزد این جانب آورده بود . از آن رساله نقل نموده شد . از این نسب‌نامه معلوم شد که ایشان سادات حسینی اند و از قدیم الایام در اہل بیجاپور مشہور است که شاه امین الدین صاحب از زمرهٔ قوم مغل اند . والله اعلم بحقیقت حال . »[1]

تذکرة الانساب سادات سکنه بیجاپور اور مجمع الانساب کے ان بیانات کی کسی اور ذریعه سے توثیق نہیں ہوتی .

ننھیال :

امین الدین علی اعلیٰ کی ددھیال[2] کی تفصیلات تو مل جاتی ہیں لیکن ان کی ننھیال کے بارے میں تذکرے خاموش ہیں . شجروں میں بھی ان کا سلسلۂ مادری نہیں ملتا . لیکن راقم الحروف کو تحقیقات کے دوران پته چلا ہے که حضرت کی والدهٔ ماجده کا نام بی‌بی میمونه عرف چاند صاحب بی تھا اور وه میراں شاه سید مصطفیٰ قادری معشوق الٰہی کی صاحبزادی تھیں .

میراں شاه سید مصطفی قادری[3] کے والد بدر الدین بدر عالم سید حبیب الله قادری بیدر کے مشاہیر شیوخ سے تھے . ان کے دادا سید عبد القادر یوسف بغداد سے دکھن آئے اور بیدر میں سکونت پذیر ہوگئے . وه حضرت محبوب سبحانی محی الدین عبد القادر جیلانی کی اولاد سے تھے . سلسلۂ نسب یه ہے :

میراں شاه سید مصطفی قادری معشوق الٰہی بن بدرالدین بدر عالم سید حبیب الله قادری بن سید عبدالقادر یوسف ثانی بن سید شمس بهاء الدین عارف بن سید یونس الثانی بن سید عبد الرحمن اشرف جہانگیر بن سید یونس شرف جہاں بن سید یوسف حاجی الحرمین بن سید احسن الدین بن سید محمد صنو احمد بن سید ابی نصر محی الدین

---

۱ سید محی الدین قادری ، مجمع الانساب ، مخطوطه ، کتب خانهٔ گچی محل ، بیجاپور

۲ ملاحظه ہو راقم الحروف کا مضمون ‹ میراں جی شمس العشاق › مطبوعه نوائے ادب ، بمبئی ، جلد ۲۲ ، شماره ۲ (۱۹۷۱ع)

۳ میراں شاه سید مصطفیٰ قادری کے حالات مشکوٰة النبوه ، تذکرهٔ اولیا ، تذکرة القادری حدیقهٔ رحمانی ، برکات الاولیا اور محبوب ذی‌المنن وغیره میں ملتے ہیں . راقم الحروف کے پیش نظر ان تذکروں کے علاوه تذکرهٔ اولیائے بیجاپور مؤلفه سید مرتضیٰ قادری (غیرمطبوعه) بھی ہے .

بن سید عماد الدین ابی صالح نصر بن تاج الدین سید عبدالرزاق بن سلطان الاولیاء میران میر ، پیران پیر غوث الاعظم دستگیر سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہم اجمعین[۱]

بدرالدین بدر عالم سید حبیب اللہ قادری کے تین[۲] صاحبزادے میراں شاہ سید ابوالحسن قادری تجلی ربانی،[۳] میراں شاہ سید مصطفی قادری معشوق الہی اور میراں شاہ سید قاسم قادری[۴] تھے . تذکروں میں ان کی کسی صاحبزادی کا ذکر نہیں ملتا . لیکن

---

۱ شجرۂ خاندانی ، قلمی ، مملوکہ سید شاہ مرتضی قادری ، سجادہ نشین گمھی محل ، بیجاپور .

۲ سید شاہ مرتضی قادری ، تذکرہ اولیائے بیجاپور (غیر مطبوعہ)

تذکروں میں اول الذکر دو صاحبزادوں کے نام ملتے ہیں . میراں شاہ سید قاسم قادری کو ہم جد بتایا جاتا ہے . (روضۃ الاولیا) لیکن سید شاہ مرتضیٰ قادری کا بیان ہے کہ وہ سید مصطفیٰ قادری معشوق الہی کے سب سے چھوٹے بھائی تھے .

۳ شاہ ابوالحسن قادری تجلی ربانی (متوفی ۱۰۴۵ھ) بدرالدین بدرعالم سید شاہ حبیب اللہ قادری کے بڑے صاحبزادے تھے . انھیں بیعت و خلافت اپنے والد سے حاصل تھی . ابراہیم عادل شاہ جگت گرو کے عہد میں اپنے خاندان کے ساتھ بیدر سے بیجاپور آئے اور یہیں انتقال کیا . وہ اپنے عہد کے بہت بڑے صوفی اور صاحب تصرف بزرگ تھے . تذکروں میں ان کی کئی کرامتوں کا ذکر ملتا ہے . ان کی ایک مثنوی سکھ انجن ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد ، میں محفوظ ہے جس میں بچوں کے مشہور کھیل آنکھ مچولی کے ذریعہ تصوف کے مسائل سمجھائے گئے ہیں .

۴ نام محمد فضل اللہ ، کنیت ابوالمحاسن اور لقب شاہ قاسم تھا . خلاصۃ القاسمی کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت بغرض سیاحت بیدر سے پورب کی جانب گئے اور وہاں حضرت شاہ دلاور قادری سے صوری اور معنوی نعمتیں حاصل کیں . ابراہیم عادل شاہ جگت گرو کے عہد میں بیجاپور آئے اور جید خاں کی مسجد میں معتکف ہوئے . یہیں ۲۷ محرم سنہ ۱۰۳۲ھ کو انتقال کیا . صحن مسجد میں دفن ہیں . مرنے سے ایک مہینہ پہلے اپنے بھتیجے سید عبدالقادر قادری ابن سید مصطفیٰ قادری معشوق الٰہی کو اپنا خلیفہ اور جانشین مقرر کیا . شاہ قاسم کو جدید نعمت و خلافت اپنے منجھلے بھائی سید مصطفی قادری سے حاصل تھی . کسی نے تاریخ کہی ہے :

شاہ قاسم عمدۂ اولاد غوث　　در ہزار و سی و دو رفت از جہان
گفت تاریخ وصالش با ادب　　شاہ قاسم قادری قطب جہان

باقی ـــ

راقم الحروف کو پتہ چلا ہے کہ محمود خوش دہاں بلطف معبود ان کے نواسے[1] تھے جس سے صاف ظاہر ہے کہ متذکرہ صدر صاحبزادوں کے علاوہ ان کے کم از کم ایک صاحبزادی بھی تھیں جو شیخ داؤد[2] قریشی سے بیاہی گئیں اور ان کے بطن سے محمود خوش دہاں پیدا ہوئے۔

میراں شاہ سید مصطفی قادری معشوق الٰہی کو بیعت و خلافت اپنے والد ماجد سے حاصل تھی۔ اس کے علاوہ وہ اپنے بڑے بھائی میراں شاہ سید ابوالحسن قادری تجلی ربانی اور پیر محمد لطف اللہ سے بھی ارادت و اجازت رکھتے تھے۔[3]

پیر بادشاہ سجادۂ سالگندہ کے مملوکہ شجرے میں ان کے بارے میں لکھا ہے:

> «او در زمان فرمانروائی سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی المشہور جگت گرو در سال دویم از جلوس وی بہ اتفاق برادر کبیر خویش میران شاہ ابوالحسن قادری قدس سرہ با قبائل از صوبۂ محمدآباد، بیدر، بہ بیجاپور تشریف آوردند و در اندرون شہرپنـــاہ در سی‌بازار متصل انبارخانۂ شاہی سکونت فرمودند. بعد چندی مدت آنحضرت در سیزدہم

بقیۂ ص ۵

ان کے انتقال کے بعد سلطان محمد عادل شاہ نے دو حویلیاں تعمیر کروائیں۔ ایک اندرون احاطـــۂ درگاہ واقع ہے، یہ شیخ محمد مجاور کے حصے میں آئی۔ دوسری درگاہ شریف کے بڑے دروازے کے روبرو واقع ہے۔ یہ سید عبد القادر قادری ابن سید شاہ مصطفی قادری کو نذر کی۔ یہی حویلی گچی محل کہلاتی ہے۔

اس خانوادے کے کئی شجرے بیجاپور، سالگـندہ، جنتکل خورد، کمپلی، عرس اور حیدرآباد میں راقم الحروف کی نظر سے گذرے ہیں، لیکن کسی میں شاہ قاسم کا نام نہیں ملا۔ البتہ بعض شجروں میں فضل اللہ کا نام ملتا ہے۔

۱ سید محی الدین قادری، مجمع الانساب، مخطوطۂ کتب خانۂ گچی محل، بیجاپور

سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ، خلافت نامـۂ بابا شاہ حسینی، جس کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔

۲ محمود خوش دہاں کی ایک تصنیف کتب خـانۂ درگاہ شریف میں محفوظ ہے جس میں وہ اپنے والد کا نام بھی بتاتے ہیں:

> «فقیر حقیر الراجی الی اللہ المعبود شیخ محمود ابن شیخ داؤد قریشی»
>
> خلاصۃ الارشاد، مخطوطہ ۱۸، کتب خانۂ درگاہ شریف

۳ سید مرتضی قادری، تذکرۂ اولیاے بیجاپور (غیر مطبوعہ)

ماہ شعبان معظم رحلت فرمودند و مرقـــد شریف وی بیرون حصـار بلدۂ بیجاپور متصل آقاپور[۱] قریب چوکھنڈی برادر بزرگوار شاہ ابوالحسن قادری طرف شرق بر چبوترہ گچی و سنگی علیحدہ واقع است و قبر بی بی صاحبہ کہ زوجۂ محترمۂ آنحضرت اند در پہلوی قبر بر ہمان چبوترہ آنحضرت بجانب شرق واقع است۔»

ان کے خلفاء میں شاہ قاسم، شاہ عبدالرزاق، شیخ حمیداللہ، شیخ صاحب یلارتی، شیخ اسماعیل محدث اور شیخ ابوالمعالی مشہور ہوئے ہیں۔[۲]

شاہ صاحب شیخ کامل اور عارف واصل تھے۔ دنیا اور اہل دنیـا سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے تھے۔ رئیسوں اور بادشاہوں سے احتراز کرتے اور ان سے میل ملاپ ناگوار خاطر گذرتا تھا۔ گوشہ نشینی اور فقر و فاقـہ عزیز تھا۔ آٹھوں پہر یادِ الٰہی اور استغراق و محویت میں بسر ہوتے تھے۔

بادشاہ وقت ابراہیم عادل شاہ ثانی کو ان سے بڑی عقیدت تھی لیکن شرف نیـاز کا موقع ہی نہیں ملتـا تھا۔ جب بھی اجازت چاہی نفی میں جواب ملا۔ شاہ صاحب کے ایک مرید خاص کو، جو دربار رس بھی تھا، بادشاہ کے حال پر ترس آیا اور اس نے بادشاہ سے کہا کہ حضرت بعد نماز فجر اوراد و وظائف میں مشغول رہتے ہیں اور اس وقت حجرے کا دروازہ کھلا رہتا ہے، دیدار کی سعادت کا بس یہی ایک موقع ہے۔ بادشاہ شوق ملاقات کے ہاتھوں مجبور تھا۔ ایک دن اسی وقت حاضر ہوا۔ لیکن شاہ صاحب نے کچھ التفات نہ کیا۔ اسی مرید خاص نے جرأت کی اور توجـہ دلائی کہ بادشاہ سلامت آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ شاہ صاحب نے ابراہیم کو مخاطب کرکے پوچھا: «فقیر کے حجرے میں بادشاہ کا کیا کام؟» ابراہیم نے دست‌بستہ عرض کیا: «دیدار کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں»۔ شاہ صاحب نے ٹکا سا جواب دیا: «تو وہ حاصل ہوا، اب سدھارو» بادشاہ نے جسارت کرکے عرض کیا: «دیدار تو نصیب ہوا لیکن کرامت کا طالب ہوں» شاہ صاحب پر جلال کی کیفیت طاری ہوئی اور وہ چھت کو گھورنے لگے۔ یکایک ایک شعلۂ نور بادشاہ اور شاہ صاحب کے درمیان پیدا ہوا جس سے بادشاہ کی نظریں خیرہ ہوگئیں۔

---

۱ سہو کتابت ہے، صحیح نام اللہ پور ہے۔

۲ سید مرتضی قادری، تذکرۂ اولیاے بیجاپور (غیر مطبوعہ)

جب جلال کی کیفیت ایک ذرا کم ہوئی تو شاہ صاحب نے کہا : « ان گوشہ نشینوں کو جو دنیا سے منہ موڑ چکے ہیں کیوں امتحان میں ڈالتے ہو ۔ بہتر ہے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو اور ان کے اوقات میں خلل نہ ڈالو ۔ »

کہتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد شاہ صاحب نے اپنے حجرے کے باہر قدم نہیں رکھا اور آٹھویں دن ۱۳ شعبان سنہ ۱۰۱۴ھ کو وصال فرمایا ۔

شاہ صاحب کی بیوی بی بی جمال صاحب بیدر کے ولیء واصل حضرت شمس الدین محمد ملتانی[1] کی اولاد سے تھیں جن کے بطن سے ایک صاحبزادے سید عبدالقادر قادری اور ایک صاحبزادی بی بی میمونہ عرف چاند صاحب تھیں ۔

کتب خانۂ گچی محل میں ایک بیاض محفوظ ہے جس میں بعض مشائخین گچی محل کے حالات درج ہیں ۔ اس بیاض میں حسب ذیل تحریر بھی ملتی ہے :

> « حضرت میراں سید شاہ مصطفی قادری معشوق الہی برادر حقیقیء حضرت سید شاہ ابوالحسن قادری و میراں سید شاہ قاسم قادری فرزندان صلبیء حضرت بدرالدین بدر عالم حبیب اللہ قادری البدری ، نام زوجہ بی بی جمال صاحبہ از اولاد حضرت شمس الدین محمد ملتانی البدری ۔ از بطنش یک فرزند و یک دختر متولد شدند ۔ نام فرزند حضرت سید عبدالقادر قادری ، نام دختر بی بی میمونہ عرف چاند صاحبہ بی ۔ نام شوہر برہان الدین جانم ابن میرانجی شمس العشاق ۔ از بطنش بسیار

---

۱ محمد نام ، ابو الفتح کنیت اور شمس الدین لقب تھا ۔ شیخ ابراہیم ملتانی کے صاحب زادے اور مادرزاد ولی تھے ۔ مولد و منشا بیدر تھا ۔ ۸۶۲ ھ میں پیدا ہوئے ۔ شیخ حسن خان بنگالی کے مرید اور شیخ بہاء الدین انصاری دولت آبادی کے خلیفہ تھے ۔ صاحب مشکواۃ نے ان کے وصال کا سنہ ۹۲۵ھ ، مؤلف محبوب ذی المنن نے ۹۴۰ھ اور مادۂ تاریخ « بمولیٰ گشتہ واصل » لکھا ہے ۔ مخدوم جی شیخ محمد ابراہیم ان کے خلف اکبر تھے ۔ ابراہیم قطب شاہ ان کا بڑا معتقد تھا اور چاہتا تھا کہ شاہ صاحب گولکنڈہ تشریف لائیں ۔ مخدوم جی نے انکار کردیا ۔ سلطان نے کہلا بھیجا کہ نعلین ہی بھیج دیں ۔ مخدوم جی نے جواب دیا کہ سلاطین درویشوں سے دعا چاہتے ہیں ۔ میں آپ کو تمام مسلمانوں کے ساتھ دعا میں شریک کرتا ہوں اور بس » البتہ اپنے مرید ملا قطب الدین فیروز کو گولکنڈہ بھیج دیا ۔ یہی وہ فیروز ہے جس کی استادی کا لوہا وجہی اور نشاطی نے مانا ہے ۔ اس کی مثنوی پرت نامہ مشہور ہے ۔

بنین و بنات تولد گردیدند و یک فرزند که سراج خانـــدان سیادت[1] و ولایت که اسمش سید امین الدین اعلیٰ بود باقی ماند و از مشاہیر اولیای زمانه شد که طبل ولایت این فرزند ارجمند در چار دانگ عالم نواخت و مخلوق کثیر از دامن تربیت وی نونہال باغ محمدی و گل سر سبد بوستان حیدری صراط مستقیم را گرفت.

کاتب سید قطب الدین قادری

المرقوم ۲۲ ماہ محرم الحرام ۱۱۹۱ ہجرۃ المقدسہ.»

اس رشتے کی توثیق «امین العرفان» اور خلافت نامۂ سید بابا شاہ حسینی سے بھی ہوتی ہے. امین العرفان ایک مختصر فارسی رسالہ ہے جس کی تمہید میں حضرت امین الدین علی اعلیٰ نے اپنے نانا اور دادا کا ذکر کیا ہے:

الحمد للہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین والصلواۃ والسلام علیٰ رسولـہ الکریمین صاحب قاب قوسین، مجمع البحرین، جامع الکونین وعلی آلـہ واصحابہ وازواجہ اجمعین. اما بعـــد می‌گوید بندۂ متین سید امین الدین نبیرۂ قطب اطلاق میرانجی شمس العشاق و بنـدۂ سرتاج معشوق الہـی حضرت میراں سید شاہ مصطفی قادری معشوقان الہی ابن سید بدرالدین بدرالعالم حبیب اللہ قادری....»[2]

خلافت نامہ کا ذکر آگے آئے گا.

پیدایش:

امین الدین علی اعلی کے حالات زندگی خوارق و کرامات کی آب و تاب کی

---

۱ یہ تحریر سنہ ۱۱۹۱ھ کی ہے اور کتب خانۂ گچی محل کی مخزونہ ایک بیاض میں ہے قیاس غالب ہے کہ اس کا لکھنے والا خانوادۂ گچی محل ہی سے تعلق رکھتا ہوگا. لیکن تعجب ہے کہ مجمع الانساب کے مؤلف سید محی الدین قادری (متوفی ۱۲۴۷ھ) جو میراں شاہ مصطفیٰ قادری کی اولاد سے ہیں، ۴۸ سال بعد (مجمع الانساب کا سن تالیف ۱۲۳۹ھ ہے) امین الدین علی اعلی کی سیادت سے اختلاف کرتے ہیں. تذکرۃ الانساب سادات سکنۂ بیجاپور البتہ اس تحریر سے دو سال پہلے یعنی ۱۱۸۹ھ میں لکھی گئی ہے لیکن یہ بات پھر بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ اتنے قریبی زمانوں کی تحریروں میں ایسا شدید اختلاف کیوں ہے!

۲ سید شاہ امین الدین علی اعلی. مکتوب سید امین الدین علی خواجہ، موسوم بہ امین العرفان، مخطوطہ مملوکہ سید امین الدین جاگیردار جمال پور، عرس، ورنگل. اس کا ایک نسخہ کتب خانۂ گچی محل میں بھی محفوظ ہے.

وجہ سے کچھ ایسے دھندلا گئے ہیں کہ پیدایش سے موت تک کوئی بات وثوق کے ساتھ کہنی مشکل ہوجاتی ہے ۔ ان کی پیدایش سے متعلق ایک مثنوی امین نامہ ہے[۱] جس کے مصنف کا بیان ہے کہ شاہ برہان الدین جانم ایک رات عالم رویا میں بارگاہ بندہ نواز میں حاضر ہوئے ۔ جانم پر نظر پڑتے ہی بندہ نواز سرو قد اٹھ کھڑے ہوئے اور آگے بڑھ کر ان کا خیر مقدم کیا ۔ محفل میں جو خاص و عام موجود

---

۱ خداوند شاہ ، امین نامہ ، مخطوطہ ، کتب خانۂ درگاہ شریف بیجاپور

امین نامہ کا دوسرا نسخہ پروفیسر آغا حیدر حسن کے کتب‌خانے میں اور تیسرا کتب خانۂ سالارجنگ میں ہے ۔ سید محمد بیدری کے ہاں ایک وصلی ہے جس پر اس مثنوی کے بیس متفرق شعر نقل ہیں ۔ انہوں نے ایک تعارفی نوٹ کے ساتھ ان اشعار کو رسالۂ اردونامہ (کراچی) ، ۱۹٦۷ ع ، میں شائع کیا ہے ۔ وہ ان اشعار کو ایک مستقل نظم سمجھتے ہیں اور سلطان محمود کو اس نظم کا مصنف قرار دیتے ہیں جو ان کے بیان کے بموجب جانم کے خلیفہ تھے ۔ لیکن یہ نہ تو مستقل نظم ہے اور نہ اس کا مصنف سلطان محمود ہے ۔ جس شعر میں سلطان محمود کا ذکر آیا ہے وہ یہ ہے : خبر سن کو سلطان محمود نے ایا چل کو حضرت برہان کنے

یہاں سلطان محمود سے مراد سلطان محمد عادل شاہ ہے ۔ قطع نظر اس کے جانم کے کسی خلیفہ کا نام سلطان محمود نہیں تھا ۔ سید محمد صاحب نے غالباً سلطان محمود کو شیخ محمود خوش دہاں سے خلط‌ملط کر دیا ہے ۔

نصیرالدین ہاشمی مرحوم نے امین نامہ کے مصنف کا نام معصوم بتایا ہے ۔ لیکن یہ درست نہیں ہے ۔ اس مثنوی میں معصوم کا لفظ جس شعر میں آیا ہے وہ یہ ہے :

جو معصوم کے مو سونے اتنی بات	خشی ہو گئی سب مریداں کی ذات
(منہہ سنے)	(ن : خشی سوں پھو گی سب مریداں کی ذات)
(خوشی)

یہاں معصوم سے مراد امین الدین علی اعلیٰ ہیں ، معصوم تخلص نہیں ہے ۔

درگاہ شریف کے مخطوطے میں ایک شعر اس طرح ہے :

رسالہ تولد امو لک کلام	خداوند نے یوں کئے ہیں تمام

اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی کا مصنف خداوند ہے ۔ لیکن یہ خداوند کون ہیں؟ خداوند شاہ ، خداوند ہادی یا کوئی اور؟ یہ مسئلہ تحقیق‌طلب ہے

تھے انھیں بڑا اچنبھا ہوا اور انھوں نے بندہ نواز سے پوچھا کہ برہان الدین جانم کی اتنی تعظیم و تکریم میں کیا راز پوشیدہ ہے ۔ بندہ نواز نے فرمایا :

کئے شاہ سنو یار جانی تمیں　　که برہان کوں دیکھ اوٹھے نیں ہمیں
و لیکن جھلکت دسیا مجھ نظر　　و بے شک اتھا نور خیر البشر
محمد کا او نور دیکھا عیاں　　کیا اس پو قربان یو جیوجاں
اوسی نور میانے محمد امیں　　بیٹھے تھے او معشوق رب العالمیں
اونوں کوں یو تعظیم دئے تھے ہمیں　　اونوں کوں انگے جاکو لائے ہمیں

اور شاہ برہان الدین کو مخاطب کر کے کہا :

حسینی کئے شاہ برہان دین　　تیرے پیٹ میں ہے یو حضرت امیں
تمیں ان کو جانو ولی العظیم　　ہمیں جس کوں بخشے دکھن کی زمیں

شاہ برہان الدین جانم نے لاعلمی کا اظہار کیا تو :

یکایک شکم میں سوں بولے امیں　　کہ میں ہوں خدا کا ولی العظیم
محمد کی مجلس میں حاضر ہوں میں　　علی کی ولایت میں ناظر ہوں میں
محمد حسینی ہیں گیسو دراز　　دو جگ میں کئے ہیں مجھے سرفراز
یو برحق دوجگ میں ہمارے ہیں پیر　　انن کی ولایت کا میں ہوں وزیر

تب شاہ برہان الدین جانم کو حقیقت حال سے آگاہی ہوئی اور انھوں نے دوسرے روز اپنے مریدوں کو خوشخبری سنائی ۔ شدہ شدہ بات سلطان ابراہیم[1] کے کانوں تک پہنچی ۔ اس نے شاہ برہان الدین جانم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ حضرت مجھے اس واقعہ پر یقین نہیں آتا :

کہے تب شکم میں سے حضرت امیں　　نکو کر توں برگشت اپنا یقیں
کتک روز بعد از کوں بھار آؤں گا　　بہوت گمرہاں کو سزا دیوں گا

سلطان بڑا حیران ہوا ۔ اسی رات نبیء کریم نے سلطان ابراہیم کو خواب میں بشارت دی :

محمد حسینی کا یو ہے وزیر　　میرے نور کا ہے وو کامل سریر
ہے برہان کے پیٹ میں یو رتن　　بجاپور اس کا اہے خوش وطن
علی کی ولایت کا سلطان ہے　　محمد امین اس کیرا ناؤں ہے

۱　سالار جنگ اور پروفیسر آغا حیدر حسن کے نسخوں میں سلطان محمود ہے ۔

اس واقعے کے کئی سال بعد ابراہیم کا انتقال ہوا اور تخت و تاج سلطان محمود[1] (سلطان محمد) کے حصہ میں آئے:

کتک روز بعد از کوں آئی اجل کہ سلطان ابراہیم گیا ویں نکل
اکابر سبی مل کو اس وقت کوں دئیے تخت سلطان محمود کوں
کہ سلطان محمود کے دور میں جو پیدا ہوئے شاہ دنیا منے[2]

ابھی حمل کا ساتواں مہینہ ہی تھا کہ شاہ برہان کو خدا کا حکم ہوا کہ تمہارے ہاں جو گنج اسرار ہے امین کو سونپ دو۔ شاہ برہان نے اپنے خلفاء سید محمود خوش دہاں، سید علی گنج گوہر، عاشق داول اور سب چھوٹے بڑوں کو طلب کیا اور اپنے سینے میں جو کچھ اسرار و رموز محفوظ تھے ان کے سامنے ہونے والے بچے کو سونپ دئے اور سید علی گنج گوہر سے کہا کہ امین کو تمہارے حوالے کرتا ہوں، جو کچھ تمہارے ہاں امانت ہے اس کے حوالے کردینا۔

سنہ پیدایش:

تمام جدید اور قدیم تذکرے متفق ہیں کہ امین الدین علی اپنے والد کے انتقال کے بعد پیدا ہوئے۔ انوار الاخیار کا بیان ہے کہ ان کی پیدایش[3] یکشنبہ کو ہوئی، تاریخ اور سنہ کسی تذکرے میں نہیں ملتا۔

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ لکھتی ہیں:

«تمام تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ شاہ امین اپنے والد کی وفات کے بعد پیدا ہوئے۔ اگر اس روایت کو صحیح مانا جائے اور شاہ برہان کی وفات کا سنہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی تحقیق کے مطابق سنہ ۱۰۶۸ھ تسلیم کیا جائے تو شاہ امین الدین کی ولادت سنہ ۱۰۶۸ھ میں ہوئی ہے۔ اس کو حکیم شمس اللہ قادری بھی مستند مانتے ہیں۔»[4]

---

۱ سلطان محمود کو اب تک اہل بیجاپور سلطان محمود کہتے ہیں۔

۲ یہ بیان درست نہیں معلوم ہوتا۔

۳ انوار الاخیار کا بیان ہے کہ فقرائے امین الدین علی اعلی ہر یکشنبہ اس خوشی میں جشن مناتے ہیں۔ یہ سلسلہ ان کی زندگی ہی میں شروع ہوگیا تھا جو بعد کو بھی جاری رہا۔

۴ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، اردو نثر کا آغاز اور ارتقاء، ص ۱۸۲ اس کے علاوہ ملاحظہ ہو ص ۱۶۱۔ ڈاکٹر رفیعہ نے ایک جگہ حضرت امین کا سنہ وفات بھی ۱۰۶۸ھ لکھا ہے (اردو نثر کا آغاز اور ارتقا، ص ۱۸) یعنی ان کے بیان کی بموجب حضرت امین ۱۰۶۸ھ کو پیدا ہوئے اور اسی سال انتقال کیا۔

مولوی عبدالحق نے کہیں بھی برہان الدین جانم کا سنہ وفات ۱۰۶۸ھ نہیں بتایا ہے۔ رسالۂ اردو میں انھوں نے ارشاد نامے کے سنہ تصنیف ۹۹۰ھ کو برہان الدین جانم کا سنہ وفات بھی قرار دیا ہے۔[1] لیکن «اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام» میں لکھا ہے کہ «ان کا انتقال اس سنہ کے بعد ہوا ہے۔»[2] ۱۰۶۸ھ کہیں نہیں لکھا۔ اس لئے اس سنہ کو شمس اللہ قادری کے مستند ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں ڈاکٹر رفیعہ کو یہ غلط فہمی کیسے پیدا ہوگئی۔ بہرحال ۱۰۶۸ھ امین الدین اعلی کا سنہ پیدایش یا برہان الدین جانم کا نہ سنہ وفات ہے اور نہ کسی تذکرہ نگار یا محقق نے اس کا ذکر کیا ہے۔

راقم الحروف کی تحقیق کے بموجب ان کی تاریخ پیدایش ۲۳ رمضان المبارک سنہ ۱۰۰۷ھ ہے۔ «پیر چشتیاں یو ہے» مادۂ تاریخ ہے۔ یہ مادۂ تاریخ بھی کتب خانۂ کچی محل سے دستیاب ہوا ہے اور صحیفۃ الہدیٰ کی پشت پر برہان الدین جانم کے سنہ وفات کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔ اصل عبارت یہ ہے:

> «تاریخ تولد حضرت خواجہ امین الدین علی اعلیٰ بیجاپوری ۲۳ رمضان المبارک ۱۰۰۷ھ مادۂ تاریخ ولادت وی اینست۔ پیرچشتیاں یوہے۔»

اس سنہ کی روشنی میں امین نامہ کا یہ بیان بھی غلط ٹھہرتا ہے کہ حضرت امین سلطان محمد عادل شاہ (۱۰۳۷ — ۱۰۶۷ھ) کے عہد میں پیدا ہوئے۔ وہ دراصل ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد میں پیدا ہوئے اور انھوں نے محمد عادل شاہ، علی عادل شاہ ثانی اور سکندر عادل شاہ کا ابتدائی زمانہ دیکھا تھا۔

استاد اور پیر:

امین الدین علی اعلی کے والد کا انتقال چونکہ ان کی پیدایش سے پہلے ہوچکا تھا اس لئے وہ اپنے والد سے اکتساب علوم ظاہری نہ کرسکے۔ یہ فرض ان کے بعض خلفا نے انجام دیا۔

امین الدین علی اعلی مادر زاد ولی تھے۔ ان کے ظہور سے پہلے ہی برہان الدین جانم نے اپنے خلفا سے کہہ دیا تھا کہ وہ ولی خدا کا ہے، ظہور کیا چاہتا ہے۔

---

۴ مولوی عبدالحق، شاہ برہان الدین جانم، رسالۂ اردو، جولائی ۱۹۲۷ء ص ۵۱۹

۵ مولوی عبدالحق، اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۶۳

ہم پردہ کرتے ہیں، دو شیر ایک جنگل میں نہیں رہ سکتے. اور خلفاء کو تاکید کی تھی کہ اس کے روبرو دکھنی رسائل اس طرح پڑھا کرو کہ اس کے کان میں رکعت پڑتی رہے[1] یعنی علم باطن تو وہی ہوگا لیکن علوم ظاہری کی تکمیل بھی ضروری ہے.

سید علی گنج گوہر:

تذکروں کے بموجب ان کے پیر تربیت تو محمود خوش دہاں تھے[2] اور انہوں نے اپنا خاندانی خرقۂ خلافت اپنے چچا خواجہ عطاء اللہ حسینی کے ہاتھ سے پہنا تھا[3] لیکن امین نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ برہان الدین جانم اپنے ہونے والے بچے کو سید علی گوہر کے حوالے کرگئے تھے:

بولا کر خلیفاں کو بخشے تمام جو کچھ گنج اسرار حق کا کلام
یو سید محمد اتھے خش دہاں جو سید علی گنج گوہر نشاں
جو عاشق داول کیتی یاد کر نہنے ہور بڑیاں کو بولا شاد کر
مریداں خلیفاں کوں بولے تمام یو نعمت بخشئے امین کو مدام
بھی سید علی کے حوالے کئے یو نعمت امانت رکھو کر کہے[4]

معظم کے بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے. وہ سید علی گنج گوہر کو سید صاحب گھر کہتا ہے:

خلیفے اتھے شہ کے سب نامور ولے ان میں سید تھے صاحب گھر
نگہ کرکے سید طرف دیک کر کہے تم امین کو سو بولو خبر
کہے ان کو سب راز بولو تمیں امین پر چھپی بات کھولو تمیں
امین علی پر یو کھولو تمام امین کو ہمارا یو بولو سلام
کلاہ اور شجرہ امین کو دئیے اوسی روز عالم سو رحلت کئے[5]

---

۱ شاہ غلام علی، مشکواۃ النبوۃ، مخطوطہ ۱۹۴ تذکرہ، کتب خانۂ آصفیہ، حیدرآباد

۲ سید محی الدین قادری، مجمع الانساب، مخطوطہ، کتب خانہ گچی محل، بیجاپور؛ محمد ابراہیم زبیری، روضۃ الاولیاء مخطوطہ ۲۶۶ تذکرہ، کتب خانہ آصفیہ. حیدرآباد

۳ عبد الجبار ملکاپوری، محبوب ذی المنن، حصہ اول، ص ۱۱۸؛ شاہ غلام علی، مشکواۃ النبوۃ، مخطوطہ ۱۹۴ تذکرہ کتب خانہ آصفیہ، حیدر آباد

۴ خداوند شاہ، امین نامہ، مخطوطہ، درگاہ شریف، بیجاپور

۵ شاہ معظم، شجرۃ الاتقیا، مخطوطہ ۱۲۱ تصوف، کتب خانہ آصفیہ، حیدرآباد

لیکن کسی تذکرے سے اس کی توثیق نہیں ہوتی۔

صاحب روضۃ الاولیاء کا بیان ہے:

«از خدمت عم بزرگوار خود حضرت خواجه عطاء الله قدس سره ارشاد و بیعت گرفته شب و روز در محویت و شهود و استغراق می‌بود.»[1]

صاحب مشکواۃ النبوۃ نے بیعت و خلافت کا ذکر نہیں کیا ہے البتہ اخبار الانوار کے حوالے سے لکھا ہے:

«گویند که آن کلاه مذکور که حضرت پدر ایشان نهاده فرموده بودند که این امانت امین الدین است از دست شاه عطاء الله حسینی که عم ایشان بودند پوشیدند. به تقدیرین خرقه و خلافت ایشان از روح شاه برہان الدین جانم است.»[2]

صاحب روضۃ الاولیاء کا بیان درست نہیں ہے اس لئے کہ امین الدین علی نے خواجہ عطاء اللہ حسینی سے بیعت و خلافت حاصل نہیں کی تھی۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ البتہ صاحب اخبار الانوار کا یہ بیان درست ہوسکتا ہے کہ خرقۂ خاندانی اور کلاہ والد بزرگوار خواجہ عطاء اللہ حسینی کے ہاتھوں پہنی ہو اور یہ بھی قرین قیاس ہے کہ خواجہ عطاء اللہ حسینی نے ظاہری تعلیم و تربیت میں حصہ لیا ہو اس لئے کہ والد کے انتقال کے بعد وہی ایک بزرگ خاندان تھے اور ددھیال کی طرف سے قریب ترین رشتہ رکھتے تھے۔

عطاء اللہ حسینی:

شاہ برہان الدین جانم کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کے بارے میں ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ وہ بڑے بھائی کے انتقال کے بعد عرصے تک زندہ رہے۔ انھوں نے ساری زندگی تجرد اور یاد خدا میں بسر کی۔ درگاہ امین الدین علی اعلیٰ کی بائیں طرف ذرا آگے کو ایک احاطہ میں دفن ہیں۔ قبر پر چوکھنڈی ہے۔ ان کے پہلو میں دو تین نو مولود بچوں کی قبریں ہیں۔ اس احاطہ میں اور بھی کئی چھوٹی بڑی قبریں ہیں۔ زمانۂ قدیم سے یہ دستور چلا آتا ہے کہ خاندان کے بچے اور ناکتخدا اس احاطے میں دفن کئے جاتے ہیں۔

---

۱ محمد ابراہیم زبیری، روضۃ الاولیا، مخطوطہ ۲۶۶ تذکرہ، کتب خانہ آصفیہ، حیدرآباد

۲ شاہ غلام علی، مشکواۃ النبوۃ، مخطوطہ ۱۹۷ تذکرہ، کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد

محمود خوش دہاں :

امین الـــدین علی اعلیٰ کے استاد اور پیر دراصل محمود خوش دہاں تھے ۔ روضۃ الاولیاء کا بیان ہے :

« بہ حکم و وصیت آنحضرت (شاہ برہان الدین جانم) استاد و پیر تربیت حضرت شاہ امین الدین گشتند . »[1]

محمود خوش دہاں اپنا نام شیخ محمود لکھتے تھے لیکن ان کا صحیح نام سید محمود[2] اور لقب خوش دہاں ہے۔ لقب کے بارے میں روضۃ الاولیاء کا بیان ہے کہ

« سبب اشتہـار آنحضرت بہ خوش دہان می‌گویند کہ قدری دہان آنحضرت کج بودہ است . مردم کج دہان می‌گفتـند . فقرای ایشـان تبدیل کردہ بہ خوش دہاں شہرت دادہ اند . »[3]

مشکواۃ کی یہ روایت غلط معلوم ہوتی ہے کہ حضرت امین کی بددعا کی وجہ سے ان کا منہہ ٹیڑھا ہوگیا تھا اور وہ کج دہاں کہلانے لگے تھے[4]، اس لئے کـہ حضرت امین نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ جب وہ بات کرتے تھے تو ان کے منہہ سے خوشبو آتی تھی . یہ خدا کی دین ہے .[5]

محمود خوش دہاں کے والد کا نام کسی تذکرے میں نہیں ملتا. لیکن راقم الحروف کو ایک فارسی نثر کا رسالۂ « خلاصۃ الارشاد » دستیاب ہوا ہے جس کی تمہید میں خود محمود خوش دہاں نے اپنے والد کا نام لکھ دیا ہے :

« روزی در خـدمت پیر دستگیر، روشن ضمیر، خورشید نظیر، کامل الاولیا و الاتقیا ، عارف باللہ ، اکمل ولی اللہ ، شیخ الاسلام والمسلمین ، مہتدای طالبین والسالکین حضرت شیخ برہان الدین چشتی ابن حضرت میرانجی شمس العشـاق قدس اللہ سرہ العزیز فقیر راجی الی اللہ المعبود

۱ محمد ابراہیم زبیری ، روضۃ الاولیاء ، مخطوطہ ۲۶۶ تذکرہ ، کتب خانۂ آصفیہ ، حیدرآباد

۲ شاہ امین الدین علی اعلی ، خلافت نامۂ بابا شاہ حسینی ، قلمی ، مملوکہ سید زین الدین قادری جاگیردار جمال پور عرس ، ورنگل

۳ محمد ابراہیم زبیری ، روضۃ الاولیاء ، مخطوطہ ۲۶۶ تذکرہ ، کتب خانۂ آصفیہ ، حیدرآباد

۴ شاہ غلام علی ، مشکواۃ النبوۃ ، مخطوطہ ۱۹۴ تذکرہ ، کتب خانہ آصفیہ ، حیدرآباد

۵ شاہ امین الدین علی اعلی ، خلافت نامۂ بابا شاہ حسینی ، قلمی ، مملوکہ سید امین الدین قادری جاگیردار جمال پور. عرس ، ورنگل

شیخ محمود ابن شیخ داؤد قریشی در باب معرفت این حدیث التماس نمود . . . . »[1]

ان کے نانا بدرالدین بدر عالم سید حبیب اللہ قادری تھے جن کے سایۂ عاطفت میں ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی ۔ روضۃ الاولیاء کا بیان ہے کہ وہ اپنے نانا کے مرید تھے لیکن مشکواۃ کا کہنا ہے کہ خلافت قادریہ شاہ ابوالحسن سے ملی تھی. یہ دونوں بیان درست ہیں ۔ انہیں بیعت تو اپنے نانا ہی سے تھی لیکن خلافت انھوں نے اپنے ماموں سے حاصل کی تھی[2]

ان کی زندگی کا ابتدائی دور بیدر میں بسر ہوا لیکن بعد میں بیجاپور چلے آئے اور شاہ برہان الدین جانم سے خانوادۂ چشت میں بیعت و خلافت حاصل کی. ان سے قادریہ اور چشتیہ دونوں سلسلے چلے ہیں.

صاحب مجمع الانساب « کیفیت شاہ محمود خوش دہاں و شاہ خداوند ہادی صاحب چنچولی بدین عنوان است » کے تحت لکھتا ہے :

« بدان کہ از ثقات در سماعت فقیر رسیدہ بود کہ شاہ محمود خوش دہاں کہ مرقد ایشان بیرون حصار بیجاپور طرف دروازہ شہپور متصل روضۂ شاہ امین صاحب در جنت مالہ است ، ہمشیرزادہ حضرت شاہ ابوالحسن قادری و شاہ مصطفی قادری اند و مرید و خلیفہ حضرت شاہ بدرالدین بدر العالم حبیب اللہ والد صاحبین موصوفین اند و پیر تربیت و صحبت و استاد شاہ امین الدین صاحب اند . »[3]

لیکن اسے اس امر سے انکار ہے کہ خوش دہاں چشتی بھی تھے اور شاہ برہان الدین جانم سے بیعت و خلافت رکھتے تھے :

« در ماہ محرم ۱۲۱۴ھ قلندر علی شاہ حیدرآبادی ، مرید قابل و

---

۱ محمود خوش دہاں ، خلاصۃ الارشاد ، مخطوطہ ، کتب خانۂ درگاہ شریف ، بیجاپور

۲ سید شاہ امین الدین علی اعلی ، خلافت نامۂ بابا شاہ حسینی ، قلمی ، مملوکہ سید امین الدین قادری جاگیردار جمال پور عرس ، ورنگل

علاوہ ازیں محمود خوش دہاں کے خلفا سید میراں حسینی ، خداوند ہادی ، میراں جی خدا نما اور تخت نشین کے قادریہ شجروں سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ انھیں خلافت شاہ ابو الحسن قادری سے حاصل تھی ۔

۳ سید محی الدین قادری ، مجمع الانساب ، مخطوطہ کتب خانہ کچی محل ، بیجا پور

طالب علم خرقۂ قادریه می داشتند از فقرای شاه محمود خوش دہان بودند ، برای زیارت مرقد حضرت شاه محمود خوش دہان و زیارت بزرگان به بیجاپور آمده بودند . از زبانیء ایشان شنیده شد که شاه محمود فیض ظاہری و باطنی و خرقه خلافت از ذات با برکات شاه بدرالدین بدر عالم حبیب الله که والد محترم حضرت شاه ابوالحسن و شاه مصطفی صاحب قدس سره اند ، یافته و سند حاصل کرده اند و پیر تربیت و صحبت و استاد شاه امین الدین صاحب اند . و فقرای خاندان شاه امین الدین صاحب می گویند که شاه محمود خوش دہاں چشتیه اند و مرید شاه برہان الدین صاحب والد شاه امین الدین صاحب اند . این سخن غلط محض است لیکن چنین مسموع است که شاه محمود خوش دہان علم طریقت ہم از شاه برہان الدین صاحب حاصل کرده اند . »[۱]

محمود خوش دہاں نے برہان الدین جانم سے صرف علم طریقت ہی حاصل نہیں کیا تھا بلکہ وہ ان کے مرید و خلیفہ بھی تھے . مشکواۃ النبوۃ ، روضۃ الاولیاء ، تذکرۃ القادری ، حدیقۂ رحمانی اور سیر محمدی سب اس باب میں متفق ہیں . درگاہ شریف کے قدیم شجرے ہی میں نہیں بلکہ اس طویل خلفائی شجرے میں بھی ان کا نام برہان الدین جانم کے خلفا کی فہرست میں شامل ہے جو خود صاحب مجمع الانساب کے بڑے بھائی سید محمد قادری نے مرتب کیا تھا اور جو اب بھی کتب خانۂ گچی محل میں محفوظ ہے . شجرۃ الاتقیاء اور امین نامہ سے بھی اس کی توثیق ہوتی ہے . خود محمود خوش دہاں نے اپنی کئی تصانیف میں شاہ برہان الدین کو اپنا پیر بتایا ہے .[۲] اور یہ ایسا ثبوت ہے جس کی تردید نہیں کی جاسکتی

محمود خوش دہاں کا سنہ وفات محبوب ذی المنن کے علاوہ کسی تذکرے میں نہیں ملتا :

« آپ کی رحلت تخمیناً ۹۶۵ھ میں ہوئی . »[۳]

یہ سنہ درست نہیں ہوسکتا اس لئے کہ محمود خوش دہاں کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ برہان الدین جانم کی وفات کے بعد بھی

---

۱ سید محی الدین قادری ، مجمع الانساب مخطوطه کتب خانۂ گچی محل ، بیجاپور

۲ خلاصۃ الارشاد اور معرفت السلوک

۳ عبد الجبار خان ملکاپوری ، محبوب ذی المنن ، حصۂ دوم ، ص ۹۶ -

زندہ رہے اور حضرت امین کی تربیت انہیں کی نگرانی میں ہوئی۔ راقم الحروف کو ان کے سنہ وفات کے دو مادّے ملے ہیں:

(۱) کلید طریقت معبود[1] (۲) محمود خوش دہاں نام مبارک[2]

۱۰۲۶ھ ۱۰۶۴ھ

لیکن کسی مزید شہادت کے بغیر یہ نہیں بتایا جاسکتا کہ ان میں سے کونسا سنہ درست ہے۔

محمود خوش دہاں کا مـــزار شاہ‌پور کے اسی ٹیلے پر ہے جہاں میراں جی شمس العشاق اور شاہ امین الدین علی اعلی کے مقبرے ہیں۔ روضۃ الاولیاء کا بیان ہے:

« مرقد شریف در روضۂ خواجہ امین الدین واقع است۔ »[3]

حدیقۂ رحمانی اور محبوب ذی المنن میں بھی اسی بیان کو دہرایا گیا ہے۔ لیکن یہ درست نہیں ہے۔ حضرت امین کا روضہ ۱۰۸۶ھ میں تعمیر ہوا[4] اور بیرونی حصے کی تزئین اور کتبے کی تکمیل ۱۰۸۸ھ میں ہوئی اگر خوش دہاں روضۂ امین میں دفن ہیں تو ان کی وفات ۱۰۸۶ھ کے بعد تسلیم کرنی ہوگی جو قرین قیاس نہیں۔

صاحب مجمع الانساب لکھتا ہے:

« مرقد ایشان (محمود خوش دہان) بیرونِ حصار بیجاپور طرف دروازۂ شہ‌پور متصل روضۂ شاہ امین الدین صاحب در جنت مالہ است۔ »[5]

یہی بیان درست ہے۔ حضرت امین کی درگاہ کے احاطے میں ایک چھوٹی سی مسجد ہے جس کے صحن میں سنگ سیاہ سے بنی ہوئی ایک قبر ہے۔ شاہ ولی اللہ حسینی کا بیان ہے کہ یہی شیخ محمود خوش دہاں کا مزار ہے۔ زمانۂ قدیم میں غالباً احاطۂ درگاہ کے اس حصے کو جنت مالا کہتے تھے۔

محمود خوش دہاں کے صرف ایک صاحبزادے کا پتہ چلا ہے جن کا نام شیخ مصطفی تھا۔ یہ خود بھی صاحب تصرف بزرگ اور شاعر تھے۔

صاحب روضۃ الاولیاء نے خوش دہاں کو « از بزرگواران کامل و عارفان صاحب

---

۱ بیاض ، کتب خانۂ درگاہ شریف ، بیجاپور

۲ بیاض ، کتب خانۂ گچی محل ، بیجاپور

۳ محمد ابراہیم زبیری ، روضۃ الاولیاء ، مخطوطہ ۲۶۶ تذکرہ ، کتب خانۂ آصفیہ ، حیدرآباد

۴ بشیرالدین احمد ، واقعات مملکت بیجاپور ، حصۂ دوم ، ص ۱۰۰

۵ سید محی الدین قادری ، مجمع الانساب ، مخطوطہ ، کتب خانۂ گچی محل ، بیجاپور

دل » لکھا ہے ۔ مؤلف محبوب ذی المنن لکھتا ہے کہ « خوش سیرت و نیک طینت تھے ، صاحب کشف و کرشمہ تھے ، صاحب کرامت و مکاشفہ تھے ۔ آپ کی توجہ و صحبت کی برکت سے اکثر گمراہ راہ راست پر آئے اور طلبہ باخدا ہوئے ۔ »

ان کے حسب ذیل خلفا کا پتہ چلا ہے :

(۱) شیخ گوشہ نشین (۲) شیخ صدرالدین (۳) سید سفیراللہ سیف اللہ
(۴) متین خان (۵) سید صدر الدین بخاری (۶) سید محمد (۷) شیخ نورالدین
(۸) شیخ احمد برقع پوش (۹) عبداللہ برہان (۱۰) میراں جی خدا نما
(۱۱) سید ہاشم خداوند ہادی[1]

حضرت امین کو بھی انہیں سے چشتیہ و قادریہ طریق میں خلافت حاصل تھی[2] لیکن خود محمود خوش دہاں کے ایما پر حضرت امین بیعت و خلافت کے شجروں میں ان کے نام کی بجاے اپنے والد کا نام لکھتے تھے۔[3]

محمود خوش دہاں کثیر التصانیف بزرگ ہیں۔ ان کی فارسی تصانیف میں معرفت السلوک بہت مشہور ہوئی جس میں انہوں نے اپنے پیر کے نظام سلوک کو دلنشیں پیرایہ میں بیان کیا ہے ۔ یہ کتاب چھپ چکی ہے دکھنی میں ان کی چھوٹی چھوٹی نظمیں ملتی ہیں جن میں « سی حرفی » قابل ذکر ہے ۔ بعض نثری رسائل بھی ان سے منسوب ہیں لیکن یہ انتساب شبہے سے خالی نہیں۔

بیعت و خلافت :

صاحب مجمع الانساب نے شاہ امین الدین علی اعلی کی بیعت کے سلسلے میں بھی ایک نیا رویہ اختیار کیا ہے :

« بدانکہ خواجہ خداوند خدا نما مشرب قادریہ می‌داشتند و مستفیض از ذات با برکات شاہ محمود خوش دہان بودند و ایشان مستفیض از

۱ (۱ تا ۹) شجرۂ خلفائیہ مرتبہ سید محمد قادری ، کتب خانہ گچی محل و شجرۂ درگاہ شریف، بیجاپور. شجرۂ درگاہ شریف میں متین خاں (۴) کا نام میاں متین لکھا ہے ۔
(۱۰) کرسی نامۂ قادریہ سید عزیز اللہ حسینی ، مملوکۂ سلطان محی الدین قادری سجادہ جنتکل و شجرۂ قادریہ خواجہ مہر علی ہادی حق نما
(۱۱) مجمع الانساب ، مخطوطہ کتب خانۂ گچی محل

۲ شاہ امین الدین علی اعلی ، خلافت نامہ بابا شاہ حسینی ، قلمی ، مملوکہ سید امین الدین قادری ، جاگیردار جمال‌پور،

۳ شاہ غلام علی ، مشکواۃ النبوۃ ، مخطوطہ ۱۹ تذکرہ ، کتب خانہ آصفیہ ، حیدرآباد

جناب حضرت شاه بدرالدین حبیب الله قدس الله اسرارهم بودند. و این هرسه صاحبان در بیدر تشریف می‌داشتند. چون وقت رحلت شاه برهان الدین صاحب عنقریب رسید شاه محمود خوش دہان و خداوند خدانما را طلب فرمودند. هردو صاحبان از بیدر به بیجاپور تشریف آوردند و از ایشان نعمت قادریه اخذ فرمودند و نعمت چشتیه به ایشان عطا نمودند به خداوند خدانما وصیت فرمودند که این نعمت خاندان چشتیه که شما را عطا نموده‌ام این امانت فرزندم شاه امین الدین که عنقریب ظهور اوست به رسانند. و به شاه محمود خوش دہان وصیت فرمودند که صاحب پیر تربیت او باشند و آن چنین که علوم ظاهر و باطن باشد مرحمت نمایند و به ابو محمد که برادر رضاعی و مرید حضرت ایشان بود وصیت فرمودند که تربیت دستار و گفتار و قول و فعل و نشست و برخاست نماید و به چاند صاحبه زوجهٔ خود را وصیت فرمودند که وقت درد زه پارچه از مسکه آلوده بلع کنند و چون فرزند پیدا شود باوضو شیر به او داده باشند و چون جوان شود فیض ظاهری و باطنی بسیار از وی جاری خواهد شد. گویند که شاه برهان الدین صاحب رحلت فرمودند. بعد رحلت ایشان شاه امین الدین صاحب متولد گشتند و بموجب وصیت ابو محمد به منصب خود سرگرم شدند و شاه محمود خوش دہان بر تربیت ظاهری و باطنی ایشان مشغول بودند و خداوند خدانما بعد تولد شاه امین الدین صاحب از این جا تشریف بردند و چون ایشان عاقل و بالغ رسیده گشتند خداوند خدانما به بیجاپور تشریف آوردند و از شاه امین الدین صاحب ملاقات کرده در خلوت رفته فرمودند که نعمت مشرب چشت از والد بزرگوار صاحب امانت به این فقیر رسیده برای رسانیدن آن امانت در خدمت صاحب رسیده‌ام. شاه امین الدین صاحب فرمودند که صاحب از کدام طریقه ذایقه دارند. فرمودند که فقیر سید بخاری است. اولاً نعمت خاندان بخاریه می‌داشت. چون به دکهن رسید فیض طریق قادریه از حضرت شاه محمود خوش دہان برداشت. بعد شاه امین الدین صاحب فرمودند اولیٰ طریقهٔ قادریه به فقیر عنایت فرمایند که تا امر ادب و طرف اجابت مرتب شود. شاه خداوند خدانما طریق قادریه را به معزالیه مرحمت نمودند و ایشان آنچه که آداب فقیر بود بجا آورده طریق چشتیه را که نزد شاه خداوند امانت بود حاصل نمودند و به کمالیت و مقام قربیت رسیدند

و خداوند خدا نما اجازت طریق چشتیه نیز از حضرت ایشان . . . .
رخصت یافتند . بعد اجازت طریقهٔ چشتیه خدا نما صاحب ہمین طریقه
تا دم آخرین داشته . »[۱]

ان واقعات کا ذکر کسی تذکرے میں نہیں ملتا.[۲] بلکہ ان سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ امین الدین علی اعلی کی ظاہری اور باطنی تربیت محمود خوش دہاں نے کی اور برہان الدین جانم کی امانت انہیں کے توسط سے امین الدین علی اعلی کو پہنچی.

محمود خوش دہاں کو امین الدین علی اعلی کی تربیت کی فکر شروع ہی سے تھی. کج دہاں والے واقعے سے اس کا ثبوت ملتا ہے. مشکواۃ النبوۃ نے اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے:

---

۱ سید محی الدین قادری، مجمع الاسباب، مخطوطه، کتب خانۂ کچی محل، بیجاپور

۲ مؤلف تاریخ محمدی نے ان واقعات کو کسی قدر تبدیلی کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے:

« برہان الحق والدین قدس سرہ اس تفکر میں تھے کہ ایسے کون بزرگ ملیں گے جو میری امانت کو میرے بعد میرے فرزند کے تئیں امانت داری سے پہنچا دیں گے. اس خیال سے سفر اختیار کئے. اتفاقاً ایک روز حضرت شیخ محمود خوش دہاں سے ملاقات ہوئی اور شیخ صاحب موصوف ہمشیر زادہ سیدالسادات سید ابوالحسن قادری قدس سرہ کے تھے. ان کو خلافت طریقۂ قادریہ کی اپنے حقیقی نانا سے حاصل تھی اور طلب میں خلافت خاندان چشتیہ کے نکلے تھے. حضرت برہان الحق والدین موصوف نے اپنے دل میں سونچے کہ یہ صاحب امانت دار ہیں انہی کو سپرد کرنا چاہئے. یہ سونچ کر شیخ محمود خوش دہان موصوف کو خلافت سرفراز فرما کر وصیت کئے کہ یہ امانت تم میرے فرزند کو تعلیم کر کے پہونچا دینا. حسب وصیت شیخ محمود موصوف نے بعد رحلت برہان الحق والدین خواجہ امین الدین علی حسینی ممدوح کی تعلیم و تربیت کر کے رموزات خاندان چشت سے ممتاز کیا اور فرمایا کہ آپ کے والد بزرگوار کی وصیت ہے کہ شجرۂ مرشدی میں نام آپ کے والد کا چلادیں. حسب وصیت والد جناب خواجہ امین الدین حسینی صاحب موصوف نے اپنے والد کا نام شجرہ میں جاری کیا تھا. »

(تاریخ محمدی، ص ۲۰۳)

« روزی محمود خوش دہاں کہ از کمل خلفای پدر ایشان بودند در خیال آوردند کہ اگرچہ شاہ امین الدین ولیء مادرزاد است و علم باطن دارد اما بحکم پدر ایشان شنوانیدن علم ظاہر ہم شرط است. در آن وقت شاہ امین الدین ہفت ہشت سالہ بودند کہ بہ اطفال بہ بازی مشغول بودند. در حال بہ غضب بر ایشان متوجہ شدہ فرمودند: چہ گفتی ای کج دہاں؟ فی الفور دہانش کج افتاد. نادم و پشیمان شدہ و از گفتار خود استغفار نمودہ بہ خدمت مادر حضرت ایشان رجوع آوردند و کیفیت واقعۂ خود عرض کردند. ماں صاحب بہ شاہ امین الدین فرمودند: بابا امین الدین، ایشان از خلفای پدر شما اند. این چہ کردید کہ در حق او کلمۂ بد گفتید. فرمودند: یا امی، چہ گفتم؟ من آنچہ گفتہ ام بر گمان ایشان گفتہ ام کہ ایشان ظاہر علم حقائق می دانند و قدر ولایت ما نمی شناسند. ماں صاحبہ فرمودند: خوب، حالا کلمۂ خیر در حق او بفرما. فرمودند: ایشان ہم چنان کہ بودند محمود خوش دہان اند دہانش نکو شد. اما قدری لکنت بہ وقت کلام تا عمر باقی ماند.»[1]

قطع نظر اس واقعہ کے جو «کج دہانی» سے متعلق ہے اور صحیح نہیں معلوم ہوتا، اس لئے کہ امین الدین علی اعلی، خوش دہاں کا ذکر بڑے پیار اور احترام سے کرتے تھے اور کہتے تھے کہ جب وہ بات کرتے ہیں تو منہ سے خوشبو آتی ہے اور یہ خدا کی دین ہے[2] اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ محمود خوش دہاں کو ہر لمحہ امین الدین علی اعلی کی تربیت کی فکر دامن گیر رہتی تھی اور وہ بچپن ہی سے انہیں راہ حق پر ڈالنے کے جتن کیا کرتے تھے۔

مشکواۃ النبوۃ میں امین الدین علی اعلی کی بیعت و خلافت کا واقعہ اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک دن مشائخین نے اعتراض کیا کہ آپ کا بیعت لینا درست نہیں ہے اس لئے کہ آپ کے والد آپ کی پیدائش سے پہلے انتقال کرچکے تھے اور ان سے آپ کو بیعت و خرقہ نہیں پہنچ سکا۔ علاوہ ازیں آپ نے کسی اور کے ہاتھ پر بھی بیعت نہیں کی ہے پھر اہل سلف کے طریق کے خلاف آپ لوگوں

---

۱ شاہ غلام علی، مشکواۃ النبوۃ، مخطوطہ ۱۹۸ تذکرہ، کتب خانۂ آصفیہ، حیدرآباد

۲ شاہ امین الدین علی اعلی، خلافت نامۂ بابا شاہ حسینی، قلمی، مملوکہ سید امین الدین قادری جاگیردار جمال پور عرس، ورنگل

سے بیعت کیسے لیتے ہیں ۔ شاہ امین نے فرمایا: آپ لوگوں کے یقین کے لئے دلیل کا لانا لازم ہوا ۔ یہ کہا اور والد بزرگوار کی گنبد میں داخل ہوئے ۔ گنبد کا دروازہ خود سے بند ہوگیا ۔ تھوڑی دیر بعد وہ لوگ جو گنبد کے اطراف جمع تھے یہ سن کر حیران رہ گئے کہ شاہ برہان الدین جانم اور امین الدین علی اعلی آیۃ بیعت ایک ساتھ پڑھ رہے ہیں ۔ ان کی آوازیں بلا تقدیم و تاخیر زمانی صاف سنائی دے رہی تھیں ۔

اس کے بعد امین الدین علی اعلی گنبد سے برآمد ہوئے ۔ تمامی اشیاے رسوم بیعت مثل خوشبو ، چھوارے وغیرہ درگاہ میں موجود تھے ۔ امین الدین علی اعلی کے گلے میں پھولوں کا ہار پڑا تھا اور کپڑوں پر صندل کے نشانات نمایاں تھے ۔ اس روز سے ان کو لوگ شاہ برہان الدین کا خلیفہ کہنے لگے ۔ تاہم رفع شک کے لئے حضرت نے شیخ محمود خوش دہاں سے بھی خرقۂ خلافت حاصل کیا کہا جاتا ہے کہ شیخ موصوف نے خرقۂ خلافت عطا کرنے کے بعد کہا کہ آپ شجروں میں اپنا نام فقیر کے واسطے کے بغیر لکھا کریں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خاندان کے شجروں میں شیخ محمود خوش دہاں کا نام نہیں ملتا بلکہ امین الدین علی اعلی کے بعد برہان الدین جانم کا نام لکھا جاتا ہے ۔[1]

مشکواۃ کے اس بیان سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ محض بعض لوگوں کے شکوک کو رفع کرنے کے لئے امین الدین علی اعلی نے محمود خوش دہاں سے بیعت و خلافت حاصل کی تھی ۔ حالانکہ حقیقت اس کے برخلاف ہے ۔ وہ بیعت و خلافت کو ضروری سمجھتے تھے اور انھوں نے محمود خوش دہاں سے صرف چشتیہ سلسلے ہی میں نہیں بلکہ قادریہ سلسلے میں بھی بیعت حاصل کی تھی ۔ ان امور کی تصدیق خلافت نامۂ بابا شاہ حسینی کے بیان سے ہوتی ہے جو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے :

«ثنا ہور شکر اس خدا کوں سازور ہے جن نے ناپاک بوند تے آدمی کبن پیدا کر کوں اپنی خلافت دیکوں خرقہ پنا کوں اپنے تمام بھیداں ذات کیچ ستی اشنائی دیا ۔ اسکنے انکھیاں میانے اپنا نور بھایا ہور خاص الخاص خلیفہ کیاں ہور محمد کوں اپنیچ خلافت کاج پٹکیا باند کوں اپنی نشانیاں دیکوں خلافت پھیلانے اور اپنے کوں پچھاننے

۱ شاہ غلام علی ، مشکواۃ النبوۃ ، مخطوطہ ۱۸۴ تذکرہ ، کتب خانۂ آصفیہ ، حیدرآباد

لوگاں کیاں کدن بھیجیا ویسیچ خلافت بیعت چلتے آئی. سو میں پہلے قادری کا مرید ہویا. اس کے مرید بنا ہوے مارگ نا دسے. پیر سید محمود سوں اس کے ہاتھ پو بیعت کیا. اس کے مکہ سوں بات کیاں توں خوش ہو آتی سو یو خدا کی خاص دین اس کے تیں ہے سو دوجا کوے نا اچھیں وہ مرید اپنے نانا حبیب اللہ کیاں اہے ہور خلافت لیائے اپنے ماموں سوں جو سید ابوالحسن اہیں. یو میرے نانا کیچ سگے بھائی اہیں سو تس پچھیں میرے باپ کیاں خلافتاں سید محمود سوں لیاں اور وہ خلافتاں سو چشتی کیاں تاج میرے سر پوں دھر کوں منجیں بندہ نواز کے خلیفیاں میں دھریا ویسیچ میں یہ خلافتاں اور نعمتاں میرے پوت سید بابا حسینی کوں دیکو سجادہ بنا کوں پیری، مریدی، فقیری کی اجازت بخشا دو سے جاگا جانے کیں حاجت نا اچھے.

سید امین الدین علی»[۱]

اس خلافت نامے سے صاف ظاہر ہے کہ امین الدین علی اعلیٰ کے پیر نہ تو خداوند خدا نما ہیں اور نہ عطاء اللہ حسینی بلکہ سید محمود خوش دہاں ہیں اور امین الدین علی اعلیٰ چشتی ہی نہیں قادری بھی ہیں بلکہ انہوں نے سلسلۂ چشتیہ سے پہلے سلسلۂ قادریہ میں بیعت کی تھی، اور یہ بیعت و خلافت رسمی یا محض لوگوں کے شک و شبہ کو دور کرنے کے لئے نہ تھی بلکہ حقیقی تھی.

سخاوت مرزا صاحب نے ملفوظ مخدوم ساوی کے حوالے سے لکھا ہے کہ امین الدین علی اعلیٰ نے راج محمد چشتی سے بھی استفادہ کیا تھا[۲] شاہ راج محمد چشتی، حاجی اسحٰق کے خلیفہ اور وہ شاہ برہان الدین جانم کے خلیفہ تھے اس لئے ان سے استفادہ کا سوال پیدا نہیں ہوتا.

حلیہ، لباس:

صاحب انوارالاخیار نے آپ کے حلیے اور لباس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

«میانہ قد، سرخ و سفید رنگ و لاغر جسم و سخن بسیار کم گفتند و محاسن شریف دراز بود. لباس از رنگ گیرو در بر می‌داشتند و از لباس تکلفانہ شوق زیادہ بود.»[۳]

---

۱ شاہ امین الدین علی اعلیٰ، خلافت نامۂ بابا شاہ حسینی، قلمی، مملوکہ سید زین الدین قادری جاگیر دار جمال پور عرس، ورنگل

۲ سخاوت مرزا، مخدوم ساوی بیجاپوری، رسالۂ اردو، اپریل سنہ ۱۹۴۲ع

۳ انواراللہ، انوارالاخیار، مخطوطہ مملوکہ راقم الحروف

صاحب حدیقۂ رحمانی کا بیان ہے:

«لباس آپ کا پرتکلف تھا اور مرتبہ معشوقیت کو زیب دیتا تھا[1]»

مجذوب یا سالک:

مشہور ہے کہ ان پر ہر وقت جذب و سرمستی کی کیفیت طاری رہتی تھی. میل‌جول کو پسند نہیں فرماتے تھے اور ہفتوں بلکہ مہینوں اپنے حجرے سے باہر نہیں نکلتے تھے. جب کچھ افاقہ ہوتا اور کمرے سے باہر تشریف لاتے تو جو لوگ حاضر ہوتے سجدے میں گر پڑتے اور سجدے سے اٹھنے کے بعد بھی نظریں نیچی کئے رہتے اس لئے کہ ان کی نظر میں وہ جلال ہوتا کہ اس کی تاب نہ لاسکتے تھے. مشہور ہے کہ ان کے حجرے کے سامنے مٹکوں میں پانی بھرا رہتا تھا. وہ حجرے سے برآمد ہوتے ہی اس پانی پر نظر ڈالتے تھے جو کھولنے لگتا تھا. اس کے بعد اہل محفل کی طرف متوجہ ہوتے تھے.[2]

مشکواۃ میں لکھا ہے کہ ان پر ہمیشہ استغراق کی کیفیت طاری رہتی تھی. ہفتے میں ایک بار افاقہ ہوتا تھا. اس دن خدام اور خلفاء مستفید ہوتے تھے. اکثر سر نگوں بیٹھے رہتے اور جب سر اٹھاتے تو تمام مرید اور خلفاء سر ارادت زمین پر جھکا دیتے تھے. صاحب روضۃ الاولیاء بھی یہی کہتا ہے کہ شب و روز محویت و استغراق کی کیفیت طاری رہتی تھی لیکن کمالِ جذب کے باوجود ارشاد و تلقین جاری تھی.

خود ان کے معاصرین انہیں مجذوب کہتے تھے. چنانچہ مشہور ہے کہ جب میراں سید محمد مدرس مدینہ منورہ کو ہجرت کرنے کے ارادے سے روانہ ہونے لگے تو امین‌الدین علی اعلی نے کہا کہ حضرت سید محمد مدرس شہر کی برکت اپنے ساتھ لئے جاتے ہیں. حضرت سید محمد مدرس کو اس ارشاد کی اطلاع ملی تو فرمایا کہ اب ملک کی برکت مجذوبوں کے ہاتھ ہے.[3]

ان کی وفات کے بعد بھی انہیں مجذوب ہی کہا جاتا رہا. چنانچہ مشربی کہتا ہے:

---

۱ ثقات، حدیقۂ رحمانی، مخطوطہ مملوکہ فریدالدین صاحب، حیدرآباد

۲ ثقاف، حدیقۂ رحمانی، مخطوطہ مملوکہ فریدالدین صاحب، حیدرآباد

۳ محمد ابراہیم زبیری، روضۃ الاولیاء، مخطوطہ ۲۶۶ تذکرہ، کتب خانۂ آصفیہ، حیدر آباد

اتھا مرد مجـــذوب مطلق امیں نہ مجذوب سے پائے کوئی راہ دیں[1]

امین الدین علی اعلی ولیء کامل اور عارف واصل ضرور تھے اور کبھی کبھی ان پر جذب کی کیفیت بھی طاری رہتی تھی لیکن وہ دراصل صاحب سلوک تھے ورنہ خلق اللہ کو ان سے نہ اتنا فیض پہنچتا اور نہ ان کے خلفاء اتنے سربلند ہوتے کہ ایک مدت تک دکھن پر انہیں کا بول بالا رہتا۔ ان کو مجذوب کہنے کی ایک بڑی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے تصوف کا ایک نیا راستہ اختیار کیا تھا جو مشائخین بیجاپور، خاص کر طریق قادریہ کے شیوخ کے لئے ناپسندیدہ تھا۔ چنانچہ وہ ان کی تعلیمات پر نکتہ چینی کرتے اور انھیں مجذوب کا نام دیتے تھے۔

امین الدین علی اعلی کی ریاضت کے تذکرے عام ہیں۔ صاحب روضۃ الاولیاء نے عروس عرفان کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

«حضرت خواجہ امین الدین در اوائل در گنبد پدر عالی قدر خود شاہ برہان ملازم و ملتزم بودہ سلوک و عرفان و معرفت وجدان اکتساب می نمودند[2]۔»

مشکواۃ کا بیان ہے:

«شاہ امین الدین علی اعلی از اولیای کمل بسیار صاحب تصرف و صاحب ریاضت و جذب و سلوک بودند کہ در یک رواق تا دوازدہ سال مشغول بحق بود و ریاضت و مجاہدۂ شاقہ اشتغال داشتند بعد از آن بر مسند ارشاد پدر نشستہ رہنمائی خلق می نمودند۔[3]»

ریاضت و مجاہدۂ شاقہ کا یہ سلسلہ زندگی بھر قائم رہا، یہاں تک کہ کئی کئی دن آب و خورش تک کا خیال نہ آتا[4]۔ اس لئے تذکروں کے عام بیانات کے مقابلے میں انوارالاخیار کا یہ بیان زیادہ درست معلوم ہوتا ہے:

«از حالت جذب و سلوک موصوف بودند ... حالت جذب کمتر بود۔[5]»

---

۱ محمد صادق قادری مشربی، مثنوی، مخطوطہ، کتب خانۂ گچی محل، بیجاپور

۲ محمد ابراہیم زبیری، روضۃ الاولیاء، مخطوطہ ۲۶۶، تذکرہ، کتب خانۂ آصفیہ، حیدرآباد

۳ شاہ غلام علی، مشکواۃ النبوۃ، مخطوطہ ۱۹۴ تذکرہ، کتب خانۂ آصفیہ، حیدرآباد

۴ انوراللہ خاں، انوارالاخیار، مخطوطہ، مملوکہ راقم الحروف

۵ ایضاً

بحث سجدہ :

امین الدین علی اعلی کو ان کے مرید اور معتقد سجدہ کرتے تھے اور وہ اس کو روا رکھتے تھے۔ عقیدت و احترام کے اظہار کا یہ طریقہ ان کے خاندان میں غالباً شاہ برہان الدین جانم کے زمانے سے شروع ہوا۔ صاحب مشکواۃ النبوۃ نے انوارالاخیار کے حوالے سے لکھا ہے :

«وی ولیء مادرزاد بود کہ مردمان او را سجدہ می‌کردند و ہم برہان الدین جواز آن می‌داشت و می‌گرفت۔ و این تصرفات او بود کہ ہرکہ روبروی ایشان می‌آمد سجدہ بجا آورد چہ از عام و چہ از خاص۔[1]»

یہی طریقہ امین الدین علی اعلی کے زمانے میں بھی رائج تھا اور ان کے بعد بھی ایک زمانے تک ان کی اولاد میں جاری رہا۔

امین الدین علی اعلی نے اپنے بعض رسائل میں اس موضوع پر بحث کی ہے اور سجدے کا جواز پیش کیا ہے۔[2] علمائے ظاہر کے لئے یہ خیالات ظاہر ہے کہ ناپسندیدہ تھے اس لئے انھیں امین الدین علی اعلی سے شکایت پیدا ہوئی اور وہ علی عادل شاہ ثانی کے زمانے میں ایک دن بحث مباحثہ پر آمادہ ہوکر حضرت کی قیام گاہ پر پہنچے۔ معترضین کے اس گروہ کے سربراہ سید محمد بخاری اور عبدالمحمد تھے۔ امین الدین علی اعلی اس وقت اپنے چند خادموں میرانجی، میٹھے خاں، مراتب خاں، یوسف خاں اور دولت خاں افغان کے ساتھ صحن مسجد میں تشریف رکھتے تھے۔ بابا شاہ حسینی نے ان ظاہر پرستوں کی آمد اور غایت سے مطلع کیا تو فرمایا : یہ لوگ سجدہ کیوں کرتے ہیں؟ اچھا آئے ہیں تو آنے دو۔

سید محمد بخاری اور دوسرے مشائخین مسجد میں جمع ہوگئے تو حضرت نے سجدہ کے موضوع پر ایک بلیغ تقریر فرمائی اور قرآن، حدیث، ائمہ کے اقوال اور فتووں سے ثابت کیا کہ سجدہ دو طرح کا ہوتا ہے، ایک سجدۂ بندگی اور دوسرے سجدۂ تحیت۔ سجدۂ بندگی صرف ذات باری تعالی کے لئے ہے لیکن سجدۂ تحیت

---

۱ شاہ غلام علی، مشکواۃ النبوۃ، مخطوطہ ۱۹۰۷ تذکرہ، کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد

۲ بعض مشائخین نے ان رسائل کی مذمت اور تردید بھی کی ہے۔ اس قسم کا ایک رسالہ سید شاہ محمد العیدروس کی تصنیف ہے جو سجادہ صاحب سالگندہ کے پاس محفوظ ہے۔

انسان کے لئے روا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں، یہ سجدۂ تحیت تھا۔ سجدۂ تحیت کی حیثیت سلام کی سی ہے۔ اس لئے مشائخین کے آگے سر جھکانا ناجائز نہیں ہوسکتا۔ بزرگوں کے اقوال اور علماء کے فتووں سے ثابت ہے کہ پانچ مقام ایسے ہیں جہاں سجدے سے کفر عائد نہیں ہوتا۔ قوم نبی کو، مرید پیر کو، رعیت بادشاہ کو، اولاد ماں باپ کو اور غلام آقا کو سجدہ کرے تو روا ہے اس لئے کہ اس سجدے کی نوعیت وہ نہیں ہے جو سجدۂ عبادت کی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ اگر ماسوا کو سجدہ کیا جائے اور نیت عبادت کی نہ ہو تو اس سے کفر لازم نہیں آتا بلکہ یہ سجدہ روا ہے۔

حضرت کی اس مدلل اور دلپذیر تقریر نے حاضرین پر جادو کا سا اثر کیا اور وہ اپنے اعتراض پر نادم اور شرمندہ ہوئے۔ سید محمد بخاری اور عبدالمحمد کو کوئی دلیل نہیں سوجھتی تھی۔ بادشاہ اور عوام دونوں میں ان کی بڑی رسوائی ہوئی۔[1]

نماز:

امین الدین علی اعلی بعض مغلوب الحال صوفیاء کی طرح ارکان شرعی اور صوم و صلواۃ کی چنداں پابندی نہیں کرتے تھے۔ یہ روش بھی علمائے ظاہر کو پسند نہ تھی۔ چنانچہ انھوں نے بادشاہ وقت کی استعانت سے حضرت اور ان کے مریدوں کو تنگ کرنا شروع کیا۔ ان کے خادموں کو اپنی محفلوں میں جگہ نہیں دیتے تھے اور شہر کے تمام دوکانداروں کو تاکید کی تھی کہ فقرائے امین الدین علی اعلی کو خیرات نہ دیں۔ بالآخر فقراء نے بادشاہ اور مشائخین کی ان حرکتوں سے حضرت کو مطلع کیا۔ ان کے چہرے پر جلال کی کیفیت رونما ہوئی اور انھوں نے خادموں سے فرمایا کہ بادشاہ اور مشائخین سے کہہ دو کہ کل تالاب کے کنارے جمع ہوں، ہم وہاں نماز ادا کریں گے۔ خادموں نے حسب الحکم بادشاہ اور مشائخین کو مطلع کیا۔ وہ سب بہت خوش ہوئے کہ بالآخر امین الدین علی اعلی شرع کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔ جب دوسرا دن آیا تو بادشاہ اور مشائخین کے علاوہ بیجاپور کے تمام لوگ تالاب کے کنارے جمع ہوگئے۔ خادم نے حضرت کی خدمت میں عرض کی

---

۱ سید امین الدین علی ثانی، مخزن الامین، ص ۹۷-۱۹۳، مخطوطہ ۱۷۲۲ تصوف، کتب خانۂ آصفیہ، حیدرآباد

کہ آپ کے حکم کے بموجب بادشاہ ، مشائخین اور اہلِ بیجاپور تالاب کے کنارے جمع ہوچکے ہیں اور انتظار کر رہے ہیں حضرت نے خادم سے کہا جانماز اٹھاؤ اور خود تالاب کی طرف روانہ ہوگئے ۔ تالاب کے کنارے پہنچ کر خادم[1] سے کہا کہ تالاب کے درمیان پانی پر مصلیٰ بچھادو ۔ تالاب پانی سے لبالب بھرا ہوا تھا ۔ حضرت نے فرمایا ، دل میں کسی قسم کا وسواس نہ لاؤ اور پانی پر چل پڑو ۔ خادم تعمیل ارشاد میں پانی پر چل پڑا ۔ کیا دیکھتا ہے کہ پاؤں پانی میں نہیں جاتا ۔ اطمینان سے پانی پر چلتا ہوا تالاب کے درمیان پہنچا اور جانماز بچھادی ۔ امین الدین علی اعلیٰ مشائخین کے گروہ سے اٹھے اور پانی پر روانہ ہوئے اور جا نماز پر کھڑے ہونے کے بعد مشائخین کو آواز دی کہ جس کو قدرت ہو مقتدی بنے ۔ بادشاہ اور مشائخین حواس باختہ ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے ۔ حضرت نے نماز[2] ادا کی ۔ جا نماز اٹھائی اور خراماں خراماں تالاب کے کنارے روانہ ہوئے ۔ ساری دنیا نے دیکھا کہ ان کے پاؤں تک گیلے نہیں ہوئے تھے ۔ خلق خدا قدموں پر گر پڑی اور ان کی ولایت کا اقرار کیا ۔ تب حضرت نے بادشاہ کو مخاطب کر کے کہا کہ سب سیاہ رویوں کو دور کیا اور سفید رویوں کو طلب کیا اور گھر لوٹ آئے ۔

اس واقعے کے بعد کچھ زیادہ مدت نہیں گذری کہ عالمگیر نے بیجاپور پر قبضہ کرلیا اور مشائخین بیجاپور ایسے منتشر ہوئے کہ پھر کبھی اپنے وطن میں جمع نہ ہوسکے اور شہر ایسا ویران ہوا کہ آج تک آباد نہ ہوسکا ۔[3]

بعض تذکروں میں اس واقعہ کو کسی قدر اختلاف کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہتے ہیں کہ سید السادات سید محمد بخاری صاحب علی باغ جو اس عہد کے صاحب کشف و عرفان و جامع شریعت و طریقت بزرگ تھے اور سلاطین و امرائے وقت کے ہاں قدر و منزلت رکھتے تھے ، امین الدین علی اعلیٰ کے جذب اور ترک ارکان شرعی سے واقف ہوئے تو پاس شرع و جہت امر معروف ان کے دامن گیر ہوئے اور

---

۱ مشکوٰۃ کا بیان ہے کہ « خادم صادق بود . ہم چناں کردہ » ۔ سیر الہند و گلگشت دکن اور تذکرۃ القادری میں مرید کا نام قادر لنگا لکھا ہے ۔

۲ مشکوٰۃ میں « دوگانۂ حقیقت یگانہ » اور سیر الہند و گلگشت دکن میں دوگانۂ عشق لکھا ہے ۔

۳ انوار اللہ ، انوار الاخیار ، مخطوطہ ، مملوکہ راقم الحروف

وہ بعض دوسرے بزرگوں کے ساتھ امین الدین علی اعلی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تعرض کیا کہ بزرگان دین اور ائمۂ ظاہرین نے شہود و استغراق اور محویت دائمی کے باوجود کبھی اوضاع شریعت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور سنت تک ان سے نہیں چھوٹی۔ آپ جیسے عارف کا نماز ترک کرنا اہل طریقت کے مناسب حال اور آداب شریعت کے شایان نہیں ہے۔ چاہئے کہ پہلے ارکان و احکام شرع کی تکمیل کریں اور پھر جادۂ سلوک و طریقت پر استقامت کے ساتھ گامزن ہوں۔ حضرت امین الدین علی اعلی نے اس وقت اپنے ایک خلیفہ سے فرمایا کہ مصلیٰ تالاب کے وسط میں بچھا دو۔ چنانچہ اس نے حسب الحکم مصلیٰ اٹھایا اور شاہپور تالاب کے بیچوں بیچ بچھا دیا۔ حضرت نے پانی پر نماز دوگانہ ادا کی [1]

معظم کا بیان کسی قدر مختلف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک بزرگ سید محمد بخاری ہوئے ہیں۔ وہ حافظ اور قاری تھے اور لوگ ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ انہوں نے حضرت امین کو کہلا بھیجا کہ آپ عبادت سے تغافل کیوں برتتے ہیں، آئیے نماز جمعہ ایک ساتھ ادا کریں۔ حضرت نے انہیں کہلا بھیجا کہ دیر نہ کیجئے فوراً چلے آئیے۔ اور خود تالاب پر مصلیٰ بچھا کر نماز کے لئے کھڑے ہوگئے۔ سید محمد بخاری کو اس واقعے کی اطلاع ملی تو پریشان ہوگئے۔ تب حضرت امین نے اپنے خلیفہ سید خداوند کو طلب کیا جو مقرب خاص، زبردست عالم اور روشن ضمیر بزرگ تھے اور ان سے کہا کہ سید کی خدمت میں جاکر ہمارا سلام پہنچاؤ اور پھر ہم جو کچھ کہتے ہیں اس کو تفصیل کے ساتھ بیان کرو:

شریعت اوپر یونچہ قائل رہنا ۔۔۔ چھپے راز پر یونچہ مائل رہنا
نبی نے احادیث میں یوں کہے ۔۔۔ عبادت کہے دو وجہ کا اہے
عبادت ہے ظاہر کی صوم و صلوات ۔۔۔ سمجنا ہے باطن میں ذات و صفات
بندہ کس کو کہتے سمجنا اول ۔۔۔ کھڑے گا اوسی توجہ حق کا وصل
نبی نے دیکھو کھول کر سب کہے ۔۔۔ عبادت خدا کا تو نوعان (؟) ہے
کتے یک حقیقت ہے دسرا مجاز ۔۔۔ ولیاں کا ہے باطن میں روزہ نماز
شریعت پہ قائم ہے زاہد کتے ۔۔۔ کریں تن سوں بندگی سو عابد کتے

---

۱ محمد ابراہیم زبیری، روضۃ الاولیاء مخطوطہ ۲٦٦ تذکرہ، کتب خانۂ آصفیہ، حیدرآباد

طریقت برتنے سو عارف ہیں جان
حقیقت پہ مایل سو عاشق ہے مان

کھولا معرفت اوچہ واصل ہوئے
وو واصل ہوئے اور کامل ہوئے

ہمیں یونچ کرتے ہیں روزہ نماز
سمجتے ہیں حق کا یو راز و نیاز

بندہ کو کیا حق نے بندگی بدل
امانت رکھے کر کیا ہے فضل

عبادت کو ظاہر میں یہ فرض ہے
خدا کا یہاں دیکھنا قرض ہے

اول تو سمجنا ہے یہ بات کوں
تو سمجے گا سچہ حق کی وہ ذات کوں

امر یوں کئے ہیں وہ حق کے رسول
امر سب نبی کا کئے ہیں قبول

شریعت بجز راہ دستا نہیں
شریعت بجز باٹ بستا نہیں

شریعت زمیں کو سو بولے رسول
امت پر یہ سب راز کھولے رسول

طریقت نبی نے کہے ہیں شجر
حقیقت سو اس کو لگا ہے ثمر

کہے معرفت اس کی لذت کیتیں
انپڑتے ہیں واصل سو دولت کیتیں

شریعت نبی نے کہے رات ہے
اندر گرد جیوں کہ ظلمات ہے

طریقت نبی نے ستارے کہے
ولے کچہ ہی دستے ہیں تارے کہے

حقیقت سو جیوں چاند اور چاندنا
چکور ہوکے عاشق نے دل باندنا

دیکھو معرفت کو کہے آفتاب
چھپا راز اظہار ہوتا شباب

شریعت ہے کشتی نبی نے کہے
ہوا سار سو وہ سلامت رہے

طریقت کو دریا ہے کر جاننا
جواہر میں بھر پور کر ماننا

حقیقت صدف کر کہے ہیں رسول
اوسے بات لینے سے ہوتا وصول

کہے معرفت ذات موتی ہے جوں
اوسے عاشقاں بات لیتے ہیں یوں

شریعت نبی نے کہے قال ہے
طریقت مرا سب یو افعال ہے

حقیقت ہے احوال مجہہ پر مدام
دیکھو معرفت ذات سب ہی تمام

بجز یو چلے باٹ پاتا نہیں
بجز راہ کچھ ہات آتا نہیں

سخن سن یو سید لئے سر اوپر
امیں کا حکم اور خدا کا امر

بڑا دید بان ملک میں تب ہوا
یو برحق نبی کا تو نایب ہوا

ہوا تب سوں شہرت ہے برحق ولی
امیں کو کتے تو امین علی

اسی بات پر شوق غالب ہوا
بہت خلق اس دن سو طالب ہوا[1]

---

۱ شاہ معظم ، شجرۃ الاتقیاء ، مخطوطہ ۱۳۱ تصوف ، کتب خانۂ آصفیہ ، حیدر آباد

وفات :

خاندانی روایت[1] یہ ہے کہ تالاب پر نماز ادا کرنے کے بعد امین الدین علی اعلی اپنے گھر نہیں لوٹے بلکہ تالاب کے قریب اس مقام پر اقامت گزیں ہوگئے جو ناگ جھری کہلاتا ہے اور اب جہاں ایک چوکھنڈی بنی ہوئی ہے۔ یہیں حضرت نے انتقال فرمایا۔ اس چوکھنڈی میں انہیں سونپا گیا اور چار ماہ بعد نعش مبارک کو گنبد میں دفن کیا گیا۔ عرس سے چار مہینے پہلے یعنی ۲۴ جمادی الاول کو چوکھنڈی میں صندل چڑھایا جاتا ہے۔ حدیقۂ رحمانی سے بھی اس روایت کی توثیق ہوتی ہے۔ درگاہ شریف کا صندل ۲۳ رمضان المبارک کو اور عرس ۲۴ رمضان المبارک کو ہوا کرتا ہے۔

امین الدین علی اعلی کی وفات کی تاریخ اور سنہ کے بارے میں اختلاف ہے۔ صاحب انوارالاخیار نے سنہ وفات ۱۰۸۶ھ اور مادۂ تاریخ «ختم ولی»[2] لکھا ہے۔ تاریخ نہیں دی ہے۔ مشکواۃ النبوۃ میں یکم رمضان ۱۱۱۶ھ اور مادۂ تاریخ «ختم الولی» ملتا ہے۔ محبوب ذی المنن کا ماخذ غالباً مشکواۃ ہی ہے اس لئے کہ اس میں بھی وہی تاریخ اور سنہ دیا گیا ہے جو صاحب مشکواۃ النبوۃ نے لکھا ہے۔ روضۃ الاولیاء میں ۲۴ رمضان ۱۰۸۵ھ اور «ختم ولی» درج ہے برکات الاولیاء نے روضۃ الاولیاء کی پیروی کی ہے۔ واقعات مملکت بیجاپور میں ایک جگہ ۱۶۶۴ء (۱۰۷۵ھ) اور دوسری جگہ ۲۴ رمضان المبارک ۱۰۸۶ھ لکھا ہے۔ مؤلف حدیقۂ رحمانی رقم طراز ہے :

> «وفات آپ کا بقول صاحب مشکواۃ ایکیسویں رمضان[3] اور بقول روضۃ الاولیاء[4] عرس چوبیسویں رمضان ۱۰۸۶ ایکہزار چھیاسی ہجری

---

۱ یہ روایت سید شاہ عطاء اللہ حسینی صاحب سے معلوم ہوئی۔

۲ یہ مادۂ تاریخ حالی مرید علی پیر کے ایک شعر میں ملتا ہے :

سال تاریخ وصالش منجلی گفت ہاتف از ندا «ختم ولی»

لیکن کسی نے اس کا حوالہ نہیں دیا ہے۔

۳ صاحب مشکواۃ النبوۃ نے ۲۱ رمضان نہیں یکم رمضان لکھا ہے۔

۴ صاحب روضۃ الاولیاء نے عرس کی نہیں انتقال کی تاریخ دی ہے چنانچہ اس کے الفاظ یہ ہیں «بست و چہارم رمضان سنہ یکہزار و ہشتاد و پنج رحلت آنحضرت است»

سے ہوا کرتا ہے۔ رحلت آپ کی چوکھنڈی ناگ جھری میں شب چوبیسویں جمادی الاول کو ہوئی۔ بعد چار ماہ کے لاش چوکھنڈی سے لاکر چوبیسویں رمضان المبارک کو گنبد میں دفن کیا۔ عرس چوکھنڈی[1] کا چوبیسویں جمادی الاول کو ہوتا ہے۔ ختم ولی تاریخ رحلت آپ کی ہے۔ بہرحال رحلت آپ کی شب چوبیسویں جمادی الاول ۱۰۸۶ھ میں ہوئی۔»[2]

مؤلف تذکرۃ القادری نے لکھا ہے:

«پیش از آمدن عالمگیر بادشاہ بتاریخ بست و یکم رمضان ۱۰۹۶ھ یک ہزار و نود وشش ہجری رحلت نمود۔ ختمے ولی مادۂ تاریخ وصال آنحضرت۔ ۔ ۔ ۔»[3]

لیکن یہ درست نہیں ہے۔ مؤلف تذکرۃ القادری نے مشہور مادۂ تاریخ «ختم ولی» میں «ی» کا اضافہ کرکے «ختمے ولی» لکھا ہے اور اسی مادۂ تاریخ سے اس کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ «ختم ولی» سے ۱۰۸۶ھ اور «ختمے ولی» سے ۱۰۹۶ھ برآمد ہوتے ہیں۔

مولوی عبدالحق امین الدین اعلی کے سنہ وفات سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

«وفات ۲۴ رمضان ۱۰۸۶ھ میں ہوئی۔ مادۂ تاریخ «ختم ولی» ہوا ہے۔ اور ایک شاعر نے بھی تاریخ کہی ہے۔ مادۂ تاریخ کا شعر یہ ہے:

تاریخ در اسم و خطاب از ہاتفم آمد ندا
شاہ امین الدین علی فرد قطب الاولیاء

دوسرے مصرعہ سے تاریخ نکلتی ہے۔ تذکرۂ اولیائے دکن میں جو تاریخ ۱۱۱۶ھ اور مادۂ تاریخ ختم الولی (۱۱۱۵ھ) لکھا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔»[4]

حکیم شمس اللہ قادری نے سنہ وفات ۱۰۸۵ھ[5] اور ڈاکٹر زور نے ۱۰۸۷ھ

---

۱ چوکھنڈی میں عرس نہیں ہوتا بلکہ ۲۴ جمادی الاول کو صندل ہوتا ہے۔

۲ ثقاف، حدیقۂ رحمانی، مخطوطہ مملوکہ فریدالدین صاحب، حیدرآباد

۳ منشی قادر خاں، تذکرۃ القادری، مخطوطہ ۱۰۸۶ جدید، کتب خانۂ آصفیہ، حیدرآباد

۴ مولوی عبدالحق، حضرت شاہ امین الدین اعلی، رسالہ اردو، جنوری ۱۹۲۸ع، ص ۲

۵ حکیم شمس اللہ قادری، اردوئے قدیم، ص ۸۸، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کا یہ بیان درست نہیں ہے کہ شمس اللہ قادری نے سنہ وفات ۱۰۸۳ ہجری بتایا ہے۔ (ملاحظہ ہو اردو نثر کا آغاز اور ارتقاء ص ۱۸۳)

لکھا ہے۔[1] واقعہ یہ ہے کہ سنہ وفات نہ تو ۱۱۱۶ھ صحیح ہے نہ ۱۰۸۶ھ اور نہ ۱۰۸۷ بلکہ ۱۰۸۵ درست ہے جیسا کہ روضۃ الاولیاء اور اس کی پیروی میں برکات الاولیاء میں درج ہے ۔ اس سنہ کی توثیق اس قدیم شجرے سے ہوتی ہے جو درگاہ امین الدین علی اعلیٰ میں محفوظ ہے ۔ یہ شجرہ بابا شاہ حسینی کے ایما پر امین الدین علی اعلیٰ کی وفات کے صرف چودہ سال بعد تیار کیا گیا تھا اس لئے مستند دستاویز کی اہمیت رکھتا ہے ۔ اس شجرے میں ایک فارسی قطعہ بھی ہے جس کا آخری شعر حسب ذیل ہے :

زہے سرمست مدہوش از مئے اسرار یزدانی
ہمیں گفتا « امین الدین علی معشوق ربانی »
۱۰۸ھ

ایک اور شعر سے بھی یہی سنہ برآمد ہوتا ہے :

پس از رحلت سال وصل او از فرط دلگیری
« امین الدین علی شاہ ولایت » تو ہمین گفتم[2]
۱۰۸۵ھ

امین الدین علی اعلیٰ کے سنہ وفات کو بعض جگہ یوں بھی لکھا ہے کہ عرس ۲۴ رمضان ۱۰۸۶ھ سے ہوتا ہے ، جیسا کہ حدیقۂ رحمانی میں درج ہے ' جس کا مطلب یہ ہے کہ وصال ۱۰۸۵ھ میں ہوا اور عرس ۱۰۸۶ھ سے ہوا کرتا ہے ۔ لیکن خود مؤلف حدیقۂ رحمانی نے سنہ وفات اور سنہ آغاز عرس کو خلط ملط کردیا ہے ۔ جن لوگوں نے سنہ وفات ۱۰۸۶ھ لکھا ہے وہ « ختم ولی » کے مادہ کے علاوہ اس غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں ۔ لیکن شجرۂ درگاہ کے مندرجۂ بالا مادۂ تاریخ کے انکشاف کے بعد کسی غلط فہمی کی گنجائش نہیں رہ جاتی ۔

اب یہ مسئلہ حل طلب رہ جاتا ہے کہ حضرت کا انتقال ۲۴ رمضان کو ہوا یا ۲۴ جمادی الاول کو ۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا جاچکا ہے کہ عرس تو ۲۴ رمضان کو ہوا کرتا ہے لیکن چوکھنڈی میں ۲۳ جمادی الاول کو صندل ہوتا ہے ۔ حضرت کا انتقال چوکھنڈی ہی میں ہوا تھا اس لئے جس تاریخ کو وصال ہوا اسی تاریخ

---

۱ ڈاکٹر زور ، اردو شہ پارے ، ص ۱۶۹

۲ یہ شعر سید حمید سرمست ' رائچور کی مملوکہ ایک بیاض میں درج ہے ۔

کو چوکھنڈی میں صندل ہوتا ہے اور عرس تدفین کی تاریخ یعنی ۲۴ رمضان المبارک کو ہوتا ہے. اس لئے راقم الحروف کا خیال ہے کہ حضرت کے وصال کی صحیح تاریخ ۲۳ جمادی الاول سنہ ۱۰۸۵ھ ہے.

چوکھنڈی :

پکھال دروازے سے جائیں تو چوکھنڈی کوئی ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر کھلے میدان میں واقع ہے. چوکھنڈی کے اندر قبر بنی ہوئی ہے جس پر غلاف چڑھا رہتا ہے. چوکھنڈی کے باہر بھی چند قبریں ہیں. فقرائے درگاہ کا بیان ہے کہ یہاں چودہ قبریں ہیں. بارہ فقراء کی اور دو مستانیوں کی. یہ ان خادموں میں سے تھے جو حضرت کے ساتھ یہیں رہ پڑے تھے.

چوکھنڈی کے آس پاس آبادی کا نام و نشان نہیں ہے، البتہ اس زمین پر جو درگاہ شریف کے تحت ہے کاشت ہوتی ہے.

مقبرہ :

شاہ عطاء اللہ حسینی صاحب کا بیان ہے کہ انھوں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ حضرت نے اپنے ایک مرید یا معتقد وزیر افضل خاں[1] کی درخواست پر اپنی زندگی ہی میں مقبرے کی تعمیر شروع کروا دی تھی.

بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت کے مریدوں میں ایک بہت بڑا معمار تھا. ایک دن حضرت نے اس کو طلب کیا اور اپنی بغل میں دبا کر کہا کہ جو عمارت تم کو نظر آرہی ہے اس کو غور سے دیکھ لو. جب معمار نے عمارت کے پورے نقشے کو ذہن نشین کرلیا تو حضرت نے اس سے کہا کہ بس ایسا ہی نقشہ بنادو. وہ نقشہ اتار لایا. لیکن حضرت نے کہا، نہیں، کچھ کسر رہ گئی ہے. ایک بار پھر اس کو اپنی بغل میں دبا کر اس عمارت کی سیر کرائی جس کا نقشہ مطلوب تھا. یہ عمل تین بار ہوا. تب کہیں حضرت نقشے سے مطمئن ہوئے اور مقبرے کی تعمیر کا کام شروع ہوا. کہا جاتا ہے کہ روضۂ امین الدین علی اعلیٰ کے ہوبہو ایک مقبرہ خراسان میں اب بھی موجود ہے.

---

۱ بشیر الدین احمد نے بھی یہی لکھا ہے کہ «آپ کا گنبد افضل خاں وزیر نے بنوایا تھا (واقعات مملکت بیجاپور، حصہ دوم، ص ۱۰۰)

اس افسانے سے جو حقیقت برآمد ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ مقبرے کا نقشہ حضرت امین کی نگرانی میں تیار کیا گیا تھا اور تعمیر خود ان کی زندگی میں شروع ہوچکی تھی ۔ چونکہ تعمیر کے دوران ان کا انتقال ہوا اس لئے چوکھنڈی میں انہیں سونپا گیا اور چار مہینے بعد جب مقبرہ تیار ہوگیا تو اس میں تدفین عمل میں آئی ۔

بشیر الدین احمد نے مقبرے کی تعمیر کا سنہ ۱۶۷۵ع (۱۰۸۶ھ) بتایا ہے ۔[1] لیکن بیرونی حصے کی تزئین اور کتبہ کی تیاری کا کام ۱۰۸۸ھ میں مکمل ہوا ۔

شاہ عطاء اللہ حسینی کے بیان کی بموجب اس مقبرے میں حضرت امین کے علاوہ ان کی بیوی خونجا رانی ماں صاحب ، صاحبزادے بابا شاہ حسینی اور ان کی بیوی چاند صاحب ماں صاحبہ دفن ہیں ۔

مقبرے کے بارے میں مولوی بشیرالدین احمد نے لکھا ہے :

« شاہ پور دروازے سے دو میل کے فاصلے پر ایک بلند ٹیکری پر یہ درگاہ مبارک ہے ۔ اس کا سفید براق گنبد کوسوں دور سے چمکتا اور بہت بھلا معلوم ہوتا ہے ۔ درگاہ نہایت پرفضا مقام پر بنی ہے ۔ گنبد اور درگاہ کے دروازے پر بہت سی آیات کلام ربانی کندہ ہیں[2] ۔»

بیجاپور مقبروں اور گنبدوں کا شہر ہے ۔ جدھر نظر ڈالئے چھوٹے بڑے بیسیوں گنبد دکھائی دیں گے ۔ ان میں گول گنبد[3] یا بول گنبد جیسا عظیم الشان اور عجوبۂ روزگار گنبد بھی ہے اور ابراہیم روضہ[4] کاسا حسین اور دلکش گنبد بھی ہے اور علی روضہ[5] کاسا سیدھا سادہ گنبد بھی ۔ لیکن درگاہ شریف کا گنبد اگرچہ فن تعمیر کے نقطۂ نظر سے کوئی خصوصیت نہیں رکھتا تاہم اپنی طرز کا واحد گنبد ہے اور اپنی ایک انفرادیت رکھتا ہے ۔

---

۱ بشیر الدین احمد ۔ واقعات مملکت بیجاپور حصہ دوم ، ص ۱۰۰

۲ ایضاً

۳ مقبرۂ سلطان محمد عادل شاہ ۔ کہتے ہیں کہ اتنا عظیم الشان گنبد تمام عالم میں نہیں ۔

۴ مقبرۂ سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی جگت گرو ۔ روضۂ تاج محل کے بعد دنیا کی سب سے خوبصورت عمارت ہے ۔

۵ مقبرۂ علی عادل شاہ اول ۔ یہ پہلا شاہی مقبرہ ہے جو بیجاپور میں تعمیر ہوا ، اس لئے اس میں کوئی تعمیری حسن پیدا نہ ہوسکا ۔

کتبہ :

مقبرے کے کتبے عام طور پر عربی یا فارسی میں ہوتے ہیں لیکن حضرت امین کے مقبرے کا کتبہ دکھنی میں ہے جس کو پڑھنے کی سعادت پونا کے بھگوت دیال ورما کے حصے میں آئی۔[۱] بعد میں اکبرالدین صدیقی نے بھی اس پر ایک تفصیلی مضمون لکھا۔[۲]

حضرت امین نے اپنے صاحبزادے بابا شاہ حسینی کو جو خلافت‌نامہ عطا کیا تھا وہ دکھنی میں ہے۔ اس لئے قیاس کہتا ہے کہ اپنے مقبرے کے لئے انہوں نے خود دکھنی کتبے کا انتخاب کیا ہوگا۔ پچھلے صفحات میں بتایا جاچکا ہے کہ مقبرے کا نقشہ حضرت امین نے اپنی نگرانی میں تیار کروایا تھا اور تعمیر بھی ان کی زندگی ہی میں شروع ہوچکی تھی جس کی تکمیل ان کی وفات کے چار ماہ بعد ہوئی۔ اس لئے کتبے کے بارے میں اس قیاس کو دور از کار نہیں کہا جاسکتا کہ وہ انہیں کا انتخاب کیا ہوا ہے۔

اردو کا پہلا کتبہ احمدآباد کی مسجد رائے کھڈ میں ہے جو شاہ علی محمد جیو گام‌دھنی کے مزار کے مغرب کی جانب کم و بیش پچاس قدم کے فاصلے پر اسی احاطے میں واقع ہے۔ اس کتبے میں گجری کے دو شعر ہیں۔ آخری مصرع سے سنہ ۹۶۳ھ نکلتا ہے۔[۳]

درگاہ حضرت امین کا کتبہ بھی منظوم ہے۔ یہ دراصل حضرت امین کی ایک غزل ہے جو پندرہ اشعار پر مشتمل ہے۔[۴] ردیف امین ہے جس کی وجہ سے ایک شخصی اور انفرادی آہنگ پیدا ہوگیا ہے۔ غزل کے تیور سے تو ایسا لگتا ہے کہ حضرت امین نے یہ اشعار اپنے آخری پیغام کے طور پر کتبے کے لئے ہی کہے تھے۔ پوری غزل درج ذیل ہے :[۵]

---

۱ بھگوت دیال ورما۔ مقالہ پی۔ اچ۔ ڈی۔ بمبئی یونیورسٹی۔ ۱۹۶۴ء

۲ اکبرالدین صدیقی۔ کتبۂ امین درگاہ ؛ اردو نامہ۔ جون ۱۹۶۸ء

۳ مولوی عبدالحق۔ اردو زبان کا ایک قدیم کتبہ۔ رسالۂ اردو۔ اپریل ۱۹۳۸ء

۴ اکبرالدین صدیقی کا خیال ہے کہ یہ غزل حضرت امین کی نہیں بلکہ ان کے کسی مرید کی ہے۔ لیکن یہ خیال درست نہیں معلوم ہوتا۔

۵ یہ حاشیہ اگلے صفحہ پر

دل بحر میں[۱] غواص ہو روح صدف کی کاجیں امیں
در[۲] بے بہا تس صدف میں[۳] نور جاں توں ساجیں[۴] امیں

گر گیان کے عرفان سوں سنبھال سینے[۵] چیر کر
موتی مزین ہاتھ[۶] لے عرفان انگوں پرکار امیں

سو[۷] ہے منور نور توں تس حال جو ظاہر طلوع
کرنا[۸] حضور حق اوچت[۹] ہدیہ اپس تب توں[۱۰] امیں

مقبول[۱۱] حق از حق ہوا ناگہ[۱۲] چرا کس جا دھرے
راضی رضا حق ہو فدا تہاں ذوق نا دوجا امیں

اس ذوق کی تمثیل کوں کس موک[۱۳] سوں کیا کر کہوں
نا[۱۴] ہر کسے زہرہ تہاں نا[۱۵] او کوئی سکیا امیں

حق[۱۶] سوں وصل بھو[۱۷] بھانت ہے تس بھاکنے قتل اللساں
کھن کھن منزہ روپ اہے[۱۸] بھوجک اچنبہ کن امیں

ہادی[۱۹] ہدایت جس اہیں وصل بحر امواج میں[۲۰]
ورنہ شفا[۲۱] اغلب تہاں باریک[۲۲] رہ تاریک امیں

لیکن[۲۳] عروج ہے سن ایتا غواص توں دل کی سمع
امواج نفسانی سو اللہ غیر تیں[۲۴] نا ڈر امیں

بقیۂ حاشیہ ص ۳۸

۳ راقم الحروف کے ہاں اس غزل کے دو نسخے ہیں. ایک اس قدیم بیاض میں ہے جس میں حضرت امین کا دوسرا کلام بھی ہے (ش۱)۔ دوسرا نسخہ انتہائی بد خط اور غلط ہے (ش۲). مولوی عبد الحق کے ہاں اس غزل کا ایک نسخہ تھا جس سے انہوں نے اپنے مضمون شاہ امین الدین اعلی میں پانچ شعر نقل کئے ہیں (ع). یہاں اصل متن کتبۂ درگاہ سے دیا گیا ہے اور اختلاف نسخ فٹ نوٹ میں درج کیا ہے.

---

۱ منہ (ش۱) ۲ بے باہ در (ش۱، ش۲، ع) ۳ منہ (ش۱) ۴ سہجیں (ش۱، ش۲، ع)
۵ سینے (ع) ۶ ہات لیہہ عارف (ش۱) ۷ شعر ندارد (ع) ۸ کرناں (ش۱)
۹ اچت (ش۱) ۱۰ توں تب (ش۱) ۱۱ شعر ندارد (ع) ۱۲ ناگاہ چر (ش۱)
۱۳ موکہ (ش۱)، ندارد (ع) ۱۴ نہ (ش۱) ۱۵ نہ آؤ کہ سکتا (ش۱)، نا آؤ کد سکتا (ع)
۱۶ ندارد (ع) ۱۷ ہے (ش۱) ۱۸ وہ (ش۱) ۱۹ ندارد (ع) ۲۰ منہ (ش۱)
۲۱ شقاں (ش۱) ۲۲ تاریک راہ باریک امیں (ش۱) ۲۳ ندارد (ع) ۲۴ تھے (ش۱)

مطلوب[1] ہے آسان تب اشکال نا[2] مشکیل توج[3]
جا ڈوب کر اوچار نا بےچار توں کرنا[4] امیں

بےچار یو وسواس سب پردا اہے تجہ اس[5] منے
مردان حق تن نام ہے جن پیم اس[6] پیٹھا امیں

شاہید[7] ہو تو دل انگ سوں دانا دلاور زورتر
پیرے[8] معلم خاص تھے امداد لے حق سوں امیں

برہان[9] کیرے فیض سوں غوتا[10] لیا اپ ڈھونڈنے
پایا جو تھا اب[11] قدر تجہ ہنسیں راہو امیں

برہان[12] بن میرا[13] کیرے درگاہ کی سب خاک پر
تن من جان دے کر کہاں قربان[14] بل کیتا امیں

خط[15] غلامی منجہ سما اسیر اس دربار کا
آزادگی کونین تھے میں منجہ[16] تھے پایا امیں

ابیات[17] خالی پنج دہ تمت کیا یہ غزل میں
مفہوم کر ستار ہو نا عیب جو ہونا امیں

ازدواج و اولاد :

راقم الحروف کو پتہ نہ چل سکا کہ امین الدین علی اعلی کی بیوی کس خاندان سے تھیں. البتہ یہ معلوم ہوسکا ہے کہ ان کی بیوی کا نام خونزہ رانی (خونجا رانی[18]) تھا جنھیں احتراماً خونجا رانی ماں صاحب کہتے ہیں .

تمام تذکرے متفق ہیں کہ حضرت کے صرف ایک صاحبزادے بابا شاہ حسینی تھے :

---

۱ ندارد (ع) ، شاہد ہو تو دل الخ (ش۱ ، ش۲) ۲ نہ (ش۱) ۳ تج (ش۱)
۴ کرناں (ش۱) ۵ اوس منہ (ش۱) ، اوس میں (ش۱) ۶ اوس (ع) ۷ ندارد (ع) ، شاہد توں ہو (ش۱) ۸ پیر معلم (ش۱) ۹ ندارد (ع) ۱۰ غوتہ (ش۱)
۱۱ اپ قدر درجے تج ہنسیں ہنس رہو امیں ؟ (ش۱) ۱۲ ندارد (ع) ۱۳ میداں (ش۱)
۱۴ تہاں خرباں (ش۱) ۱۵ ندارد (ع) خطے غلامی منج سما آسیر (ش۱) ۱۶ منج (ش۱)
۱۷ تمت کیا غزل یک ابیات خامی پنج و دہ (ش۱) تمت کیا یک غزل میں ابیات خامی پنج دہ (ع)
۱۸ بیاض عرسیات درگاہ شریف ، بیجاپور

« حضرت ایشان را دستور بوده که چون فرزند متولد شده دست بر روے پسر کشیدہ فرمودی بابا آرام کنید.[1] درحال آن فرزند رحلت نمودی. چون بابا شاہ حسینی متولد شد والدۂ ماجدہ ایشان را از حضرت مستور داشت تا زمانی که وی دوازدہ سالہ شد. روزی نادانسته روبروی آنحضرت آمد. والدہ را حیرت و غم فراق ایشان در گرفت. بی اختیار آب از چشمان او جاری شد. فرمودند چرا اندوهناک می شوی ؟ این بابا حسینی است. خدای تعالیٰ نسل او را قائم دارد. پس او را خرقۂ خلافت دادند و بجای خود کردند. »[2]

لیکن صاحب مجمع الانساب کا بیان ہے :

« شاہ امین الدین صاحب را سه فرزند بودند. یکی میراں صاحب، دویم حضرت صاحب، سویم بابا شاہ صاحب. »[3]

امام پیر صاحب سجادہ نشین شاہ محمد قادری نور دریا کا بیان ہے کہ امین الدین علی اعلی کی ایک صاحبزادی بھی تھیں جو شاہ محمد قادری نور دریا سے بیاہی گئیں. اس طرح شاہ محمد نوردریا امین الدین علی اعلی کے خلیفہ ہی نہیں ، داماد بھی تھے.[4] لیکن ان بیانات کی کسی اور ذریعے سے توثیق نہیں ہوسکی.

بابا شاہ حسینی کو حضرت امین نے اپنی زندگی ہی میں خلافت دے دی تھی لیکن ۱۰۸۷ھ میں ان کی باضابطہ سجادہ نشینی ہوئی اور حسب دستور خاندانی ان کا جلوس نکلا. کسی نے اس موقع پر قطعۂ تاریخ کہا تھا :

آفتاب آمد برون یا از سحاب   ماہ آمد بر سپہر کامیاب
شاہ بابا چون امین الدین علی   آفتاب آمد دلیل آفتاب[5]
۱۰۸۷

---

۱ شاہ عطاء اللہ حسینی کی چوکھنڈی کے احاطے میں جو چھوٹی چھوٹی قبریں ہیں ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ امین الدین علی اعلی کے صاحبزادوں کی ہیں. شاہ صاحب موصوف کے پہلو میں جو قبریں ہیں ان کے بارے میں بھی یہی روایت ہے.

۲ شاہ غلام علی. مشکواۃ النبوۃ. مخطوطہ ۱۹۴ تذکرہ. کتب خانہ آصفیہ. حیدرآباد

۳ سید محی الدین قادری. مخطوطہ. کتب خانہ گنجی محل ، بیجاپور

۴ مکتوب سید شاہ امام پیر قادری نوردریا بنام راقم الحروف

۵ بیاض مملوکہ سید احمد قادری صاحب ، سجادہ نشین اناپسوا ، قادری محل ، بیجاپور

مرید اور خلفا :

امین الدین علی اعلی سے سر زمین دکھن پر بڑا فیض ہوا. ان کے مریدوں اور خلفاء کی تعداد بہت زیادہ تھی اور وہ دکھن کے طول و عرض پر بکھرے ہوئے تھے . صاحب انوارالاخیار کا بیان ہے :

«قریب یک لکه کس مرید بودند و خلفاء بسیار بودند و اکثر مریداں به کمال رسیدند .»[۱]

صاحب مشکواة النبوة لکھتا ہے :

« خلفای ایشان بسیار اند اما مشهور چنان است که دو نیم خلیفه دارد . یکی میراں جی خدانما و دیگر ہاشم نیشاپوری عرف خداوند ہادی نصف شاه عبدالقادر لنگ بند است . »[۲]

مؤلف تذکرة القادری کا بیان ہے :

« خلفای امین الدین بسیار اند . اما مشهور چنان است که دو نیم خلیفه دارد . یکی خداوند ہادی چنچولی و دوم میراں جی کاروانی و نیم قادر لنگا . بعضی گویند که نیم میراں صاحب کاروانی است . »[۳]

یہ نیم خلیفہ کی منطق سمجھ میں نہیں آتی . کسی تذکرہ نگار نے یہ بھی نہیں بتایا ہے کہ میراں صاحب کاروانی یا قادر لنگا کو آدھا خلیفہ کیوں کہا جانے لگا . البتہ ڈاکٹر حفیظ قتیل اس کی توجیہ یوں کرتے ہیں :

« قادر لنگا انگل کوتال ایک مجذوب بزرگ تھے . غلبۂ حال میں ترک شریعت کے باعث شاید انھیں نیم خلیفہ سمجھا جاتا ہو . لیکن چونکہ مجذوبوں سے خوارق عادات زیادہ ظاہر ہوتے ہیں اس لئے ممکن ہے کہ شاہ عبدالقادر لنگ بند کے معتقد انھیں پورا خلیفہ اور میراں جی کو آدھا خلیفہ مانتے ہوں . ورنہ خداوند ہادی جنھیں دونوں روایتوں میں پورا خلیفہ مانا گیا ہے وہ خود میراں جی کے فیض یافتہ تھے . »[۴]

۱　انوارالله ، انوارالاخیار ، مخطوطه مملوکه راقم الحروف

۲　شاه غلام علی ، مشکواة النبوة ، مخطوطه ۱۹۴ تذکره ، کتب خانۂ آصفیه . حیدرآباد

۳　منشی قادر خاں ، تذکرة القادری ، مخطوطه ۱۰۸۶ جدید ، کتب خانۂ آصفیه ، حیدرآباد

۴　ڈاکٹر حفیظ قتیل : میراں جی خدا نما ، ص ۲۶

ادارۂ ادبیات اردو میں صوفیہ کے سلسلے کا ایک قدیم شجرہ محفوظ ہے جو ۱۲۰۰ھ کے قریب تیار کیا گیا تھا اور جس پر اس دور کے جملہ مشائخین اور سجادوں کے توثیقی دستخط اور مواہیر ثبت ہیں ۔ اس شجرے میں متذکرہ بالا تین خلفاء کے علاوہ بابا شاہ حسینی، شاہ فتاح اور شاہ قاسم کے بھی نام ملتے ہیں۔[1] تذکرہ اولیاے رائچور کے بیان کے مطابق شاہ محمد نور دریا بھی امین الدین علی اعلی کے خلیفہ تھے۔[2] ڈاکٹر حفیظ قتیل نے ان کے ایک اور خلیفہ شاہ فاضل کا پتہ چلایا ہے۔[3] سید محمد صاحب بیدری نے مخدوم العاشقین کو بھی حضرت امین کا خلیفہ بتایا ہے جن کا مزار بیدر میں موضع سیور کے قریب رتن خاں کی امرائی کے پاس ہے۔[4]

راقم الحروف کو اپنی تحقیقات کے دوران امین الدین علی اعلی کے مزید سترہ (۱۷) خلفاء کے نام دستیاب ہوئے ہیں:

شاہ اعظم حسینی[5]، سید عبدالقادر المعروف بہ سید میراں حسینی[6]، شاہ علی گوہر[7]، سوج شاہ[8]، من عرف گنج بخش[9]، خواجہ محبوب سبحانی[10]، خواجہ سید صوفی سرمست حسینی[11]، شاہ جمال الدین حسینی چشتی[12]، بابا حمید اولیا[13]، ٹیپو قلندر[14]،

---

۱ ڈاکٹر زور، تذکرۂ مخطوطات ادارۂ ادبیات اردو، جلد پنجم، ص ۲۷۷

۲ سید شاہ روشن علی قادری۔ تذکرۂ اولیاے رائچور، ص ۲۷۳ و شجرہ مملوکہ سید شاہ امام قادری نوردریا (ادھونی)

۳ ڈاکٹر حفیظ قتیل، میرانجی خدانما، ص ۲۷

۴ سید محمد بیدری، حضرت امین الدین اعلی، رسالۂ اردو نامہ، اکتوبر ۱۹٦۷ع، ص ۸٦

۵ کلیات الحقائق، مخطوطہ ۳٦۷ تصوف، کتب خانہ آصفیہ، حیدرآباد

٦ حالات سید میراں حسینی و شجرۂ بیعت و خلافت مملوکہ سید شاہ سلیمان قادری سجادہ سید میراں حسینی (حیدرآباد)

۷ محی الدین شرفی ۔ شرف الانساب، ص ۴۵ و شجرۂ قلمی مملوکہ سید شاہ امام پیر قادری نوردریا (ادھونی)

۸ محی الدین شرفی، شرف الانساب۔ ص ۴۵

۹ انوار اللہ ۔ انوار الاخیار ۔ مخطوطہ مملوکہ راقم الحروف
محمد نجیب ناگوری ۔ تذکرۃ الاعراس، مخطوطہ ۲۸٦۹ جدید۔ کتب خانۂ آصفیہ: حیدرآباد
شاہ فاضل: پنج گنج، ص ۹۹

۱۰ سید محمد ابراہیم شاہ، انساب الخلافت۔ ص ۱۴۹ راقم الحروف کو اس نام پر شبہ ہے

۱۱ شجرۂ خواجہ سید صوفی سرمست حسینی، مملوکہ سید محبوب سبحانی سجادہ نشین ہنور

۱۲ غلام قادر خاطر، بہار اعظم جاہی۔ مخطوطہ ۱۲۷۰ ۔ سنٹرل ریکارڈ آفس حیدرآباد، ص ۱۱٦

۱۳ ایضاً، ص ۲٦۰

۱۴ ایضاً۔ ص ۱۵ ۔ ۲۱۱
ثقاف، حدیقۂ رحمانی، مخطوطہ، مملوکہ فریدالدین صاحب، حیدرآباد، ص ٦۳۴

شاہ مرتضی حسین چشتی[1]، شاہ محمد عارف[2]، سید شاہ تاج الدین[3]، محمود شاہ چشتی[4]، شاہ اوتاولے[5]، شاہ داول[6]، شاہ مصطفی[7]

اس طرح حضرت امین الدین علی اعلی کے خلفا کی تعداد ڈھائی سے چھبیس تک پہنچتی ہے۔ لیکن اس فہرست کو بھی مکمل نہیں سمجھا جاسکتا۔

---

۱ ڈاکٹر حبیب النساء ، میسور میں اردو کا نشو و نما ، ص ۶۹

۲ کتاب الاعراس ، مخطوطہ ، مملوکہ علیم الدین صاحب ، حیدرآباد
محمد نجیب ناگوری ، تذکرۃ الاعراس ، مخطوطہ ۱۸۶۹ ، جدید ، کتب خانۂ آصفیہ ، حیدرآباد

۳ ایضاً

۴ شجرۂ قلمی ، مملوکہ علیم الدین صاحب ، حیدرآباد ، بیاض کتب خانۂ درگاہ شریف ، بیجاپور

۵ سید محمد قادری ، شجرۂ خلفائیہ ، کتب خانۂ گنجی محل ، بیجاپور ، بیاض ، کتب خانۂ درگاہ شریف ، بیجاپور

۶ مجموعۂ رسائل فارسی ، انجمن ترقی اردو ، ہند ، علی گڑھ ، بیاض کتب خانہ درگاہ شریف ، بیجاپور

۷ شاخ شجرۂ مملوکہ سید اسد اللہ حسینی صاحب ، رائچور

٭ تنویر احمد علوی

تاریخ کتابت متن

ترتیب متن کی تاریخ کے تعین کے بعد کتابت متن کی تاریخ پر توجہ دینا ضروری ہے۔ (بشرطیکہ اِس کے یا اُس کے لئے ضروری وسائل موجود ہوں)۔ قلمی نسخے مختلف صورتوں میں ملتے ہیں۔ بعض مکمل ہوتے ہیں بعض نا مکمل۔ بعض پر تاریخ کتابت درج ہوتی ہے بعض پر نہیں ہوتی۔ کبھی تاریخ کتابت ہوتی ہے مگر ادھوری۔ کبھی اس کے ساتھ جو ترقیمہ ہوتا ہے اس سے ضروری امور کی وضاحت ہوجاتی ہے۔ اس سے یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ اس کا کاتب کون ہے، سنہ اور تاریخ کتابت کیا ہے، اسے کب اور کتنی مدت میں نقل کیا گیا ہے۔ کبھی اس کے ساتھ اس شخص کا نام بھی درج ہوتا ہے جس کی فرمایش پر یہ نسخہ یا نقل تیار کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ نسخہ منقول‌عنہ کی بھی نشاندہی ہوجاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ ان امور سے ایک سے زیادہ تحقیقی مسائل وابستہ ہوتے ہیں۔ نقل کرنے والا شخص اگر مصنف سے یا اس کے زمانہ سے قریبی تعلق رکھتا ہے تو اس سے روایت کی تحقیقی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی نسخہ کسی ایسے مقام پر نقل ہوا ہے جو مصنف کے اپنے علمی، ادبی یا لسانی حلقے سے قریب ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ہم اس سے یہ توقع کرسکتے ہیں کہ کاتب مصنف کی زبان، لب و لہجہ اور طرز املا سے فی الجملہ واقف رہا ہوگا، بشرطیکہ بعد زمانی یا نقل بردار کی عدم اہلیت نے صورت حال کو بدل نہ دیا ہو۔ جس نسخہ سے اسے نقل کیا گیا ہے اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے۔ ممکن ہے وہ تاریخ تحریر کے اعتبار سے قدیم تر ہو اور صحت روایت کے لحاظ سے زیادہ قابل اعتماد۔ نسخوں کے خاندانی رشتوں کے تعین میں نسخۂ منقول عنہ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ کبھی وہ شخص بھی بہت اہم ہوتا ہے جس کی فرمایش پر وہ نسخہ

ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی، ڈی۔ لٹ؛ استاد شعبۂ اردو، دلی کالج، دہلی؛ مصنف ذوق؛ مرتب کلیات ذوق، کلیات شاہ نصیر وغیرہ

نقل کیا گیا ہے. مثلاً ، اگر وہ خود اہل علم ہے یا ارباب دول میں سے ہے تو نسخہ کی تیاری میں باعتبار صحت و نفاست نسبتاً زیادہ اہتمام برتا جائے گا. عام حالات میں اس کی زیادہ توقع نہیں کی جاسکتی ہے. مثال کے طور پر یہاں نکات الشعرا کے اس قلمی نسخہ کو پیش کیا جاتا ہے جو میر عبدالولی عزلت کی فرمایش پر نقل کیا گیا تھا. ترقیمہ کے عنوان سے ، نقل کتاب کا کام انجام دینے والے نے یہ عبارت درج کی ہے :

« تمام شد نکات الشعرا ہندی من تصنیف میر محمد تقی میر تخلص بحسب فرمایش حضرت سید عبدالولی صاحب قبلہ عزلت تخلص. کاتب الحروف سید عبدالنبی ابن سید محمود ابن میر محمد رضا اصفہانی غفراللہ ذنوبہا وستر عیوبہا در بلدۂ فرخ بنیاد ، ابد بنیاد (کذا) تحریر فی التاریخ ہفدہم رمضان المبارک سنہ ۱۱۷۲ یکہزار و یک صد و ہفتاد و دو من الہجرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم. »

سید عبدالولی عزلت وہ شخصیت ہیں جن کی بیاض سے میر نے ترتیب تذکرہ کے سلسلے میں استفادہ کیا تھا اور بہت ممکن ہے کہ ان کے مابین دوستی کے باعث بعض امور پر تبادلۂ خیال بھی ہوا ہو جیسا کہ میر کے بعض بیانات سے مترشح ہوتا ہے. جس زمانہ میں میر صاحب اپنا تذکرہ ترتیب دے رہے تھے میر عبدالولی عزلت دہلی ہی میں مقیم تھے. ایسی صورت میں میر عبدالولی کی فرمایش پر اس نسخہ کا نقل ہونا اس کی تحقیقی اہمیت کو بڑھا دیتا ہے. اپنے زمانۂ کتابت کے اعتبار سے بھی یہ مخطوطہ نکات الشعرا کے معلومہ نسخوں میں قدیم ترین ہے اور اس کا امکان ہے کہ یہ کسی دہلوی نسخہ سے نقل کیا گیا ہو.

نکات الشعرا کا دوسرا قلمی نسخہ نسخۂ پیرس ہے جسے حال ہی میں ڈاکٹر محمود الہی نے مرتب کرکے اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے. یہ اول الذکر نسخہ کے چند سال بعد کا ہے جیسا کہ اس کے ترقیمہ سے واضح ہوتا ہے :

« بتاریخ ہفدہم شہر شوال روز چہار شنبہ سنہ ۱۱۷۸ ہجری در بندر سورت بموجب خواہش جمیع دوستان بہ اتمام رسید. »

اس ترقیمہ سے یہ تو معلوم نہیں ہوتا کہ نقل کتابت کا کام کس نے انجام دیا، اس کے سامنے کون سا نسخہ تھا اور یہ کہ نسخۂ مذکور کس کی فرمایش پر نقل

کیا گیا۔ مگر بندر سورت سے اس کے تعلق کے پیش نظر ڈاکٹر محمود الہی نے از روے قیاس اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ میر عبدالولی عزلت کا سورت سے گہرا تعلق تھا : « یہ بعید از قیاس نہیں کہ نسخۂ پیرس کی کتابت کے سلسلے میں عزلت کا تعاون و مشورہ شامل رہا ہو۔ »[1]

ایسے نسخے جو مصنف کو پیش کئے گئے ہوں یا کسی اہم شخصیت کی فرمایش پر انکو نقل کیا گیا ہو یا اہل دول میں سے کسی کو نذر کرنے کے لئے ان کی تیاری عمل میں آئی ہو ، نسبتاً زیادہ احتیاط کے ساتھ نقل کئے جاتے ہیں اور املا کی غلطیوں کا امکان ان میں بہت کم رہتا ہے۔ اس کی ایک بہت نمایاں مثال کتاب نورس کے نسخوں سے دی جا سکتی ہے جو ابراہیم عادل شاہ کے لئے اس کے دربار کے مشہور خطاط نے نقل کئے تھے۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے ان نسخوں کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے :

(۱) نسخہ کتاب نورس مملوکہ سینٹرل ریکارڈ آفس ، حیدرآباد۔ یہ نسخہ خط نسخ و ثلث میں ہے اور ۸۲ صفحوں پر مشتمل ہے۔۔۔۔ جلی سطریں خط ثلث میں ہیں اور خفی نسخ میں۔ خط نہایت پاکیزہ ہے۔ کتاب میں اعراب کا اہتمام خاص طور پر ہے۔ کاتب عبداللطیف مصطفیٰ ہے جو ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد کا مشہور خطاط ہے۔۔۔ خط نسخ ، ثلث اور ریحان خاص انداز سے لکھتا ہے۔ یہ نسخہ شاہی کتب خانہ کی زینت رہ چکا ہے جیسا کہ سرورق کی عبارت سے ظاہر ہے : ‹ کتاب نورس دو قلمی خط عبداللطیف ، اوراق چہل ، جمع کتب خانۂ عامرہ شد بتاریخ دو محرم سنہ ۱۰۲۲ھ ›۔

« کتاب پر ابراہیم عادل شاہ کی مہر ہے۔ آخر کتاب میں کاتب نے خود اپنا نام اس طرح لکھا ہے : ‹ کمترین شاگردان عبداللطیف مصطفیٰ › سرورق پر کاتب کے ہاتھ کی یہ عبارت پڑھی جاتی ہے : ‹ کتاب نورس نوشتہ اشرف اقدس ارفع ظل اللہ ›۔ یہ نسخہ بہت قدیم ہے۔ جب وہ سنہ ۱۰۲۲ھ میں کتاب خانۂ شاہی میں داخل ہوا تو اس سے قبل لکھا گیا ہوگا۔ »[2]

---

۱ نکات الشعرا مرتبہ ڈاکٹر محمود الہی ، ص ۱۸

۱ تحقیقی مقالے ، ۷۳ - ۷۱

ان دونوں متون سے کئی اہم امور پر روشنی پڑتی ہے ۔ یہ کتاب ابراہیم عادل شاہ کی تصنیف ہے، اس کی مہر سے مزین ہے، شاہی کتاب خانے کی زینت رہ چکی ہے، چالیس اوراق پر مشتمل ہے، اس کا کاتب ابراہیم عادل شاہ کے عہد کا مشہور خطاط ہے اور چونکہ سنہ ۱۰۲۲ھ میں داخل کتب خانۂ عامرہ ہوئی ہے اس لئے اس کی کتابت لازماً اس سے کچھ پہلے ہوئی ہے ۔ اس سے متن کی صحت اور درجۂ استناد سے متعلق اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوسکتا ہے ۔ درجۂ استناد کا تعین تاریخ کتابت متن پر گفتگو کے اساسی مقاصد میں شامل ہے ۔

یہی صورت اس کے دوسرے نسخہ کی بھی ہے جس کا تعارف فاضل مرتب نے ان الفاظ میں کرایا ہے :

« نسخۂ کتاب نورس، سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد ۔ یہ خط ریحان میں ہے اور ۶۴ صفحوں پر مشتمل ہے ۔ ۔ ۔ کاتب ابراہیم عادل شاہ کے زمانہ کا دوسرا مشہور خطاط عبدالرشید ہے ۔ سرورق پر یہ عبارت ہے : «کتاب نورس بہ خط ریحان ۔ کاتب عبدالرشید ۔ ۔ ۔ بابت جامدار خانہ جمع کتب خانۂ عامرہ شد بتاریخ ۱۷ ماہ جمادی الاول سنہ ۱۰۲۷ھ اوراق سی و دو ۔» »[1]

اس ضمن میں آگے چل کر فاضل مرتب نے لکھا ہے :

« نسخہ کی تاریخ کتابت کے بارے میں چند ضروری باتیں ہیں، بظاہر کاتب نے ۹۹۰ درج کیا ہے ۔ قیاس ہے کہ یہ نسخہ اصلی نسخہ سے تیار ہوا جو شاید خود بادشاہ کے ہاتھ کا تھا ۔ »[2]

اس سے یہ اہم نکتہ بھی سامنے آیا کہ کوئی نسخہ نقل کتابت کے اعتبار سے مؤخر ہونے کے باوصف اپنے ماخذ یعنی منقول عنہ نسخہ کے اعتبار سے تقدیم کا حامل ہوسکتا ہے جیسا کہ اس سے پیشتر بھی اشارہ کیا جا چکا ہے ۔ اگر زمانۂ کتابت کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوجائے کہ یہ نسخہ کہاں نقل کیا گیا تو اس سے بعض تحقیقی مسائل کو سمجھنے یا حل کرنے میں سہولت ہوسکتی ہے ۔ بعض نسخے ان مقامات پر نقل ہوئے ہیں خود مصنف جہاں کا رہنے والا تھا یا کسی وجہ سے وہاں مقیم تھا ۔ ایسے نسخے لسانی نقطۂ نظر سے نسبتاً زیادہ اہم ہوتے

---

۱ کتاب نورس، ص ۴۳-۷۱
۲ ایضاً

ہیں بشرطیکہ نقل کرنے والا غیر محتاط اور مقامی زبان اور لب و لہجہ سے ناواقف نہ ہو. صحت متن کے نقطۂ نظر سے بھی ان نسخوں کو زیادہ اہمیت دی جاسکتی ہے جو مصنف کے وطن یا اس کے سفر وحضر کے مقامات سے تعلق رکھتے ہوں یا پھر اس لسانی حلقہ سے وابستہ ہوں جس کے دائرہ میں رکھ کر مصنف کے انداز بیان اور خوبیء بیان کو سمجھا جا سکے. مثال کے طور پر بکٹ کہانی کے دو نسخوں کا ذکر کیا جاسکتا ہے. پہلا نسخہ راقم الحروف کی ذاتی لائبریری کی زینت ہے اور میرے پرنانا مولوی امین الدین کا نقل کیا ہوا ہے. اس کے خاتمہ کی عبارت حسب ذیل ہے:

> « تمام شد بکٹ کہانی دل لگانی کہ نسخہ مفرح است راقم طالب علم محمد امین الدین باتمام انجامیـــد، در وقت ظہر فی المسجد کاینہ محلہ انصاریاں، ۲۵ شعبان ۱۲۲۸ھ. »

محلۂ انصاریاں قصبۂ کیرانہ، ضلع مظفرنگر کے مشہور محلوں میں سے ہے. افضل کا وطن جھنجھانہ ہے جو کیرانہ سے چند کوس کے فاصلـــہ پر ہے. دونوں قصبوں کے مابین کوئی ایسی حد فاصل موجود نہیں جو لسانی اعتبار سے دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کردے. نیز خاندانی رابطوں، تجارتی لین دین اور آمدورفت کی وجہ سے دونوں کی زبان اور انداز بیـان میں کوئی فرق نہیں. یہ نسخہ بکٹ کہانی کے معلومہ نسخوں میں تاریخ کتابت کے اندراج کے اعتبار سے قدیم ترین ہے. نیز زبان کے نقطۂ نظر سے یہ بات بہت اہم ہوجاتی ہے کہ یہ نسخہ افضل کے وطن اور اس کے لسانی حلقہ سے دوسرے نسخوں کے مقابلہ میں قریب تر ہے.

افضل کے لسانی حلقہ سے وابستہ ایک دوسرے نسخہ کا تعارف بکٹ کہانی کے فاضل مرتب ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے ان الفاظ میں کرایا ہے:

> « نسخہ (نمبر ۹) ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد، میں محفوظ ہے. اس پر ۱۲۴۰ھ یوم جمعہ (مطابق سنہ ۱۸۲۴ع) تاریخ کتـابت پڑی ہے. چونکہ اس کا کاتب کھڑی بولی کے علاقہ ضلع میرٹھ میں گڈھ کلتیشر کا متوطن ہے اس لئے وہ اس بولی کے تلفظ کی صحت کا التزام رکھتا ہے یہ نسخہ نہ صرف سب سے قدیم ہے بلکہ سب سے مستند بھی کہا جاسکتا ہے. » (بکٹ کہانی، ص ۴۰۶)

اسی طرح نقل کتابت کے اعتبار سےا ن نسخوں کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے جن سے پتا چلے کہ مصنف نے کسی جگہ کسی وجہ سے اپنے سفر وحضر کے درمیان طویل یا ایک مختصر وقفہ کے لئے قیام کیا ہو ۔ اگر وہ نسخہ خود مصنف کے اپنے خط میں ہو تو اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے ۔ اس کے لئے غالب کے انتخاب کلام « گل رعنا » کے دو نسخوں کو بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے ۔ گل رعنا بخط غالب کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے :

« گل رعنا کا یہ نسخہ بخط غالب ہے اور یہ خصوصیت بجائے خود اس نسخہ کو دیگر معلوم نسخوں پر امتیاز بخشتی ہے ۔ اس مخطوطے کی ایک دوسری وجہ امتیاز یہ بھی ہے کہ اس سے پہلی بار اس انتخاب کی تاریخ معلوم ہوتی ہے جو دیگر ماخذ نسخوں میں ناقص رہ گئی ہے ۔ گل رعنا کے نسخے مخزونۂ مالک رام میں مولٰینا امتیاز علی خاں عرشی کے بقول ، سال انتخاب ناقص رہ گیا ہے ۔ تاہم یہ یقینی ہے کہ وہ قیام کلکتہ کا کارنامہ ہے جو ۴ شعبان سنہ ۱۲۴۳ھ (۱۹ فروری ۱۸۲۸ع) سے شروع ہوکر ربیع الاول سنہ ۱۲۴۵ھ (ستمبر ۱۸۲۹ع) میں ختم ہوا تھا ۔ »

« گل رعنا کے پیش نظر مخطوطے میں غالب نے دیباچہ کے آخر میں غرہ ربیع الاول سنہ ۱۲۴۴ھ کی تاریخ درج کی ہے جو عیسوی ماہ و سال کے مطابق منگل ۱۱ ستمبر ۱۸۲۸ع ہوتی ہے ۔ »[1]

یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ مثال خطی نسخوں کے سلسلہ میں بھی کام آسکتی ہے ۔ تاریخ ترتیب متن کے ذیل میں بھی اس سے استفادہ و استناد کیا جاسکتا ہے اور تاریخ کتابت متن کے بعض مسائل بھی اس سے وابستہ ہیں ۔ لسانی زاویۂ نگاہ کے اعتبار سے تو غالب کے زمانۂ قیام کلکتہ کی کوئی خاص اہمیت نہیں لیکن ادبی افکار و اقدار کے لحاظ سے اس قیام اور اس کے تعلق سے وجود میں آنے والے کارنامے کے مقام کتابت سے صرف نظر ممکن نہیں ۔ اس سے ایک سے زیادہ مسائل کا تفصیہ وابستہ ہوسکتا ہے ۔

اپنے مرتب کردہ نسخہ گل رعنا کے دیباچہ میں مالک رام صاحب نے لکھا ہے :

« آخر میں تاریخ نامکمل ہے ، محررہ نہم شوال سنہ ۱۲۷۷ھ ۔ اب

---

۱ نقوش ، بیاض غالب نمبر ، ص ۲۲۸

گل رعنا کا غالب کا اپنا لکھا ہوا نسخہ بھی لاہور میں دستیاب ہوگیا ہے جس کے آخر میں تاریخ غرۂ ربیع الاول سنہ ۱۲۴۴ھ ثبت ہے جو مطابق ہے ۱۱ ستمبر ۱۸۲۸ع کے۔ گویا غالب نے اسے اپنے کلکتہ میں ورود کے تقریباً آٹھ مہینے بعد مکمل کیا۔ میرے خیال میں نسخۂ زیر نظر کے کاتب نے دیباچہ کے آخر میں وہ تاریخ دینا چاہی تھی جب اس نے اسے نقل کیا ہے نہ کہ نسخۂ منقول عنہ کی تاریخ جو میرے نزدیک خود غالب کا لکھا ہوا نسخہ تھا۔ اگر میرا قیاس درست ہو تو یہ زیر نظر نسخہ شوال سنہ ۱۲۴۴ھ کا کتابت کردہ ہے۔ سال تحریر کی عدم تکمیل غالباً نتیجہ ہے کاتب کے سال ہجری سے ناواقفیت کا۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے بعد کو مکمل کرلے لیکن اس کا اسے موقع نہ ملا۔ سنہ ۱۲ کا لکھنا اور بقیہ خالی چھوڑ دینے کی اور کوئی توجیہ نہیں ہوسکتی۔»[1]

یہ قیاس آرائی تحقیق طلب ہے۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ پر کافی اہم ہے کہ کیا یہ نسخہ کلکتہ میں نقل ہوا؟ اگر ایسا ہے تو اسے غالب کے زمانۂ قیام میں نقل ہونا چاہیئے اس لئے کہ مولوی کرم حسین جن کے خاندانی کتاب خانے سے یہ نسخہ ملا ہے کلکتہ میں قیام پذیر تھے اور غالب کے قیام کلکتہ کے دوران ان سے اور غالب سے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ اس لئے گمان غالب ہے کہ اس نسخہ کی نقل غالب کے قیام کلکتہ کے دوران ہی عمل میں آئی ہوگی۔

ناقص سال تاریخ کا اندراج اسی ایک نسخہ ہی کے ساتھ نہیں، بہت سے نسخوں کے ساتھ وابستہ رہا ہے۔ اسی کے ساتھ بہت سے ایسے نسخے بھی ہیں جن کے ساتھ کوئی تاریخ کتابت پوری یا ادھوری موجود ہی نہیں۔ تاریخ کتابت کے اندراج، ناقص اندراج یا عدم اندراج کے اعتبار سے قلمی نسخوں کو چار شقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

الف۔　وہ نسخے جن کے ساتھ کوئی ایسا ترقیمہ موجود ہے جس میں تاریخ تحریر مع ضروری تفصیلات (یعنی وقت، مقام، نام کاتب، فرمایش وغیرہ) موجود ہے۔

ب۔　جن میں صرف تاریخ کتابت اختصار کے ساتھ ملتی ہے۔

۱　گل رعنا، ص ۲۰

ج۔ تاریخ کتابت موجود ہے مگر ناقص۔

د۔ تاریخ کتابت یا ایسا کوئی ترقیمہ موجود ہی نہیں جس سے فی الجملہ زمانۂ کتابت پر کوئی روشنی پڑتی ہو۔ تاریخ کتابت کی عدم موجودگی کاتب متن کے تساہل کا نتیجہ بھی ہوسکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ متن کے اول و آخر حصوں کے ضائع ہوجانے کی وجہ سے کوئی نسخہ تاریخ کتابت سے محروم ہو گیا ہو۔

مختلف قلمی نسخوں کی تاریخ کتابت سے بحث تحقیق و ترتیب متن کے لحاظ سے غیر معمولی اہمیت رکھنے والی بات ہے اور متون کی ترتیب کے وقت اس کی طرف کافی و شافی توجہ دینا ضروری ہے۔ ہمارے یہاں اس بارۂ خاص میں مرتبین کا طریقہ‌کار مختلف رہا ہے۔ بعض نے صرف نسخوں کا حوالہ دینا کافی سمجھا اور ان کی تاریخی حیثیت کی مناسب حدود کے ساتھ نشاندہی کو ضروری خیال نہیں کیا۔ اس کی ایک مثال قطب مشتری سے دی جاسکتی ہے۔ اس کے فاضل مرتب نے لکھا ہے

« یہ مثنوی میں نے دو نسخوں سے مرتب کی ہے۔ ایک قلمی نسخہ میرے پاس ہے جو بہت پرانا معلوم ہوتا ہے لیکن ناقص اور نامکمل ہے اور اول و آخر اور بیچ میں سے ورق غائب ہیں۔ دوسرا نسخہ برٹش میوزیم، لندن، کا ہے جس کا عکس منگا لیا گیا تھا۔ ان دونوں نسخوں سے مقابلہ کرکے یہ نسخہ ترتیب دیا گیا ہے۔ ۔ ۔ ۔

« میرے نسخے کی دو خصوصیتیں قابل ذکر ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ زیادہ بڑا ہے یعنی اس میں بعض بیان ایسے ہیں جو برٹش میوزیم کے نسخے میں نہیں۔ مثلاً، سفر میں شہزادے کو جو مہمیں پیش آئی ہیں وہ لندن والے نسخے میں صرف دو ہیں، اژدہے اور دیو کی لڑائی۔ لیکن میرے نسخے میں سیمرغ کا بھی مقابلہ ہے۔ اسی طرح اور بھی کئی مقامات میں اضافہ ہے۔ ۔ ۔ بعض مقامات پر اشعار بھی زیادہ ہیں۔ ۔ ۔ ایک غزل بھی زائد نکلی۔ ۔ ۔ ایک دوسری خصوصیت میرے نسخے کی یہ ہے کہ اس کا رسم خط عجیب قسم کا ہے۔ خط نسخ ہے لیکن الفاظ میں اکثر حروف علت کا کام اعراب سے لیا ہے، خصوصاً ان حروف علت کے لئے جو لفظ آخر میں آتے ہیں۔ مثلاً اس مصرع کو « جو بےربط بولے تو بتیاں پچیس » یوں لکھا گیا ہے:

جو بِ ربط بول توں بتیاں پچیس۔ »[1]

---

[1] قطب مشتری، دیباچۂ مرتب، ص ۱۹ - ۱۸

اس میں دونوں نسخوں میں شامل متن کا تقابلی مطالعہ تو ایک حد تک پیش نظر ہے لیکن دونوں نسخوں کی تاریخ کتابت یا مصنف کے زمانہ سے قربت و بعد اور زمانۂ کتابت کی تقدیم و تاخیر پر کوئی گفتگو نہیں۔ ایسی مثالیں اور بھی موجود ہیں جہاں اساسی نسخوں سے بحث کرتے وقت تاریخ کتابت متن پر پوری توجہ نہیں دی گئی۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ مناسب نہیں اور مختلف نسخوں کی تاریخی اہمیت اور درجۂ استناد پر تنقیدی گفتگو کے بغیر ان کو اساسی نسخہ قرار دئے جانے کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں ہوسکتی۔ دوسرا طریقۂ کار یہ ہے جو بہت سے مرتبین کے یہاں ملتا ہے کہ مختلف نسخوں کا اجمالی تعارف کرادیا جائے اور مؤرخہ نسخوں کی تاریخ تحریر بھی درج کردی جائے۔ ایسی مثالیں نسبتاً زیادہ تعداد میں موجود ہیں۔ یہاں مختصراً بعض دواوین کے ایسے قلمی نسخوں کا ذکر کیا جاتا ہے جن کے ساتھ تاریخ تحریر درج ہے:

« دیوان درد ، قلمی ، مکتوبہ سنہ ۱۲۰۰ھ ، ادارۂ ادبیات اردو ، حیدرآباد۔

دیوان درد ، قلمی ، مکتوبہ سنہ ۱۲۱۷ھ ، ادارۂ ادبیات اردو ، حیدرآباد۔

ترقیمہ : تمت تمام شد کار من نظام شد دیوان میر درد بتاریخ دوازدہم ماہ جمادی الاول بروز سہ شنبہ ۱۲۱۷ھ بموضع پچنبہ (کذا) قصبہ ماتا تحریر یافت

نوشتہ بماند بخط غریب کہ نصر من اللہ فتح قریب

دیوان درد ، قلمی ، مکتوبہ سنہ ۱۲۲۰ھ ، رضا لائبریری ، رامپور

دیوان درد ، قلمی ، مکتوبہ سنہ ۱۲۲۲ھ ، ذخیرۂ احسن مارہروی ، آزاد لائبریری ، مسلم یونیورسٹی ، علی گڑھ۔

دیوان درد ، قلمی ، مکتوبہ ۱۲۲۳ھ ، (بمقام بیدر) ادارۂ ادبیات اردو ، حیدرآباد

دیوان درد ، قلمی ، مکتوبہ ۱۲۲۵ھ ، (بمقام حیدرآباد) ادارۂ ادبیات اردو ، حیدرآباد

دیوان درد ، قلمی ، مکتوبہ سنہ ۱۲۲۵ھ ، رضا لائبریری ، رامپور
دیوان درد ، قلمی ، مکتوبہ سنہ ۱۲۵۶ھ ، رضا لائبریری ، رامپور
دیوان درد ، قلمی ، مکتوبہ سنہ ۱۲۶۳ھ ، رضا لائبریری ، رامپور[1]

---

۱ راقم الحروف دیوان درد کے ان قلمی نسخوں سے متعلق معلومات بہم پہنچانے کے لئے محبی ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کا مرہون منت ہے۔

فہرست مخطوطات مخزونہ ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد، جلد دوم میں بعض نسخوں کا تعارف مختصراً اس طور پر کرایا گیا ہے جس سے ان کی تاریخ کتابت پر بھی فی الجملہ روشنی پڑتی ہے:

«دیوان درد (تمت بالخیر) کتاب دیوان خواجہ میر درد حسب فرمایش مشفقی محمد حسین جمعدار ارقام یافت ... تسطیر از دست خاکپائے خلق اللہ سید اسرار علی شاہ، ساکن نرمل، بتاریخ سلخ ذی الحجہ، یوم دو شنبہ' وقت یکپاس در ساعت مشتری ارقام اختتام شد. محررہ (نسخہ مسطور) سنہ ۱۲۶۳ھ.

«زیر بحث نسخہ مکمل ہے. خط پاکیزہ اور نستعلیق ہے حاشیے پر مختلف نسخوں کے الفاظ اور اشعار کا اضافہ بھی کیا گیا ہے. تخلص سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے. یہ نسخہ نواب عنایت جنگ بہادر کا عطیہ ہے. پہلے ورق پر ان کے دستخط اور آخری ورق پر ایک مدور بیضوی مہر ہے.»[1]

ایک اور نسخہ کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ہے:

«یہ نسخہ دوسرے نسخوں کے مقابلہ میں زیادہ پاک صاف اور قدیم ہے. بہت خوش خط لکھا گیا ہے اور خاص اہتمام سے نقل کیا گیا ہے. ہر صفحے پر سرخ روشنائی سے جدولیں تیار کی گئی ہیں. سیاہی نہایت روشن ہے اور کاغذ بھی بہت عمدہ اور باریک ہے. رسم خط اور نہج کتابت سے درد کے قریبی زمانہ کا مکتوبہ معلوم ہوتا ہے. ناقص الآخر ہے اس لئے کاتب اور سنہ کتابت کا علم نہ ہوسکا. اس کے سرورق پر یہ عبارت لکھی ہے:

مجموعۂ ہذا از ملک محمد عبدالرحمن عفی اللہ عنہ»[2]

ایک اور نسخہ کا تعارف جو بمقام بیدر نقل کیا گیا ان الفاظ میں کرایا گیا ہے:

«خواجہ میر درد (۱۱۹۹ - ۱۱۳۸) یہ ان کے کلام کا ناقص الطرفین نسخہ ہے جو بہت کرم خوردہ ہے. اس کے پہلے ورق پر تفضل حسین سنہ ۱۲۸۱ھ کی مہر ہے. غالباً غلام حسین بیدری نے سنہ ۱۲۲۲ھ میں نقل کیا ہے.»

۱　فہرست مخطوطات ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد جلد دوم، ص ۴۹۸

۲　فہرست مخطوطات ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد جلد دوم، ص ۴۹۹

مگر فہرست نگار نے اس قیاس کے لئے کوئی توجیہ پیش نہیں کی۔

نسخہ‌ہائے دیوان ولی:

دیوان ولی، قلمی، مخزونہ کتب خانۂ نواب نصیر حسین خیال عظیم آبادی، سنہ ۱۱۲۰ھ نوشتہ بمقام اورنگ‌آباد۔

دیوان ولی، قلمی، اوراق ۸۴، تاریخ تحریر بست و ہفتم ربیع الثانی ۱۱۴۱ھ، سب سے زیادہ صحیح اور مستند۔

دیوان ولی، قلمی، خط نستعلیق صاف، نوشتہ محمد جعفر، تاریخ پنجم شہر ذی قعد سنہ ۱۷ جلوس محمد شاہ (۱۱۴۷ھ) اوراق ۱۲۴

دیوان ولی، قلمی، مخزونہ کتب خانۂ احسن مارہروی، سنہ کتابت ۲۴ جلوس محمد شاہی، سنہ ۱۱۵۴

دیوان ولی، قلمی، مخزونہ کتب خانۂ سبحان اللہ، رئیس گورکھپور مکتوبہ سنہ ۱۱۵۸ھ

دیوان ولی، قلمی، اوراق ۱۲۷، نوشتہ کرم علی، تاریخ بست و یکم جمادی الاول سنہ ۱۲۲۹ھ، بروز پنج‌شنبہ۔

دیوان ولی کے بہت سے قلمی نسخوں میں سے یہ چند نسخے ہیں جن کی تقطیع اور مسطر کا ذکر بھی اس مختصر تعارف کے ساتھ موجود ہے۔

دیوان ولی کے قلمی نسخوں میں بہت سے قلمی نسخے ایسے بھی ہیں جو تاریخ تحریر سے محروم ہیں۔ ان نسخوں سے متن کی قرأت، تفہیم اور تصحیح میں مدد لی جاسکتی ہے لیکن تاریخ کتابت متن کے سلسلہ میں ایسے نسخے اپنی سادہ صورت میں مفید مطلب نہیں ہوتے۔ ایسے نسخوں کے دوسرے نسخوں کے ساتھ تحقیقی اور تقابلی مطالعہ کے وسیلہ سے ان کے زمانۂ کتابت کے تعین میں مدد لی جاسکتی ہے۔ اس تقابلی مطالعہ میں سواد خط، طرز املا، کاغذ کی قسم و نوعیت، نسخوں کی باہمی مماثلت اور روایتوں کا تفاوت و تفاوق زمانۂ کتابت کے استقرائی تعین میں مجموعی طور پر بہت مددگار ثابت ہوئے اس لحاظ سے تاریخ کتابت متن کے مطالعہ کو دو حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے: خارجی تعین، استقرائی تعین۔

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے بعض نسخوں کی تاریخ کتابت کے استقرائی تعین کی بھی کوشش کی ہے:

«دیوان ولی، قلمی، اوراق ۱۲۶، کاتب کا نام اور سنہ کتابت درج نہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اواخر بارھویں صدی کا نوشتہ ہے کیونکہ دیوان کے اول صفحے پر حجام شاہ جہاں آبادی کی دو فارسی رباعیاں اور آخری صفحہ پر اسی کی دو اور رباعیاں موجود ہیں یہ رباعیاں اسی خط میں ہیں۔»

اس سے پروفیسر ہاشمی نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس نسخہ کا زمانۂ کتابت وہی ہونا چاہئے جو حجام کا زمانۂ شاعری ہے۔ لیکن ایسے قیاسات کے سلسلہ میں امکانی احتیاط اور چھان بین ضروری ہے۔ تحقیق میں قیاس مع الفارق کی کوئی گنجایش نہیں، خاص طور پر استقرائی تعین کے دلائل زیادہ مستحکم اور قابل وثوق ہونے چاہئیں۔

جن نسخوں پر تاریخ تحریر درج ہوتی ہے (جو بالعموم نقل کتابت کے زمانۂ اختتام کی طرف اشارہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے) ان کا مطالعہ بھی بڑی احتیاط سے کرنا چاہئے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی نسخہ پر جو تاریخ کتابت درج ہوتی ہے وہ نسخۂ منقول عنہ سے تعلق رکھتی ہے اور زیر نظر نسخہ اس کے بعد اور بعض اوقات بہت بعد کا ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی نسخہ کا کوئی جز اپنی کتابت کے اعتبار سے قدیم ہو اور بعض اجزا اس کے مقابلہ میں جدیدالاصل ہوں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ محض تاریخ کتابت کا اندراج کسی نسخہ کی قدامت کا واحد ثبوت نہیں ہوسکتا۔ دوسرے شواہد و قرائن بھی اس کے حق میں ہونے چاہئیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی ممکن ہے (اور اس کی طرف اس سے پہلے بھی اشارہ کیا جاچکا ہے) کہ جس نسخہ پر تاریخ تحریر موجود نہ ہو یا ضائع ہوگئی ہو اس کے مشتملات وہی ہوں اور نقل روایت کا اسلوب بھی بالکل وہی ہو جو کسی قدیم تر نسخہ کا ہے اس سے اس کے زمانہ کو سمجھنے میں مدد مل ہی سکتی ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قرائن اس کی طرف رہنمائی کریں کہ زیر بحث نسخہ کسی قدیم اور مؤرخہ نسخہ سے بھی زیادہ قدیم ہونا چاہئے۔

بکٹ کہانی (مرتبۂ داکٹر نور الحسن ہاشمی اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں) میں بھی اساسی نسخوں کے زمانۂ کتابت کے سادہ تعارف ہی کے اصول کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اس کا موجودہ متن دس قلمی نسخوں کی مدد سے تیار کیا گیا ہے۔

ان میں سے صرف تین نسخوں پر سنہ کتابت ہے جن کا تعارف حسب ذیل ہے :

(۱) «ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد، میں محفوظ ہے۔ اس پر سنہ ۱۲۴۰ھ، یوم جمعہ (مطابق ۱۸۲۴ع) تاریخ کتابت پڑی ہے ... یہ نسخہ نہ صرف سب سے قدیم ہے بلکہ سب سے مستند بھی کہا جا سکتا ہے۔»[۱]

(۲) «انڈیا آفس لائبریری کا نسخہ ... ہے۔ کاتب کم سواد ہے۔ بدخط مگر صاف ہے۔ ترقیمہ یہ ہے : دستخط عبد الکریم برائے پاس خاطر خود نوشتیم۔ ہر کس کہ دعوا کند باطل گردد۔ ۱۲۴۵ھ ماہ سابان، تاریخ بست و پنجم، روز شنبہ۔»[۲]

(۳) «یہ نسخہ پٹنہ یونیورسٹی میں ہے ... یہ نسخہ دکن میں لکھا گیا ہے ... ترقیمہ میں یہ عبارت ہے : تمت تمام شد روز چہار شنبہ، بوقت دوپہر تمام شد۔ ماہ شوال ۲۵ سنہ ۱۲۷۹ھ۔ کاتب الحروف قطب الدین عرف میر صدر الدین غفر لہ بن حیدر علی در مقام سکندر آباد۔»[۳]

باقی نسخے سنہ کتابت سے محروم ہیں۔ مگر بعض نسخوں پر عبارت ہائے خاتمہ موجود ہیں۔ مثلاً ایک نسخہ کے ساتھ اس ترقیمہ کا ذکر ہے :

«انڈیا آفس لائبریری کا نسخہ . . . ہے۔ خط شفیق صاف ستھرا۔ ترقیمہ میں صرف اتنا درج ہے : تمام شد قصۂ بارہ ماسہ بکٹ کہانی روز چہار شنبہ۔»[۴]

ایک اور نسخہ میں ترقیمہ کے طور پر صرف «تمام شد» درج کیا گیا ہے اور بس۔ ظاہر ہے کہ تمت یا تمام شد لکھنے یا پھر محض تاریخ تحریر یا ترقیمہ کے طور پر تحریر کے دن کا اندراج کافی نہیں۔ ایسے نسخوں سے تاریخ کتابت متن کو سمجھنے میں کوئی بڑی مدد خارجی طور پر نہیں ملتی۔ لیکن کبھی کبھی نسخہ کے غائر مطالعہ سے کوئی ایسا مزید اشارہ مل جاتا ہے جس سے تحقیقی تعین کی راہ کھل جاتی ہے۔ نو دریافت دیوان غالب بخط غالب کے ترقیمہ کی روشنی میں زمانۂ

---

۱ بکٹ کہانی، حیدرآباد، عثمانیہ یونیورسٹی، ۱۹۶۵ع، ص ٦ - ۴۰۵
۲ ایضاً، ص ۴۰۳
۳ ایضاً
۴ ایضاً

کتابت کا استقرائی تعین اس طور پر کیا گیا ہے :

« نسخۂ امروہہ (بیاض غالب) کے اختتام پر واضح الفاظ میں ترقیمہ موجود ہے [بتاریخ چہاردہم رجب المرجب، یوم سہ شنبہ ، سنہ ہجری ، وقت دوپہر روز باقی ماندہ فقیر بیدل اسداللہ خاں عرف مرزا نوشہ متخلص بہ اسد غفر اللہ عنہ از تحریر دیوان حسرت عنوان خود فراغت یافتہ . . . . »]

« جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا غالب اس دیوان کی کتابت سے ۱۴ رجب کو منگل کے دن شام کے وقت فارغ ہوئے تھے . مگر افسوس ہے کہ انہوں نے سنہ ہجری کے اعداد نہیں لکھے . . . بصورت موجودہ ہمیں دوسرے ذرائع سے سنہ کی تعین کرنی پڑتی ہے .

« سب سے پہلے تو ہم اس سنہ کی آخری ممکنہ حد متعین کرلیں جب یہ نسخہ لکھا گیا . اتفاق سے اس کی ایک قوی اندرونی شہادت موجود ہے. ورق ۴۱ الف کے حاشئے پر غالب نے اپنے قلم سے ایک مختصر یاد داشت لکھی ہے [لعل خاں اول صفر سنہ ۱۲۳۵ ھ درماہہ دو روپے آٹھ آنے . . .] ورق ۴۱ الف پر اس یاد داشت کا ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ اس تاریخ تک دیوان لکھا جاچکا تھا ورنہ یہ عبارت اول و آخر کے کسی صفحے پر ہونا چاہئے تھی . اب دیکھنا یہ ہے کہ تقویم ہجری و عیسوی کی رو سے ۱۴ رجب کس سال منگل کے دن واقع ہوئی تھی. تقویم کا حساب بتاتا ہے کہ ۱۲۳۱ھ میں ۱۴ رجب کو بدھ کا دن تھا واقعی تاریخ اور اس حساب میں ایک دن کا فرق رویت کی وجہ سے رہ جاتا ہے اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ سنہ ۱۲۳۱ھ میں رجب کا چاند ۲۹ جمادی الثانی کو نظر آیا تھا تو ۱۴ رجب کو سہ شنبہ ہی پڑتا ہے سنہ ۱۲۳۱ھ میں غالب کی عمر ۱۹ سال ہوتی ہے اور انہوں نے اپنی شاعری کے آغاز اور جمع دیوان کے بارہ میں جو شہادتیں چھوڑی ہیں ان سے اس سنہ کو تسلیم کرلینے میں کوئی تناقض یا تضاد نہیں ہے . »[1]

اس پر بحث کا سلسلہ ہنوز جاری ہے . بہرحال زمانۂ کتابت کے استقرائی تعین کے سلسلے میں اس طریق رسائی سے کلیتاً صرف نظر ممکن نہیں . اس کے مقابلہ میں

---

۱ نقوش ، (بیاض غالب نمبر) ، ص ۱٦

ایک بہت بڑی تعداد میں ایسے نسخے ملتے ہیں جن کے ساتھ ایسا کوئی اشارہ بھی موجود نہیں ہوتا اور جو تاریخ کتابت کے اندراج سے کلیتاً محروم ہوتے ہیں لیکن اس کا امکان رہتا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک نسخہ یا ایک سے زائد نسخے اندراج تاریخ والے نسخوں کے مقابلہ میں قدیم تر ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسے نسخوں کی قدامت کا فیصلہ خارجی شواہد کی مدد سے اگر نہیں کیا جاسکتا تو داخلی شواہد کی جانب رجوع ناگزیر ہوجاتا ہے جس میں املائی اور لسانی مطالعہ کو بطور خاص اہمیت حاصل ہے۔ ایسے شواہد کی مدد سے، اگر تحقیقی نقطۂ نظر سے ان کو اہمیت دی جاسکے، حتمی اور قطعی صورت میں نہ سہی قیاسی اعتبار سے کوئی فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ ایسے فیصلے غیراہم نہیں ہوتے، بشرطیکہ ان کی اساس غیرتحقیقی مزعومات پر نہ ہو، بلکہ ان سے دیگر مسائل کے تصفیہ میں آسانی ہوجاتی ہے۔ تحقیقی احتیاط کے طور پر ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ ان کو تاریخ کتابت متن کے سلسلہ میں زیر بحث ہی نہ لایا جائے جیسا کہ بعض مرتبین کے طریق کار سے اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن زیادہ مستحسن اسلوب یہ ہے کہ ایسے نسخوں کے سلسلہ میں بھی، معروضی اور موضوعی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے مناسب حدود کے ساتھ ان کی تاریخ کتابت متن یا زمانۂ تحریر پر گفتگو کی جائے تاکہ فی الجملہ ان کی تاریخی ترتیب کا تعین کیا جا سکے جس کے بغیر ترتیب متن کے سلسلے میں ان سے استناد پر وثوق سطح پر ممکن نہ ہوگا۔ ہاں تصحیح متن میں ان سے ضرور مدد لی جاسکتی ہے۔ اس طرح کے استقرائی تعین اور اس کے ساتھ تاریخ کتابت متن پر تنقیدی گفتگو کے لئے دیوان نصیر اور کلیات ممنون کے قلمی نسخوں کو سامنے رکھا جاسکتا ہے۔

شاہ نصیر مرحوم کے معلومہ قلمی نسخوں میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جس پر تاریخ کتابت درج ہو۔ تاہم داخلی اور کچھ خارجی شواہد کی مدد سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ نسخۂ آصفیہ اپنے زمانۂ کتابت کے لحاظ سے سب سے قدیم ہے۔ اس نسخہ کا تعارف کراتے ہوئے مولوی نصیرالدین ہاشمی (مرحوم) نے لکھا ہے:

> « اس دیوان میں ردیف وار غزلیات ہیں۔ ہر ردیف کے بعد سادہ صفحہ چھوڑا گیا ہے۔ آخری ۱۵ صفحے دوسرے کاغذ اور دوسرے خط سے شامل کئے گئے ہیں۔ بعض صفحوں میں حاشئے پر بھی غزلیات

کا اضافہ کیا گیا ہے . . . . بقول بعض دیوان نصیر کا یہ نسخہ بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ [اس میں] نصیر کے استاد سائل کی قلمی اصلاحیں شامل ہیں .»[۱]

اس موقع پر غلطی سے مائل کو سائل لکھدیا گیا ہے . شاہ محمدی مائل شاہ نصیر کے استاد اور کسی رشتے سے ان کے عزیز تھے . ان کا انتقال سنہ ۱۲۰۱ھ کے قریب ہوچکا تھا . اس وقت تک شاہ نصیر کے دیوان کا مرتب ہوجانا زیادہ قرین امکان نہیں . تاہم یہ بات قرین قیاس ہے کہ موجودہ نسخوں میں غالباً یہ شاہ نصیر کے کلام کا سب سے قدیم مجموعۂ کلام ہو . اس میں کلام نصیر کی جو روایت ملتی ہے وہ اپنے لب و لہجہ ، زبان ، الفاظ کی استخواں بندی اور فقرات کی ترتیب‌دہی کے اعتبار سے زیادہ قدیم ہے . اس کے چند آخری صفحات کو مستثنے کرتے ہوئے اس کی کتابت جس کاغذ پر ہوئی ہے وہ بھی نسبتاً بہت پرانا ہے . اس کا رنگ سرمئی مائل زرد ہے اور باریک ہونے کے باوصف بہت مضبوط ہے . کاتب شاہ نصیر اور ان کے کلام سے اچھی طرح واقف معلوم ہوتا ہے جس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس نے بعض غزلوں کی تحریر کے وقت مقطع سے پہلے جگہ چھوڑدی ہے ، بعض مقامات پر « دریافت طلب » اور بعض جگہوں پر « غور طلب » لکھا ہے . اس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ ان غزلیات کی ترتیب غالباً شاہ نصیر کی زندگی میں ہوئی ہے اور بہت ممکن ہے کہ تبئیض کار شاہ نصیر کا کوئی شاگرد ہو .

نسخہ پٹیالہ :

یہ نسخہ کلام نصیر کا دوسرا اہم اور قدیم ماخذ ہے . کاغذ اور خط کے لحاظ سے یہ نسخہ پچھلی صدی عیسوی کے نصف آخر کا مرتبہ معلوم ہوتا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ یہ شاہ نصیر کی وفات (۱۲۵۴ھ) کے بعد کی تحریر ہے . خط صاف ، کاغذ باریک اور کافی مضبوط ہے . کاتب غالباً پنجاب کا رہنے والا ہے . بعض الفاظ کے لکھنے کا انداز اس کے پنجابی تلفظ کی طرف اشارہ کرتا ہے . مثلاً ، اس نے ابر کو «ابـر»، روؤں کو « رواوں » اور گاؤں کو « گاووں » لکھا ہے . چھوٹی س پر تشدید کی شکل ۔ کا نشان بنادیا گیا ہے . یہ طریقہ کشمیر کے علاقہ میں ہنوز رائج ہے . تاے ہندی کو ٹ کی علامت کے ساتھ ظاہر کیا ہے . اس سے

---

۱ فہرست مخطوطات اردو ، اسٹیٹ سنٹرل لائبریری ، حیدرآباد ، جلد اول ، ص ۴۱

گمان پڑتا ہے کہ کاتب یا تو کسی پرانے نسخہ سے نقل کررہا ہے یا طرز املا میں قدیم روش سے زیادہ مزاولت رکھتا ہے۔ اس میں ایسی غزلیں بھی موجود ہیں جو حاشیے پر بھی موجود ہیں اور جوض میں بھی، مگر ایک ہی صفحے پر نہیں بلکہ دو مختلف صفحات پر، جس کے یہ معنی ہیں کہ حوض میں نقل ہونے والی روایت نسخہ مبنی علیہ سے تعلق رکھتی ہے اور حاشیے کا منقول عنہ نسخہ دوسرا ہے۔ ممکن ہے یہ دوسرا نسخہ کوئی بیاض ہو۔ بعض غزلوں میں اشعار کی تعداد نسخۂ آصفیہ کے مقابلہ میں زائد ہے جس کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ یہ نسخہ آصفیہ کے مقابلہ میں جدید روایت ہے اور اس کی اساس بعد کے نسخوں پر ہے۔ اس کے ساتھ ایسی کوئی شہادت موجود نہیں جس سے باوثوق سطح پر اس کے زمانۂ کتابت کا پتہ چل سکے۔ لیکن یہ نسخۂ آصفیہ سے بہرحال مؤخر معلوم ہوتا ہے۔

نسخۂ رامپور:

یہ کلام نصیر کا سب سے مکمل مجموعہ ہے جو رضا لائبریری، رامپور، کی زینت ہے۔ اس سے متعلق کتب خانہ کی فہرست کے خانۂ کیفیت میں لکھا ہے:

> « دیوان نصیر، شاہ نصیر الدین بن شاہ غریب دہلوی متخلص بہ نصیر، متوفی سنہ ١٢٥٤ھ، بعہد خلد آشیاں، بخط تسکیں، (غالباً) تعداد اوراق ٢٨٢۔ »

آب حیات میں اس نسخہ کے بارے میں یہ روایت ملتی ہے:

> « دہلی میں میرحسین تسکین ایک طباع اور نازک خیال شاعر تھے۔ ان کے بیٹے سید عبدالرحمن بھی صاحب مذاق اور سخن فہم شخص تھے۔ انھوں نے بڑی محنت سے ایک نمونہ ایسا جمع کیا کہ اس سے زیادہ ایک جگہ شاہ صاحب کا کلام جمع نہ ہوگا۔ نواب صاحب رامپور نے ایک رقم معقول دیکر وہ نسخہ منگا لیا۔ غزلیں اکثر جگہ پائی جاتی ہیں مگر قصیدے نہیں ملتے کہ وہ بھی بہت تھے۔ »[1]

اس نسخہ کے مندرجات سے مولانا محمد حسین آزاد شاید واقف نہیں تھے ورنہ آخری فقرہ ان کے قلم سے نہ نکلتا اس لئے کہ اس نسخہ میں مدحیہ قصائد بھی اچھی بڑی تعداد میں شامل ہیں اور مخمسات و مسدسات کی صورت میں جو مدحیہ

---

١ مولانا محمد حسین آزاد، آب حیات، دوسرا اڈیشن (١٨٨٧ع)، ص ٤٢٥

اشعار ملتے ہیں وہ ان کے علاوہ ہیں۔ غزلوں کی تعداد بھی اس نسخہ میں دیگر قلمی نسخوں سے کہیں زیادہ ہے ... یہ نسخہ مذکورۃ الصدر دونوں نسخوں کے مقابلہ میں جدید ہے۔ پتہ چلانا تو دشوار ہے کہ یہ دیوان ریاست کے کتاب خانہ میں کب داخل ہوا۔ دفتر اندراج کتب سے بھی اس کا پتہ نہ چل سکا۔ لیکن اس کے کاتب کی شخصیت متحقق ہے اور اس کے تسوید پانے کا زمانہ کچھ حدود کے ساتھ متعین کیا جاسکتا ہے۔ یہ آب حیات کی تالیف (۱۸۸۰ع) سے پہلے داخل کتب خانۂ عالیہ ہوچکا تھا۔ یہ نسخہ اپنے اسلوب تحریر اور روایت کلام کی جمع آوری کے اعتبار سے بھی باقی دونوں نسخوں کے مقابلہ میں جدید الاصل ہے۔

ایسی ہی اور اس سے کچھ مختلف نوعیت کی مثالیں کلیات ممنون کے قلمی نسخوں میں ملتی ہیں:

نسخہ آصفیہ:

اسٹیٹ سنٹرل لائبریری (کتب خانۂ آصفیہ)، حیدرآباد، دکن کی زینت ہے۔ کاغذ کا رنگ سیاہی مائل پیلا ہے۔ خط معمولی نستعلیق ہے۔ قلم قدرے جلی استعمال کیا گیا ہے۔ قصائد، مثنویاں اور قطعات جو شروع میں لکھے گئے ہیں وہ خوش خط نستعلیق خط میں ہیں۔ مگر کچھ حصہ کے بعد خط بدل گیا ہے۔ غزلیات میں خطوط کی تعداد اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ان میں خط کہیں معمولی نستعلیق اور کہیں شکستہ ہے۔ بعض غزلیں تو بہت ہی خراب خط میں نقل ہوئی ہیں۔ ہر کاتب کا اپنا انداز نگارش ہے۔ کسی نے نقطوں کے معاملہ میں بے احتیاطی برتی ہے، کسی نے ہائے ہوز کو ہائے دوچشمی سے لکھا ہے۔

اس کے پہلے صفحہ پر یہ عبارت درج ہے: «کلیات ممنون نوشتہ خود مؤلف» اس میں اور اندرونی تحریر میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا لیکن یہ بات صرف شروع کے حصے سے متعلق ہے۔ بعد کی تحریریں اور خط ایک نہیں ہیں۔ اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ نسخہ مصنف کے اپنے قلم کا مرہون منت ہے۔ اس میں کوئی ایسی تحریر، حاشیہ، تعلیقہ یا ترقیمہ یا مہر بھی موجود نہیں جسے اس کے حق میں ایک خارجی شہادت تصور کیا جائے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ مصنف نے خود اس نسخہ کی تسوید کا ارادہ کیا ہو لیکن کچھ حصہ کی نقل کے بعد اس کے

بجائے کسی دوسرے اور اس کے بعد کسی تیسرے شخص نے یہ کام انجام دیا ہو. یہ تبئیض کار ممنون کے شاگرد بھی ہوسکتے ہیں . جہاں طرز کتابت خوش خط اور صاف ہے وہاں طرز املا میں نسبتاً زیادہ قدامت ہے . بدلے ہوئے خط میں جو تحریریں ہیں ان کا اندازہ بھی املائی خصوصیات کے اعتبار سے کچھ زیادہ مختلف نہیں .

موجودہ صورت میں اس کے بارے میں کوئی فیصلہ وثوق کے ساتھ تو نہیں کیا جاسکتا کہ یہ مصنف کا اپنا نسخہ ہے یا نہیں لیکن املا ، طرزکتابت اور کاغذ سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ یہ دیوان ممنون کا قدیم ترین نسخہ ہے . اس کی بعض املائی خصوصیات یہ ہیں :

وو (وہ) ، اوڑ (اُڑ) ، نیں (نے) ، تجے (تجھے) ، دھنویں (دھوئیں) ، پہونچوں (پہنچوں) ، اسے (اس سے) ، جسے (جس سے) . ی کے ساتھ ایسے مواقع پر بھی نقطے دئے گئے ہیں جہاں بعد کے طرز املا میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی .

ان شواہد اور بعض دوسرے قرائن کی موجودگی میں اس نتیجہ پر پہنچا جا سکتا ہے کہ ممنون کے قلمی ماخذ میں یہ نسخہ دوسرے نسخوں کے مقابلہ میں زیادہ قدیم ہے . اس کے مندرجات میں ۱۲۵۳ھ تک کے قطعات ملتے ہیں . مگر آخر میں آنے والے یہ قطعات ممکن ہے بعد کا اضافہ ہوں .

نسخۂ پٹیالہ :

یہ نسخہ پٹیالہ سنٹرل پبلک لائبریری کے ذخیرۂ کتب کی زینت ہے . یہ عجیب اتفاق ہے کہ نسخۂ آصفیہ کی طرح اس میں بھی قصائد ، مثنویات و قطعات کا حصہ ایک ہی قلم سے ہے . خط خوش خط ، نستعلیق ، قدرے جلی ہے . غزلیات کا حصہ ایک سے زیادہ کاتبوں کا تحریر کیا ہوا معلوم ہوتا ہے . عنوانات اور تخلص شنگرفی ہیں . مگر شروع سے آخر تک اس کا التزام نہیں ملتا. کہیں کہیں تخلص کی جگہ خالی چھوڑدی گئی ہے . یہ ان غزلوں کے ساتھ ملتا ہے جو بدخط کاتبوں کی نقل کردہ ہیں. ورق ۱۲۹ الف سے غزلیں شروع ہوتی ہیں. آغاز « یا حیدر کرار یا علی » سے ہوتا ہے . پہلی غزل خوش خط کاتب کی ہے . اس کے حاشئے پر کسی دوسرے کاتب نے « جمال میں دیکھا » زمین کی غزل نقل کی ہے . اس کے خط کی

کشش و روش دوسری ہے۔ ہر ردیف کے بعد اوراق خالی چھوڑے گئے ہیں۔ ردیف چ اور گ کی جو بے ترتیبی نسخۂ آصفیہ میں ملتی ہے وہ اس میں بھی ہوبہو موجود ہے۔ ورق ۳۲۳ الف پر جاکر سلسلۂ کلام ختم ہوتا ہے۔ آخر میں تمت تمام شد لکھا ہے اور یہ ترقیمہ دیا گیا ہے:

« تاریخ بست و پنجم ماہ رمضان المبارک ختم شد سنہ ۱۲۵۰ ہجری مطابق سنہ ۱۸۳۵ع۔ این دیوان ملک سید عون علی، ساکن سونی پت ہر کہ دعویٰ کند باطل گردد »

اس ترقیمہ سے واضح ہوتا ہے کہ یہ تحریر کسی ایسے شخص سے متعلق ہے جو خود سونی پت کا رہنے والا ہے جو نظام الدین ممنون کا آبائی وطن تھا۔ اس کے ساتھ جو سنہ درج کیا گیا ہے اس سے یہ بات حتمی طور پر طے ہوجاتی ہے کہ یہ نسخہ مصنف کے اپنے زمانہ سے تعلق رکھتا ہے اور اسے ان کی وفات (۱۲۶۰ھ) سے دس سال پہلے ان کے وطن میں تحریر کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ سے یہ نسخہ بہت اہم ہوجاتا ہے۔ اس نسخہ اور نسخۂ آصفیہ میں روایتوں کا انداز بھی ایک دوسرے سے بڑی مماثلت رکھتا ہے۔ رسم کتابت میں بھی دونوں میں زیادہ بعد نہیں۔ لیکن کاغذ اور طرز املا کے نقطۂ نظر سے نسخۂ آصفیہ اس کے مقابلہ میں کافی قدیم معلوم ہوتا ہے اگرچہ اس کی قدامت کا ثبوت نسخۂ پٹیالہ کی طرح کسی خارجی شہادت کے ذریعہ ممکن نہیں۔ اس نسخہ کے ضمن میں ایک بات اور بھی قابل ذکر ہے۔ اس کے ورق ۳۲۳ الف کے حاشئے پر جہاں دیوان کے مندرجات ختم ہوتے ہیں یہ تحریر ملتی ہے:

« بتاریخ نوزدہم شوال سید نظام عدین علی خاں سنہ ۱۲۰۶ھ میں فوت ہوئے۔ »

اس کا کاتب کم سواد ہے۔ اس کا اندازہ نظام الدین کو نظام عدین لکھنے سے بھی ہوجاتا ہے۔ لیکن زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ نظام الدین ممنون کے سنہ وفات کو ۱۲۶۰ھ کے بجائے ۱۲۰۶ھ درج کرتا ہے۔ نقطہ کی جگہ بدل دینے سے ۵۴ برس کا فرق پیدا ہوگیا، اس کا اسے اندازہ بھی نہیں ہوا۔ اعداد کو دائیں سے بائیں لکھنے اور نقطوں یا صفر کی جگہ بدل دینے کی مثالیں بعض اور کتابوں میں مل جاتی ہیں۔ اس لئے سنین کتابت کے مطالعہ میں زیادہ احتیاط برتنا ضروری ہے

ممنون کی وفات کے بارے میں یہ عبارت ظاہر ہے کہ بعد میں بڑھائی گئی۔ اس کا حاشئے میں ہونا بھی اس کا ایک ثبوت ہے۔

نسخۂ میوزیم :

مخزونہ انڈیا آفس لائبریری۔ تحریر خوش خط نستعلیق، بہت صاف اور عمدہ ہے۔ قصائد، مثنویات و قطعات وغیرہ ایک ہی کاتب کے قلم سے لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن غزلیات کا حصہ یہاں بھی دو سے زیادہ کاتبوں کا تحریر کیا ہوا ہے۔ غزلیات میں جہاں حاشئے پر تصحیح کی گئی ہے اس کی تحریر نسخۂ آصفیہ کے کاتب سے ملتی جلتی معلوم ہوتی ہے۔ (ممکن ہے یہ نسخہ ممنون کی نظر سے گذر چکا ہو اور یہ اصلاحات ممنون کی اپنی ہوں۔) تقریباً ہر ردیف کے بعد اس میں صفحات خالی چھوڑے گئے ہیں۔ اس کی رسم کتابت قدیم ہے لیکن قدیم‌تر نہیں۔ تاے ہندی ٹ اور راے ہندی ڑ کو قدیم علامت سے ظاہر نہیں کیا گیا گاف ہندی پر زیادہ‌تر دو مرکز ملتے ہیں۔ نون غنہ کا بھی بہت حد تک التزام رکھا گیا ہے۔ ہاں قدیم روش تحریر کے مطابق الفاظ زیادہ تر ملاکر لکھے گئے ہیں۔

اشعار کی روایت بھی نسخۂ آصفیہ اور نسخۂ پٹیالہ کے مقابلہ میں قدرے جدید معلوم ہوتی ہے۔ گمان غالب ہے کہ یہ نسخہ پچھلی صدی کے ربع ثانی اور ربع ثالث کے مابین تیار کیا گیا ہے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ اس کی ترتیب مصنف کے زمانۂ حیات ہی میں عمل میں آگئی ہو اگرچہ اس کے بارے میں فیصلہ‌کن طریقہ پر کچھ کہنا مشکل ہے۔

نسخۂ ولیم :

یہ ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ، کی لائبریری سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے پہلے صفحہ پر ایشیاٹک سوسائٹی تحریر ہے۔ اس کے بعد دوسرے صفحہ پر دیوان ممنون بخط انگریزی لکھا ہے۔ اس صفحہ پر فورٹ ولیم کالج کی مہر بھی ہے۔

اس کا خط شروع سے آخر تک ایک ہی ہے۔ کتابت معمولی نستعلیق ہے۔ عکس سے اس کا اندازہ مشکل ہے کہ روشنائی کس قسم کی ہے اور کاغذ پر اس کے اثرات کیا ہیں، خود کاغذ کتنا قدیم ہے۔ اس کے آخر میں تمام شد لکھا ہے اور یہ ترقیمہ درج ہے :

« تمام شد دیوان ممنون در سنہ ۱۸۱۳ع مطابق سنہ ۱۲۲۸ھ. غریق رحمت حق آن کس باد کہ کاتب را (بہ دعا) یاد کند. »

اس سے آگے دائیں طرف فورٹ ولیم کالج کی مہر ہے : کتاب کالج فورٹ ولیم بنگال. یہ ایک انتخاب یا مختصر دیوان ہے تاہم اس کی بیشتر روایتیں بہت قدیم معلوم ہوتی ہیں اس لئے کہ ان شعری روایتوں میں اور ممنون کے معاصر تذکروں میں انداز روایت تقریباً یکساں ہے جس کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ ممنون کی یہ روایت کافی قدیم ہے. اس پر جو تعلیقہ ہے وہ بھی اس کی قدامت کی گواہی دیتا ہے. لیکن یہ دیکھ کر قدرے تعجب ہوتا ہے کہ اس کا طرز املا قدیم کے مقابلہ میں جدید سے زیادہ قریب ہے اور زبان بھی کچھ نئےپن کا سا انداز لئے ہوئے ہے ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ یہ نسخہ فورٹ ولیم کالج کے کسی ایسے آدمی نے تیار کیا ہو جو قدیم طرز املا کے مقابلہ میں جدید طرز املا کی طرف مائل ہو. ایک خفیف‌سا امکان یہ بھی ہے کہ ترقیمہ موجودہ روایت سے قبل کی کسی روایت سے تعلق رکھتا ہو لیکن فورٹ ولیم کالج کی مہر اس خیال کی تائید نہیں کرتی. بصورت موجودہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ غالباً نسخۂ آصفیہ کے بعد کلام ممنون کی سب سے قدیم روایت ہے. نسخۂ آصفیہ کا املا اس سے قدیم‌تر روش کی نشاندہی کرتا ہے مگر وہ کسی ترقیمہ سے محروم ہے.

تاریخ کتابت متن کے اعتبار سے یہ چاروں نسخے اس ترتیب سے آسکتے ہیں:

۱ نسخۂ آصفیہ، ۲ نسخۂ ولیم، ۳ نسخۂ پٹیالہ، ۴ نسخۂ میوزیم[۱]

ترتیب متن کے سلسلہ میں مختلف قلمی نسخے اگر دستیاب ہوں تو ان پر اس طرح کی تنقیدی گفتگو ضروری ہے. اس گفتگو کے حدود کا تعین موجودہ نسخوں کی نوعیت کے پیش نظر کیا جاسکتا ہے.

---

۱ ممنون کے قلمی نسخوں پر بحث کے سلسلہ میں راقم الحروف نے ڈاکٹر افسری افتخار کے مقالہ دیوان ممنون (تنقیدی ایڈیشن) سے استفادہ کیا ہے.

٭ خواجہ احمد فاروقی

انشاے اردو

خلاصۃ المکاتیب میں لکھا ہے:

«و آن چنان جہد کند کہ مضامین را از تکلف اغراق بری دارد...
و عبارت سلیس قریب الفہم بایضاح تمام نحویکہ نزدیک خاص و عام
مستحسن افتد بہ تحریر در آید.»

لیکن عجیب اتفاق ہے کہ باستثناے چند، بیشتر متأخرین فارسی انشا پردازوں نے مغلق اور رنگین عبارت لکھنا باعث افتخار سمجھا جس میں اشعار کی فراوانی، تشبیہ و استعارہ کی بھرمار اور رنگین و خوبصورت الفاظ کی کثرت ہوتی تھی. اٹھارہویں صدی کے آخر میں فارسی دانان ہند کی وہ گرم بازاری نہیں رہی جو مغلوں کے عہد زریں میں تھی. اس انحطاط اور جمود کے زمانے میں جب ایران سے نئے لوگوں کی آمـــد و رفت کم سے کم تر ہوگئی دقت نگاری اور لغت بازی نے وہ مقبولیت حاصل کی کہ نعمت خاں عالی، عبدالقادر بیدل، ارادت خاں وغیرہ معمولی بات بھی بغیر پیچ دئے نہیں کہتے. لفظ و معنی کے شکنجہ میں «فشار آغوش حسیں» کی یہ کیفیت بعض اوقات لطف دیتی ہے لیکن اس سے نقصان یہ ہوا کہ فارسی نثر سرتاپا تصنع اور معمہ بن گئی. رقعات بیدل کا پڑھنا دماغی جمناسٹک سے کم نہیں ہے. حزیں لکھتا ہے:

«نظم ناصر علی و نثر بیدل بہ فہم نمی آید. اگر مراجعت ایران
دست دہد برای ریش‌خند بزم احباب رہ‌آوردی بہتر ازیں نیست.»

اس زمانے میں فرامین و عرضداشت کی عبارتیں دقت و اغلاق، دانش آرائی اور مقفیٰ نگاری کا نمونہ ہوتی تھیں. تمام اوصاف اسم تفضیل کے صیغے میں لکھے جاتے تھے. القاب و آداب مقرر تھے. پیروی و تقلید ادبی شعار تھا. ابوالفضل کی انشا شمع راہ بنی ہوئی تھی. صنائع لفظی و معنوی پر زور دیا جاتا تھا. مرجز،

٭ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، ام اے؛ پی‌اچ ڈی: پروفیسر و صدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی؛ مصنف میر تقی میر، کلاسیکی ادب وغیرہ

مقفیٰ اور مسجع نثر عام طور پر پسند کی جاتی تھی اور فارسی نویس بالعموم اسی قسم کی پرتکلف نثر لکھنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔

یہ رنگینیاں اور نقش طرازیاں بقول محمد حسین آزاد ایسی تھیں جیسے :

«ایک تیز قلم مصور نے نظر کے زور سے اور ہاتھ کی مشق سے ایک گلاب کی پتی پر فورٹ ولیم کی تصویر کھینچی اور اس میں کوئی جزو اس کی عمارت کا باقی نہ چھوڑا یا کسی دستکار نے چنے کی دال کا جہاز تراشا اس طرح کہ چھوٹے سے چھوٹا پرزہ بھی اصل جہاز کا دیکھو تو موجود پاؤ۔ بے شک دونوں نے بڑا کمال کیا مگر اس قلعہ کے ایوان میں کون سا بادشاہ ملک رانی کرے اور اس جہاز میں کون سا لشکر سمندر پار اترے۔»

ناممکن تھا کہ اردو نثر اپنے ماحول کے اثرات قبول نہ کرتی اور اس کے اسالیب فارسی کے رنگ میں نہ رنگ جائے میر عطا حسین تحسین ، مرزا رجب علی بیگ سرور ، مولوی غلام امام شہید اور واجد علی شاہ کی عبارت آرائی کو اس عہد کے رجحانات سے الگ کرکے دیکھنا غلط ہوگا۔ انشائے بہار بے خزاں (۱۸۶۶ع) میں لکھا ہے :

«خط کتابت کا دستور اردو میں اب تک جاری نہیں ہوا۔ پھر اگر کوئی زبان اردو میں اسی کا رواج دینا چاہے تو جس طرح نظم و نثر فارسی کے طور پر جاری ہوئی ، اسی طرح خط کتابت کا بھی فارسی کے طور پر جاری ہونا ضروری ہوگا اور فارسی میں جو خط لکھنے کے قاعدے مقرر ہیں ، ناچار اردو میں بھی اس کا تابع ہونا پڑے گا۔»

چنانچہ اردو مکاتبت فارسی کے سانچے میں ڈھل گئی اور اس کے نقوش زمانہ کے سماجی اور تہذیبی تقاضوں کی بدولت صورت پذیر ہونے لگے۔ جن لوگوں نے اردو مکتوبات پر اپنا نام ثبت کرکے اس کا ایک معیار قائم کیا وہ فارسی انشا ہی کے دلدادہ نہیں تھے بلکہ ان کی ذہنیت ، رجحانات اور خیالات سب فارسی ہی نے تعمیر کئے تھے۔ اس لئے اس ابتدائی دور میں اردو کا مکتوباتی ادب فارسی کے قدم بہ قدم چلنے لگا۔

شاہ عالم اور کلایو کے درمیان جو دیوانیء بنگالہ کی تفویض کی شرائط طے ہوئی تھیں ، ان میں ایک اہم شرط یہ تھی کہ فارسی قائم رہے گی۔ لیکن ۱۸۳۲ء میں اردو سرکاری زبان تسلیم کرلی گئی اور ۱۸۴۴ء تک فارسی عدالتی زبان کی حیثیت سے استعمال ہوتی رہی لیکن اس کے بعد منسوخ کردی گئی۔ سرجان شور (۱۷۹۳-۱۷۹۸ء) نے لکھا ہے کہ فارسی کا اثر روز بروز کم ہو رہا ہے اور فریقین کو مقدمہ کی کارروائی سمجھنے میں دقت ہوتی ہے اس لئے یہ لسانی تبدیلی ضروری قرار دی گئی۔

انشائے اردو اس عبوری دور کی یادگار ہے جب فارسی زوال پذیر تھی اور نئے حالات کی وجہ سے اردو کا چلن بڑھ رہا تھا لیکن ابھی اس کی نثر فارسی کے اثر سے آزاد نہیں ہوئی تھی۔ مؤلف نے سبب تالیف میں لکھا ہے:

> «صاحبان عالیشان انگریز کہ فہم و فراست اور عمل و صناعت میں گوے سبقت لے گئے ہیں حکمائے فحول سے ... فرط شفقت اور عنایت لطف سے ... حسب وجوہ اشتہار مؤرخہ ۱۸۳۵ء کے کہ واسطے تحریص زبان اردو ... کے مشتہر ہوا ہے دفاتر سرکار کمپنی انگریز بہادر میں ، زبان اردو کو جاری کیا۔ مؤلف نے جو حال تحاریر دفتر کا دیکھا اور سنا اس سے حصولِ مطلب صاحبانِ عالیشان کا نہ پایا۔ حق یہ ہے کہ فصاحت اس تحریر سے سینہ چاک ہے اور بلاغت غمناک۔»

لیکن طرفہ لطیفہ ہے کہ باوجود صحت زبان پر زور دینے کے مؤلف کی تحریر سے بھی فصاحت سینہ چاک ہے اور بلاغت غم ناک! مؤلف نے انگریزوں کے متعلق اس یقین کا اظہار کیا ہے:

> «مطلوب صاحبان عالیشان کا اردوے فصیح اور روشن ہے۔ (چنانچہ) میر شیر علی افسوس کو لکھنؤ سے کلکتہ میں بلایا کہ انہوں نے ترجمہ (گلستاں کا) زبان مروج لکھنؤ میں کیا اور اگر ترجمہ اردوے خوب میں منظور نہ ہوتا ، ایک بنگالی اس امر کے واسطے کافی تھا۔»

یہ اشارہ تارنی چرن متر کی طرف ہے جن کی تنخواہ سو روپئے ماہوار مقرر ہوئی لیکن میر امن صاحبِ باغ و بہار صرف «چالیس کے لایق» ٹھہرے اور ان کا درجہ ماتحت منشیوں میں چوتھا قرار پایا۔[1]

---

۱ گنج خوبی مطبوعہ شعبۂ اردو ، دہلی یونیورسٹی ، دہلی ، بمبئی ، ۱۹۶۶ء ، مقدمہ از خواجہ احمد فاروقی ، ص ۱۰

انشائے اردو کے مؤلف کا ارادہ تھا کہ اپنی تالیف کو گورنر جنرل کی خدمت میں پیش کرے تاکہ اس کے بدلے میں اسے کوئی عہدۂ جلیلہ اور جائزۂ گراں مایہ میسر آسکے۔ لیکن بعد میں «شاہان بہ شاہان دہند» کی روایت پر عمل کرتے ہوئے اسے محمد علی شاہ بادشاہ غازی کی خدمت میں پیش کیا۔

انشائے اردو کا یہ مخطوطہ پروفیسر مسعود حسن رضوی کے کتب خانہ سے حاصل ہوا ہے۔ یہ ناقص الاول ہے جس کی وجہ سے مصنف کا نام نہیں معلوم ہوسکا لیکن اس کی صراحت کے مطابق یہ ۱۲۵۵ھ مطابق ۴۰-۱۸۳۹ع کی تصنیف ہے جو اودھ کے محمد علی شاہ (۱۸۳۷ع تا ۱۸۴۳ع) کے زمانے میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

انشائے اردو اگرچہ فورٹ ولیم کالج کی سادہ و صاف تصانیف کے کم و بیش چالیس سال بعد عالم وجود میں آئی ہے لیکن اس کی زبان رنگین اور پرتکلف ہے۔ مثلاً، مؤلف نے مختلف فصلوں کے خاتمہ پر جو اگلی فصل کی تمہید اٹھائی ہے اس کا انداز یہ ہے:

> «اور جو گوہرِ مقال جوہریانِ بازارِ سمع کو رشتۂ بلاغت میں بھاتا ہے اور غنچۂ دل سیر کرنے والوں باغِ عبارت کا نسیمِ فصاحت سے شگفتگی پاتا ہے، مناسب ہوا کہ فلک مقدمے کا ساتھ آفتابِ وصفِ بلاغت کے مزین ہو اور شبستانِ ضمیر طالبوں کے، ساتھ روشنیِ شمعِ بیانِ فصاحت کے روشن۔»

نثر کا یہ اسلوب غلام امام شہید تک اسی طرح قائم رہا اور باوجود فورٹ ولیم کالج کی کتابیں شائع ہونے کے ان کا اثر دور تک نہیں پہنچا۔ اس درمیان میں مشیرالدولہ، محقق الملک مفتی محمد نوراللہ خاں بہادر مناظر جنگ (متوفی ۱۸۵۱ع) نے ایک کتاب ہدایت المعلمین کے نام سے «در تعلیم و تعلم ابجد خوانی بر نوشت و خواند خط و کتابت بزبان اردو» جون ۱۸۴۸ع میں مطبع قادری، میرٹھ سے شائع کی۔ اس کے مطالعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مصنفین بیرونِ کالج پر فارسی کا غبار رنگین چھایا ہوا تھا۔ معلم کو ہدایت فرماتے ہیں:

> «(معلم) مبتدی کو دستورالصبیان اور رقعات نظامیہ اور رقعات عالمگیری اور ہفت ضابطۂ علی نقی خاں اور بہاراقبال مولوی امانت کی خوب سمجھاکر پڑھاوے اور متوسط کو بہار دانش اور عیار دانش اور انشائے

ابوالفضل اور منتہی کو مناظر الانشا اور انشاے طاہر وحید اور وقائع نعمت خاں عالی اور طغرا اور ظہوری کافی ہیں۔»

انشاے اردو کے مؤلف نے «ماہیت زبان اردو» پر بھی روشنی ڈالی ہے اور لکھا ہے کہ یہ مرکب زبان ہے جس میں «لغات عربی، فارسی، ترکی، پوربی، پنجابی، دکھنی، بوندیل کھنڈی، مارواڑی اور برجی» شامل ہیں۔ مؤلف نے اردو کی ترقی کے سلسلہ میں شاہ جہاں، محمد شاہ، شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور لکھنؤ کی زبان کو سند مانا ہے:

> «تمام ہند کے لوگوں کی زبان کو زبان اردو کہنا روا نہیں۔۔۔ فی زماننا زبان لکھنؤ سند اور حجت ہے اور بولنے میں ایک خدمتگار اور شاعر نامدار لکھنؤ کا برابر ہے۔»

مؤلف نے انشاے اردو ناسخ کے انتقال کے ایک برس بعد مرتب کی ہے۔ اس نے صحت زبان پر بہت زور دیا ہے (اگرچہ خود اس کی تالیف اغلاط سے خالی نہیں۔) اور شکایت کی ہے:

> «ساکنانِ بنگالہ بلکہ صوبۂ بہار تک مطلقاً تمیز مؤنث اور مذکر میں نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ مؤنث حقیقی کو بھی عکس استعمال کرتے ہیں۔ کہتے ہیں ہاتھی آتی تھی اور ہتھنی آیا تھا۔ مؤلف نے صحیح لکھا ہے کہ «حق یہ ہے کہ ہر زماں میں محاورہ بعد ایک مدت کے بدل جاتا ہے۔»

انشاے اردو میں وہ انگریزی الفاظ بھی ملتے ہیں جو اس وقت زبانوں پر چڑھ گئے تھے۔ مثلاً، اپیل، اپیلانٹ، جج، کلکٹر، ڈگری، کورٹ، مجسٹریٹ۔

انشاے اردو کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو نثر فورٹ ولیم کالج ہی کی احسان مند نہیں اس کالج کے باہر بھی، خاص طور پر وہابی تحریک کی بدولت گیسوے اردو کی مشاطگی ہو رہی تھی لیکن سادگی و سلاست جسے فورٹ ولیم کالج کی دین سمجھا جاتا ہے وہ دراصل بہت سے سماجی اور تہذیبی تقاضوں کا نتیجہ ہے۔ اس لئے یہ رجحانات کالج سے باہر عام نہ ہوسکے اور اس آسان زبان میں لکھنا «شکوہ سخن وری کے منافی» خیال کیا جاتا رہا۔ فورٹ ولیم کالج «صاحبانِ نو آموز» کے لئے قائم کیا گیا تھا اس لئے اس کی حیثیت ایک «جزیرہ» سے

زیادہ نہیں۔ اس کے باہر جو نثر لکھی گئی وہ فارسی کی تقلید اور اثر سے خالی نہیں ہے۔ میر امن پر رجب علی بیگ سرور کا اعتراض صرف ایک فرد کا اعتراض نہیں، پورے ایک روایتی معاشرے کا اعتراض ہے۔ اس نگاہ سے دیکھا جائے تو انشائے اردو کو بیرون کالج کے عبوری ادب میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جس کا ایک رخ ماضی کی طرف ہے اور دوسرا مستقبل کی طرف۔

* * *

٭ عبدالحلیم ساحل

نقد و تبصرہ

نقد ابو الکلام

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت ان کی حیات میں بھی اور ان کی رحلت کے بعد بھی مختلف قسم کی تنقیدوں اور تعریضوں کا ہدف بنی رہی۔ یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں۔ ہر بڑے انسان کے ساتھ یہی پیش آتا رہا ہے۔ البتہ اس ضمن میں ایک قابل لحاظ پہلو یہ ہے کہ جو لوگ مولانا کی پروقار شخصیت سے ان کی زندگی میں بہت زیادہ متأثر نظر آتے تھے، ان میں سے بہت سے ان کی وفات کے بعد کسی قدر بدل گئے۔ یہ انقلاب طبیعت عمائد کی صف اول سے لےکر عام گروہوں تک میں دیکھا گیا۔ لیکن اس ردوقدح کے دور میں جسے ابوالکلام کی شخصیت کے لئے عمل جراحی کا دور کہنا چاہئے، ان کی شخصیت کے خط و خال پہلے سے کہیں زیادہ نکھر آئے۔ زیر تبصرہ کتاب «نقد ابوالکلام» بھی ان تنقیدی کارناموں میں سے ہے جو مولانا کی وفات کے بعد وجود میں آئے۔ اس کے مصنف ڈاکٹر رضی الدین احمد (صدر شعبۂ عربی و فارسی و اردو، سری ونکیٹسورا یونیورسٹی تروپتی آندھرا) ہیں۔ انھوں نے اس کتاب میں بڑی شرح و بسط کے ساتھ مولانا ابوالکلام کی حیات کے مختلف پہلوؤں پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ نقد ابوالکلام کی وجہ تسمیہ غالباً «نقد غالب» کا تتبع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی شوخیٔ تحریر «نقش فریادی» کا درجہ رکھتی ہے۔

فاضل مصنف نے ابوالکلام کی شخصیت کے سلسلے میں سب سے پہلے تمہیدی انداز میں مطلقاً «جذبۂ انانیت» سے بحث کی ہے۔ انھوں نے اس کا آغاز میر تقی میر کی انانیت سے کیا ہے۔ میر کے بعد غالب کی انانیت اور سرسید کی انانیت کا ذکر کرتے ہوئے ابوالکلام کی انانیت سے ان کا تقابل کیا ہے۔ انانیت کا یہ سلسلہ

٭ جناب مولوی عبدالحلیم صاحب ساحل سلطان‌پوری، استاذ عربی و اردو، انجمن اسلام ہائی اسکول، بمبئی۔

اس قدر دراز ہے کہ کتاب کے تقریباً ۸۰۰ صفحات اس بحث کی نذر ہوگئے ہیں۔

اگرچہ « جذبۂ انانیت » نفسیات کا ایک دقیق اور پرپیچ مسئلہ ہے، لیکن اس لفظ کا استعمال کیا بلحاظ عام بول چال اور کیا بلحاظ علمی و ادبی زبان، کسی لائق قدر و منزلت شخصیت کے فضائل و محاسن کے تذکرے میں تحسین کا پہلو نہیں رکھتا۔ اس خیال کی تائید فرہنگ آصفیہ سے بھی ہوتی ہے۔ ہم سید سلیمان ندوی کی انانیت، یا مولانا شبلی کی انانیت یا سرسید احمد خاں کی انانیت یا پنڈت جواہر لال نہرو کی انانیت کے فقروں سے اپنی تحریروں اور تقریروں میں اس لئے گریز کرتے ہیں کہ ان فقروں سے غرور و استکبار کی بو آتی ہے۔ ان بزرگوں کی « انا » کے اظہار کے لئے ہم عزیمت، عزت نفس، خودی، خودداری یا انفرادیت کے الفاظ استعمال کرتے آئے ہیں، یا اگر بہت زیادہ ‹ نفسیاتی › بن کر کلام کیا جائے تو ان الفاظ کی بجائے خود ارادیت کا لفظ زیادہ موزوں قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن مصنف نے اس کتاب میں ہر قابل قدر ادیب، شاعر، مصلح اور سیاس کے لئے بڑی آزادی کے ساتھ انانیت کا لفظ استعمال کیا ہے جو مذاق سلیم پر گراں گذرتا ہے۔

ابوالکلام کو ابوالکلام بنانے والی پارس صفت چیز کو انانیت کہنے کی بجائے نور سعادت یا نور ہدایت کہا جاسکتا ہے۔ یہ وہی جوہر ہے جو قدرت کا فیاض ہاتھ خاص خاص لوگوں کی طبائع میں ودیعت کرتا ہے اور جسے اس سے بہرہ مند اشخاص اپنی زندگی کے مختلف موڑوں پر بڑی جرأت اور نہایت رعنائیء خیال کے ساتھ نمایاں کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ مولانا کی زندگی میں بھی وہ جوہر بالکل اسی کیفیت کے ساتھ رونما ہوا اس لئے اس کی تعبیر بجائے انانیت کے خود مولانا کے الفاظ میں « نور سعادت » سے ہونی چاہئے۔

ابوالکلام نے اپنے خاندان کی قدیم روایتوں کے خلاف اپنے لئے ایک نئی راہ عمل نکالی۔ درحقیقت یہ اسی نور سعادت کی کارفرمائی تھی جو انہیں پرانی کوچہ گردی سے علیحدہ کرکے ایک جدید اور روشن شاہراہ پر لے آیا تھا۔ یہ نور سعادت اگرچہ پرانی رسم و راہ طریقت سے بغاوت کی شکل میں نمودار ہوا لیکن اسے « انانیت » کہہ کر رسوا نہیں کیا جاسکتا۔ یہ منزل تو حق و صداقت کے ہر راہرو کے لئے ناگزیر ہوا کرتی ہے۔ وَوَجَدَکَ ضَالاًّ فَهَدٰی (اور خدا نے تجھے

سرگرداں پایا تو راہ راست عطا کردی۔)

ابتدائے عمر ہی سے مولانا اپنے والد مولوی خیر الدین کی روش «پیرمریدی» سے بیزار تھے۔ یہ طبعی بیزاری درحقیقت اسی نور سعادت کی دین تھی جس کے باعث ان کی راہیں زندگی کے ہر دور میں عام روش سے مختلف رہیں۔ یہ ان کی انانیت کا کرشمہ نہیں بلکہ اسی مخفی قوت کا فیضان تھا جسے قدرت کا سب سے بڑا عطیہ کہنا چاہئے اور جو ابوالکلام کی جملہ علمی و ادبی، نیز سیاسی ترقیوں کا سنگ بنیاد ہے۔ وہ کسی مدرسہ یا خانقاہ کی تعلیم و تربیت کے احسان مند نہ ہوئے یا نہ ہوسکے تو یہ ان کی انانیت کا ردعمل نہ تھا بلکہ اسی نور سعادت کی جلوہ گری تھی۔ اسی طرح وہ میدان سیاست میں اترے تو انہوں نے اپنے وقت کے کسی سیاسی پلیٹ فارم کی دریوزہ گری نہ کی بلکہ سیاسی پلیٹ فارموں نے انہیں خود ہی اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی۔ کانگریس کے عظیم پلیٹ فارم سے انہوں نے قیادت و سیادت کے جو جوہر دکھائے ان میں ان کی انانیت کا خمار نہیں بلکہ ان کے عزم بالجزم کا سحر آفریں خمیر تھا۔ یہ کیسے مان لیا جائے کہ ابوالکلام «انانیین» کے گروہ سے تعلق رکھنے والے ہیں جبکہ انانیت اپنے انجام کے لحاظ سے ہمیشہ مذموم اور سعادت اپنے حسن خاتمہ کے تعلق سے ہمیشہ محمود ہوا کرتی ہے۔ ابوالکلام کے کمالات کا انحصار ان کے جذبۂ انانیت پر رکھنا ابوالکلام کے ساتھ ناانصافی کے مترادف ہے۔ مصنف کی یہی تعبیر اور بیان کی خامی پوری کتاب کو محیط ہے

نقد ابوالکلام میں مصنف نے الفاظ و تراکیب کے انتخاب میں احتیاط پسندی اور علمی لب و لہجہ کو بالائے طاق رکھدیا ہے اور ساری کتاب ڈھاک کے تین پتوں: انانیت، رومانیت اور خدادوست کی اصطلاحوں کے سایہ میں نشو و نما پاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک قاری کے لئے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ آیا فاضل مصنف کے نزدیک مولانا ابوالکلام کی شخصیت لائق ستایش ہے یا قابل نفرین۔ مصنف کا طرز تعبیر یا دوسرے الفاظ میں اس کا تنقیدی نقطۂ نظر انتخاب الفاظ کی فنی غلطیوں کا شکار ہوگیا ہے اور ان غلطیوں کی تاریکی میں مولانا کی روشن شخصیت معدوم نہیں تو موہوم ضرور ہوگئی ہے۔ ہمارے اس دعوے کی تصدیق

مصنف کی عبارتوں سے چند اقتباسات کی صورت میں کی جاسکتی ہے ۔ ایک جگہ وہ تحریر کرتے ہیں :

« ابو الکلام نے اپنی نثر نویسی (نثر نگاری) کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اس احساس برتری یا جذبۂ خود نمائی کو اس طرح نمایاں طور پر پیش کیا ہے کہ ادبی خود نمائی بےنقاب ہوگئی ہے ۔ »

(نقد ابوالکلام ، ص ۸۴۲)

گویا ابوالکلام کی تمام‌تر ادبی سرگرمیاں اور اس سلسلے کی ان کی گراں قدر خدمات مصنف کے نزدیک « ادبی خود نمائی » سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں ۔ اسی سلسلے کی ایک اور گل‌افشانی ملاحظہ ہو :

« طبیعت کی طغیانی اور تسکین ان کی انانیت کا پردہ بھی ہے اور ان کی انانیت کی پروردہ بھی ۔ »

(نقد ابوالکلام ، ص ۸۲۴)

جب سارا دارومدار انانیت ہی پر ہے تو اس کے لئے پردہ کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے ۔ پردہ دار ببانگ دہل اپنی بےپردگی اور عریانی کا اعلان خود ہی کررہا ہے ۔ ایک جگہ مولانا ابوالکلام کی « انتہاپسندی » کے تحت ارشاد ہوتا ہے :

« اسی فکر و خیال سے فن و فلسفے کے مسائل میں بھی ابوالکلام نے ایسی انتہا پسندی کے نشانات چھوڑے ہیں کہ بعض حقائق صرف وہمی یا خیال (خیالی؟) ثابت ہوئے ہیں ۔ »

(نقد ابوالکلام ، ص ۱۰۳۲)

اس عبارت کی عمومیت الفاظ کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا ۔ فن و فلسفہ کے مسائل؟ بعض حقائق ؟ یہ سب دریافت طلب امور زیر بحث لائے جائیں تو سراغ لگے کہ ابوالکلام کی انتہا پسندی نے کن کن مسائل میں کیا کیا نشانات (نقوش؟) چھوڑے ہیں ۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں مصنف نے ابوالکلام کی ایک شگفتہ تحریر کا اقتباس پیش کیا ہے اور اس سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ابوالکلام کے نزدیک زمانہ صرف دو شکلوں میں ہے ، ماضی اور مستقبل اور بس ۔ حال ان کے یہاں ناپید ہے ۔ حالانکہ مولانا نے اپنے مخصوص اور شگفتہ بیان کے ذریعہ یہ حقیقت واشگاف کرنے کی کوشش کی ہے کہ حال کا وجود تو ہے لیکن اس کی گرفت مشکل ہے ۔ وہ ماضی کی طرح متعین اور مستقبل کی طرح مبہم نہیں ہوا کرتا ۔ رہی یہ بات کہ

فارسی شعرا نے حال سے لطف اندوزی اور اس کی پذیرائی کے سلسلے میں یہ کہا ہے اور وہ کہا ہے تو اس سے مولانا کو کب اختلاف ہے ۔

مصنف نے بزعم خود مولانا کی انتہا پسندی کے بعض (مہیب) مناظر پیش کئے ہیں ۔ مثلاً :

« یہ ہے انانیت کی وہ خونریزی اور خوں خواری جسے ابو الکلام کی انتہا پسندی نے شعلوں کے منظر کی طرح گرمی اور گھٹن سے بھر دیا ہے ۔ یہاں انتہا پسندی نے حسن کی روشنی کی جگہ (میں) کے دھنوؤں کی وہی کیفیت پیدا کردی ہے کہ جس کے خیال سے بھی وحشت اور وہم کا ہیبتناک منظر سامنے آتا ہے ۔ »

(نقد ابوالکلام ، ص ۱۰۳۵)

اسی انتہاپسندی کی شکایت کرتے ہوئے ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے :

« اور جہاں یہ انتہاپسندی خالص ہوگئی وہاں غارت‌گر دانش و شعر و ادب بن گئی ۔ »

(نقد ابوالکلام ، ص ۱۰۳۶)

بسوخت عقل ز حیرت کہ این چہ بوالعجبیست !

مصنف نے اس سلسلے میں (الہلال) اور (تذکرہ) کی وہ عبارتیں بھی پیش کی ہیں جو مولانا کے قلم سے ان کی انشا پردازی کے دور اول میں منظر عام پر آئی تھیں اور وہ بجا طور پر اپنے عصری تقاضوں کے مطابق تھیں ۔ لیکن مصنف نے ان عبارتوں کو بھی انتہا پسندی کا مظہر گردانا ہے ۔

فاضل مصنف نے ابوالکلام پر تنقید کرتے ہوئے سب سے سنگین الزام ان پر یہ لگایا ہے کہ وہ جدید اردو ادب اور نئی شاعری کے اہم اور عظیم رجحانات سے یکسر بےخبر رہے اور انھوں نے « اپنے زمانہ کے ائمۂ ادب میں سے کسی کو بھی قابل اعتناء خیال نہیں کیا ۔ » ان کا یہ الزام مبالغہ آمیزی اور صحیح حالات سے بے خبری پر منحصر ہے ۔ تیقن کے ساتھ یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ مولانا اپنے عصر کے ادبی رجحانات سے یکسر بےخبر رہے اور انھوں نے اس کے نتیجہ کے طور پر قابل قدر ادیبوں اور شاعروں کو لائق اعتناء نہ سمجھا ۔ حقیقت یہ ہے کہ مصنف نے مولانا کے جس عہد بےخبری کا ذکر کیا ہے وہ ان کی سیاسی

سرگرمیوں کا نقطۂ عروج تھا۔ مولانا اس زمانے میں اپنے سیاسی کاموں میں اس قدر منہمک تھے کہ انھیں شعرو ادب کی مجلسیں سجانے کا دماغ یا اس کی فرصت کب تھی؟ اس دور میں حق تو یہ ہے کہ مولانا کی ادبی خاموشی یا ان کی کوتاہ قلمی قابل داد ہے کہ انھوں نے وقت کے تقاضوں کو خوب سمجھ بوجھ کر اپنی ساری قوت توجہ صرف محاذ جنگ آزادی پر لگادی۔ گھر میں آگ لگی ہو، کروڑوں جانبازان وطن غلامی کی قید و بند توڑنے پر آمادہ ہوں ، ایسے میں کیا کسی صاحب عقل و شعور کو یہ سوجھے گی کہ وہ محفل شعر و ادب کی پذیرائی کرے اور خصوصاً ان حالات میں جبکہ شعر وادب کی مجلسوں کے سجانے کا کام ملک کا ایک طبقۂ خاص انجام بھی دے رہا ہو! حیرت ہوتی ہے کہ فاضل نقاد نے وقت کے سیاسی حالات کی نزاکت کو کیونکر نظرانداز کردیا اور اس حقیقت سے کیونکر صرف نظر کرلی کہ ابوالکلام صرف ادیب و انشا پرداز ہی نہیں بلکہ اپنے عہد کے مبصر سیاست داں بھی تھے۔

مصنف کی سخت نکتہ چینی اور برہمی کا پارہ اس وقت اور بلند ہو جاتا ہے جب ان کے بقول غزل کے ائمۂ اربع (حسرت ، شاد ، یگانہ اور فراق) کو چھوڑ کر ابو الکلام اصغرگونڈوی کو مستثنیات زمانہ میں شمار کرتے ہیں۔ اصحاب ذوق خود ہی فیصلہ کرسکتے ہیں کہ مصنف کی راے کہاں تک صحیح ہو سکتی ہے اور اصغر گونڈوی کے رنگ میں نادر اور پاکیزہ صوفیانہ شاعری کا جواب ان مذکورہ شعراء میں سے کس کے یہاں ملتا ہے۔

اب تک جن فروگذاشتوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کا تعلق براہ راست مولانا کی شخصیت سے تھا۔ ان پر مستزاد مصنف کی بعض وہ سہل انگاریاں ہیں جن پر توجہ دلانی ضروری ہے۔ مثلاً ، کتابت و طباعت کی غلطیوں کی تصحیح کی طرف توجہ بہت کم کی گئی ہے، ورنہ فہرست اغلاط اس قدر طویل نہ ہونے پاتی۔ اس طویل فہرست اغلاط کے باوجود بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ اس سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ آیات و احادیث اور عربی امثال زیادہ مجروح ہوئے ہیں۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں:

(۱) ولیس علی اللہ بِمُستنکرٍ کی بجاے لکھا ہے ولیس للہ بِمُنتکرٍ (ص ۲)

(۲) رضینا قسمة الجبار فینا کی بجاے لکھا ہے فی نا (ص ۲۱)

(۳) فی اللیل رھبان کی بجائے لکھا ہے فی الیل وھبان (ص ۳۳۳)
(۴) اولٰـئِـکَ عَلیٰ ھُدًی کی بجائے لکھا ہے اولئک علی ھُـدَۃً (ص ۴۷۵)
(۵) طوفان و تلاطم کی بجائے لکھا ہے طلاطم (۸۴۸)

تہدیہ کی عبارت بڑی حد تک محل نظر ہے . تہدیہ کے روایتی تکلفات سے قطع نظر اس میں ڈاکٹر سید عابد حسین اور خواجہ غلام السیدین کو مولانا کا مشفق و مشیر قرار دیا گیا ہے حالانکہ مولانا کی ذات گرامی بلحاظ علم و عمر خود ان دونوں حضرات کے لئے مشفق و مشیر کا درجہ رکھتی تھی.

نقد ابوالکلام کی ایک اساسی خامی یہ ہے کہ اس میں تہدیہ سے لے کر کتاب کے آخری پیراگراف تک اکثر عبارتیں ایسی ہیں جنھیں پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ شاید مصنف انگریزی میں سوچتے ہیں اور پھر اپنے خیالات کو اردو کا جامہ پہناتے ہیں ورنہ کتاب میں انگریزی طرز انشاء کی پیروی کے نمونے اس قدر عام نہ ہوتے .

اس کتاب کے سلسلے میں قابل تعریف پہلو یہ ہے کہ مصنف نے ابوالکلام پر بڑی حد تک خام و پختہ تنقیدی مواد کو یکجا کردیا ہے . مواد کی اس کثرت کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ابوالکلام کا کوئی نقاد اس کتاب سے صرف نظر نہیں کرسکتا

کتاب رجسٹرار، سری ونکٹیسور یونیورسٹی، تروپتی، آندھرا ، سے مل سکتی ہے . قیمت درج نہیں .

*

تبصرے

مغربی ادب کے معمار از ا. محمد ابراہیم ، ملنے کا پتا : ا. محمد ابراہیم ، استاد شعبۂ اردو ، گورنمنٹ آرٹس کالج ، بنگلور ، ۱۹۷۲ع ، صفحات ۲۷۲ ، قیمت بارہ روپے .

زیر تبصرہ کتاب میں یورپ اور امریکا کے تقریباً سو مشہور ادیبوں ، شاعروں ناول نگاروں ، ڈراما نویسوں وغیرہ کے مختصر حالات دئے گئے ہیں . اتنے وسیع موضوع پر پونے تین سو صفحات کی کتاب میں ، ظاہر ہے کہ اشاروں سے زیادہ اور کیا ہوسکتا ہے . غالباً محدود صفحات ہی کے پیش نظر شعرا ، ادبا وغیرہ کی تخلیقات کی مثالیں بھی نہیں دی گئی ہیں . مصنف کا انداز تحریر صاف اور سلیس ہے . کہیں کہیں زبان کی غلطیاں رہ گئی ہیں . مثلاً ، «وہ . . . اس کے مکان . . میں انتقال کرگیا . » «اس کے » کی جگہ «اپنے » چاہئے . « کمیونیزم بھی مطمئن نہ کرسکا.» کمیونیزم مؤنث ہے . کتاب کالج کی ابتدائی جماعتوں کے طلبہ کے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہے .　　(ع . ر . ق)

نوائے احسن از صفیر احسنی ، الجمعیۃ بک ڈپو ، دہلی ۶، صفحات ۹۶ ، قیمت دو روپے پچاس پیسے .

نوائے احسن چند اصلاحی نظموں کا مجموعہ ہے جو بچوں کے لئے تیار کیا گیا ہے . ابتدا میں چند تاریخی واقعات اور کئی اکابر صحابہ کا منظوم تعارف اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے . ان صحابہ کی تاریخہائے وفات بھی منظوم صورت میں درج ہیں جو غالباً لطف سخن کے طور پر شامل کی گئی ہیں . لیکن بچوں کو ان سے دلچسپی نہیں ہوسکتی . اخیر میں ‹باپ کا پیام بیٹوں کے نام› اور ‹حوا کی دو بیٹیاں› کسی قدر طویل نظمیں ہیں . مجموعے کی ہر نظم دقیق الفاظ اور مشکل تراکیب سے بھری ہوئی ہے . اگرچہ مشکل الفاظ کے معنی فٹ نوٹ میں دیدئے گئے ہیں پھر بھی یہ نظمیں بچوں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرسکتیں .

(ع . ح . س)

مقالات

مرتب :

عبدالحلیم ساحل

معاونین :

خورشید مظہر الحق نعمانی

علاء الدین جینابڑے

فہرست عنوانات

۱	مذہبیات	۱
۲	تذکرہ و سیرت نگاری	۵
۳	تنقید ، ادب ، لسانیات	۱۱
۴	تاریخ و سیاسیات	۲۲
۵	تعلیمات	۲۵
۶	آرٹ	۲۵
۷	متفرقات	۲۶

مذھبیات

۱　ابو الاعلیٰ مودودی
اسلامی ادب کیا ہے؟
زندگی ، اپریل ۷۱ ص ۴۵ تا ۴۶
جدید غیر اسلامی ادب کی خصوصیات کے مقابل اسلامی ادب میں جو خوبیاں ہونی چاہئیں ، ان کا محتاط انداز میں تذکرہ

۲　ابو الحسن علی ندوی
حجة الوداع اور اس کی شان یکتائی
الفرقان ، جنوری ۷۲ ، ص ۲۷ تا ۳۵
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری حج کو مثالی حج قرار دینے کے وجوہ بیان کئے ہیں۔

۳　امینی محمد تقی ، مولانا
جدید زمانہ میں امت مسلمہ کی ذمہ داری — عید کا ایک پیغام
الفرقان ، دسمبر ۷۱ ، ص ۲۳ تا ۳۱
عید الفطر کے موقع پر مسلمانوں کو زمانہ شناسی کی ترغیب اور بدلے ہوئے حالات کے تحت از سر نو اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت کی تلقین کی گئی ہے۔

۴　امینی محمد تقی ، مولانا
حضرت عمرؓ کے قانونی مآخذ
الفرقان ، اکتوبر ۷۱ ، ص ۷ تا ۱۵
حضرت عمر نے سیاست مدن کے کے سلسلہ میں جن آیات و احادیث سے مسائل و احکام کا استناد کیا ان مآخذ کا مختصر تذکرہ

۵　برہان الدین سنبھلی
اختلاف مطالع کی شرعی حیثیت
الفرقان ، اگست ۷۱ ، ص ۴۵ تا ۶۲
« توحید اھلّہ » کے سلسلہ میں قرآن و حدیث کی روشنی میں ایک مفید بحث جس میں علماء کی مختلف رائیں پیش کی گئی ہیں۔

۶　تقی الدین ندوی
ہندوستان میں علم حدیث
الفرقان ، اگست تا نومبر ۷۱
ص ۲۹ تا ۴۴
۴۲ تا ۴۷
۱۶ تا ۲۲
۴۹ تا ۵۶
ان صحابہؓ و تابعینؒ کا ذکر جو ہندوستان آئے اور علم حدیث پھیلانے کی کوشش کی۔

۷　جلال الدین عمری
اسلام کا تصور عبادت

زندگی ، اپریل ، مئی ۷۱ ، ص ۱۴ تا ۲۱
۳۲ تا ۳۸

«عبادت خداوندی» کا صحیح مفہوم قرآن شریف کی آیات کی روشنی میں متعین کیا ہے۔

۸ عامر عثمانی
خلافت و ملوکیت
تجلی ، دیوبند ، ستمبر ۷۱ ، ص ۲ تا ۱۴۰

مولانا ابوعلی مودودی کی کتاب «خلافت و ملوکیت» پر مولانا محمد میاں نے اپنی کتاب «شواہد تقدس» میں اعتراضات کئے ہیں۔ یہ دونوں نمبر عامر عثمانی کے رشحات قلم کا نتیجہ ہیں جن میں انھوں نے مولانا محمد میاں کی کتاب کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور اس کی غلطیوں اور غلط بیانیوں کی نشاندہی کی ہے۔

۹ سید جمال الدین افغانی
ترجمہ ۔ عظیم الشان صدیقی
اسلام اور سائنس
جامعہ دہلی ، جون ۷۱ ، ص ۲۸۷ تا ۲۹۷

فرانس کے مشہور عالم ریناں نے اپنی ایک تقریر میں اسلام اور عربوں پر فلسفہ اور سائنس کی ترقی میں رکاوٹ ڈالنے کا الزام عائد کیا تھا۔ سید جمال الدین افغانی نے اپنے اس جواب میں جو ۱۸۸۳ ع میں فرانسیسی میں شائع ہوا تھا اس نظریہ کا اعادہ کیا ہے کہ ہر مذہب بنیادی طور پر فلسفہ اور سائنس کا مخالف ہے۔

۱۰ شاہ معین الدین احمد ندوی
جزء حجة الوداع ویلیه جزء عمرات النبي صلی الله علیه وسلم
معارف ، اعظمگڈھ ، جنوری ۷۱ ، ص ۶۸ تا ۷۳

یہ رسالہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کے قلم کا تازہ ترین افادہ ہے یہ دو جزوں پر مشتمل ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حج و عمرات کے متعلق مفصل اور محققانہ معلومات کا مستند ذخیرہ ہے

۱۱ شبیر احمد ازہری
توحید اہلہ کی تجویز
الفرقان ، مئی ، جون ۷۱ ، ص ۵۷ تا ۶۲

رویت ہلال کے سلسلہ میں کیا ایک خاص جگہ کی رویت کو دیگر مقامات کے لئے واجب التسلیم قرار دیا جا سکتا ہے یا نہیں ۔ اس بحث سے متعلق مختلف پہلوؤں کی وضاحت

۱۲ شیخ عنایت اللہ ، ڈاکٹر
چند قرآنی الفاظ کی لغوی تحقیق
معارف ، اعظمگڈھ نومبر ۷۱ ، ص ۳۴۶ تا ۳۶۲
دسمبر ۷۱ ، ص ۴۲۶ تا ۴۴۷

اس مضمون میں بعض قرآنی الفاظ کی نوعیت ، ان کے اشتقاق کی بحث ، ان کے انتخاب میں اعلام کے علاوہ معربات اور شواذ و نوادر کو بالخصوص ترجیح دی ہے اور ان کی تشریح میں جدید لسانی تحقیقات سے مدد لی ہے

۱۳ ضیاء الدین اصلاحی

«کل مولود یولد علی الفطرة» کا مفہوم

معارف، اعظمگڈھ، ستمبر ۷۱، ص ۱۶۵ تا ۱۸۷

اکتوبر ۷۱، ص ۲۷۱ تا ۲۸۹

علامہ ابن عبد البر کی کتاب التمہید کا ایک ورق، یہ علامہ کی مایۂ ناز اور اہم کتاب ہے جو مؤطا امام مالکؒ کی ایک مبسوط اور ضخیم شرح ہے۔

۱۴ ضیاء الدین اصلاحی

مستدرک حاکم اور اس پر اعتراضات کا جائزہ

معارف، اعظم گڈھ، جنوری ۷۱، ص ۲۵ تا ۴۹

فروری ۷۱، ص ۱۱۱ تا ۱۲۱

مارچ ۷۱، ص ۱۶۵ تا ۱۸۸

امام ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ حاکم (م. ۴۰۵ ھ) اکابر محدثین میں ہیں۔ ان کی سب سے اہم ارر شہرۂ آفاق کتاب المستدرک علی الصحیحین ہے اس مضمون میں مضمون نگار نے سب سے پہلے اس کی خصوصیات اور اس کے متعلق ضروری معلومات بیان کی ہیں اور اس کے بعد اس پر اور حاکم پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں ان کا مفصل جائزہ لیا ہے۔

۱۵ عبد الماجد دریابادی

تازہ فرنگی تحقیق

الفرقان، دسمبر ۷۱، ص ۳۲ تا ۳۳

مسیح و مسیحیت سے متعلق چند معاصر مسیحی علماء کے تازہ ترین خیالات جن سے نتیجةً یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسیحی تعلیمات کے سب مآخذ لائق اعتبار نہیں یہ اعتراف حقیقت، حضرت عیسی علیہ السلام کی سادہ اور مختصر زندگی کی غمازی کرتا ہے۔

۱۶ فضل الرحمن ڈاکٹر

اسلامی تجدد

اسلام اور عصر جدید، دہلی، جنوری ۷۱، ص ۲۹ تا ۴۱

جمال الدین افغانی جو تحریک تجدد کے حقیقی بانی تھے اس کی تاکید کرتے تھے کہ زندگی کی ہر سطح پر اندرونی اصلاحات بھی ہوں لیکن ذہنی و معاشرتی تجدد کی راہ میں بے شمار موانع ہیں مضمون نگار نے ان کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ — باقی

۱۷ فوزان، کبیر الدین

روح کے اقسام کے متعلق مسلم مفکرین اور صوفیوں کے خیالات

معارف، اعظم گڈھ، جون ۷۱، ص ۴۴۵ تا ۴۶۵

مسلمان مفکرین اور صوفیاء میں روح کے متعلق خیالات اور اعتقادات میں بہت اختلاف ہے۔ ان میں سے ایک اختلاف یہ ہے کہ انسان کے اندر ایک روح ہے یا چند۔ اس مضمون میں اسی نکتہ پر بحث کی گئی ہے اور مختلف آراء کو پیش کیا گیا ہے۔

۱۸ محمد ایوب اصلاحی

عورت اور اسلام

زندگی، مارچ و اپریل ۱۔، ص ۲۶ تا ۳۲ و ۲۲ تا ۴۰

دوسرے ادیان و مذاہب کے مقابلہ میں اسلام نے عورت کے بلندی مرتبہ اور اس کے حقوق میں توسیع کی ہے حدیث و قرآن کی روشنی میں عورت کے مقام بلند کو ثابت کیا ہے ۔

۱۹ محمد راشد صاحب

عرب قومیت کا تصور

اور ساطع الحصری

اسلام اور عصر جدید ، دہلی ، جنوری ۷۱ ، ص ۵۲ تا ۶۹

ساطع الحصری نے شریف حسین کی موافقت کی ہے . طٰہ حسین کے نظریۂ قومیت سے اختلاف کیا ہے . حصری کے خیالات کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے .

۲۰ محمد شہاب الدین ندوی

کلوروفل اور قرآن

برہان ، دہلی ، مئی ۷۱ ، ص ۲۹۷ تا ۳۱۲
جون ۷۱ ، ص ۳۶۹ تا ۳۸۶
جولائی ۷۱ ، ص ۱۲ تا ۲۸
اگست ۷۱ ، ص ۹۷ تا ۱۰۷

اہل یورپ کارل لنناوس کو بیالوجی کا بانی بتاتے ہیں لیکن اس سے ساڑھے پانچ صدی قبل امام رازی نے کلوروفل کے خواص بیان کئے تھے اسلامی علوم کی کتابوں سے سائنسی انکشافات کی نشاندہی کی گئی ہے ۔

۲۱ محمد نعیم صدیقی

سیاست میں اسلام

معارف ، اعظم گڈھ ، نومبر ۷۱ ، ص ۲۶۳ تا ۲۷۴
دسمبر ۷۱ ، ص ۴۴۵ تا ۴۵۴

انگریزی کے مشہور رسالہ « دی مسلم ورلڈ » نے چند سال « سیاست میں اسلام » کے عنوان سے ایک سمپوزیم منعقد کیا تھا اور اس پر مختلف ماہرین سے مضامین لکھوائے تھے . ان مضامین سے مختلف ملکوں کے مسلمانوں کے سیاسی و مذہبی رجحانات پر روشنی پڑتی ہے اس لئے ان کا ترجمہ شائع کیا گیا ہے ۔

۲۲ محمود الحسن

جدید ذہن اور مذہبی تعلیم

اسلام اور عصر جدید ، دہلی ، جنوری ۷۱ ، ص ۷۰ تا ۷۷

عصر جدید نے جو چیلینج مذہب اور اہل مذہب کے سامنے پیش کیا ہے اس کا مقابلہ قرآن پاک اور سیرت نبوی کی تعلیم سے کیا جا سکتا ہے ۔

۲۳ نجات اللہ صدیقی ، ڈاکٹر

ہندوستان میں اقامت دین

زندگی ، دسمبر ۷۱ ، ص ۴۳ تا ۶۲

افراد کی طرح قوموں کا انقلاب حال محض وعظ و فہمائش سے ممکن نہیں اقامت دین کے سلسلہ میں ہندوستان کے جمہور کو ساتھ لینا ہوگا . اور اس سلسلہ میں پہلے مسلمانوں کی خستہ حالی اور معاشی افلاس کا علاج کرنا ضروری ہے . اس کے بغیر اقامت دین صحیح معنوں میں برپا ہو ہی نہیں سکتی ۔

۲۴ نریش ، ڈاکٹر
گورو بانی — اسلامی فلسفے کی روشنی میں
شیرازہ ، سرینگر ، جلد ۹ شمارہ ۲ ص ۵۰ تا ۶۵
گورونانک نے فلسفے کی بجائے تجربے پر زیادہ زور دیا ہے اور یوں وہ اسلام سے زیادہ قریب ہیں انھوں نے پانچ سال اسلام کے مراکز کا دورہ کیا تھا. گورو بانی میں مسلمان صوفیوں کے تینوں عقیدے جبر ، قدر اور بین الجبر والقدر ملتے ہیں

۲۵ نعمانی ، محمد منظور
معارف الحدیث
الفرقان ، جنوری تا دسمبر ۷۱
بالترتیب از ص ۵ تا ۱۴
ص ۵ تا ۲۲
ص ۵ تا ۲۱
ص ۵ تا ۱۸
ص ۹ تا ۱۵
ص ۴ تا ۱۲
ص ۵ تا ۲۲
معاملات اور معاشرت اسلامی کی احادیث (مثلاً گفتگو ، ہنسی و مزاح ، کھانے پینے اور لباس کے آداب) کی مختصر تشریح

۲ ۔ تذکرہ و سیرت نگاری

۲۶ ابو الحسن علی ندوی
صحبتے با اہل دل
الفرقان ، اکتوبر ۷۱ ، ص ۲۳ تا ۲۷
حضرت شاہ محمد یعقوب مجددیؒ کے ملفوظات جن میں بڑی باریک بینی کے ساتھ تصوف کے مسائل اور اصلاح احوال کے طریقوں کی طرف اشارات کئے گئے ہیں .

۲۷ ابو سلیمان شاہجہانپوری
مولانا ابو الکلام آزاد اور تحریک نظم جماعت
برہان ، دہلی ، فروری ۷۱ ، ص ۸۱ تا ۹۶
مارچ ۷۱ ، ص ۱۵۳ تا ۱۶۷
تحریک نظم جماعت کے سلسلے میں مولانا آزاد کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں میں غلام رسول مہر ، خواجہ عبد الحی فاروقی ، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ، مولوی شفاعت علی اور مستری محمد صدیق وغیرہ تھے . ان حضرات کے سوانح ، علمی و ادبی کا نامے اور مولانا سے تعلقات و عقیدت پر روشنی ڈالی گئی ہے ،

۲۸ احسن فاروقی
ٹی ایس ایلیٹ ، شاعر اور نقاد
تحریک ، مئی ۷۱ ، ص ۳۳ تا ۴۰
ایلیٹ کے ادبی اور تنقیدی کارناموں کا جائزہ لیا ہے .

۲۹ احمر لاری ، ڈاکٹر
حسرت موہانی بحیثیت تذکرہ نگار
دوسری قسط
نوائے ادب ، بمبئی ، جنوری ۷۰ ، ص ۲۹ تا ۵۴
گذشتہ سے پیوستہ

۳۰ افسری افتخار بیگم

میر قمر الدین منت

نوائے ادب ، بمبئی ، جنوری ۷۰ ، ص ۵۵ تا ۷۲

منت کے خاندان ، وطن اور شاعری پر بحث کی ہے اور علوم دینیہ میں بھی ان کی افضلیت کا ذکر کیا ہے ۔

۳۱ امیر حسن عابدی

مجرم کشمیری

شہزادہ ، سرینگر ، جلد ۹ شمارہ ۲ ، ص ۴۳ تا ۴۹

مرزا مہدی مجرم حضرت مخدوم حمزہ کشمیری کے معتقد اور سید عبداللہ کے شاگرد تھے ۔ غالباً مہاراجہ گلاب سنگھ کے درباری شاعر تھے ۔ دیوان مجرم کا ایک قلمی نسخہ اورینٹل ریسرچ لائبریری سرینگر میں موجود ہے ۔

۳۲ امین چند شرما

شاہ صادق اورنگ آبادی

سب رس ، حیدر آباد ، اگست ۷۱ ، ص ۱۸ تا ۲۱

شاہ صادق ، عبد اللطیف بیجاپوری کے مرید اور خلیفہ تھے ۔ ان کے کلام میں تصوف کا رنگ غالب ہے ۔

۳۳ انور صدیقی

جامعہ ، دہلی ، جنوری ۷۱ ، ص ۲۲ تا ۳۲

علم و دانش کا چراغ — برٹرنڈ رسل

مضمون کی دوسری قسط ہے جس میں سیاست ، تعلیم اور جنس جیسے موضوعات پر رسل کے خیالات کی وضاحت کی ہے اور رسل کی نجی زندگی پر روشنی ڈالی ہے ۔

۳۴ خورشید مظہر الحق نعمانی

مولانا آزاد — شخصیت اور فن

شاعر ، بمبئی ، جون ۷۱

مولانا آزاد کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے فن پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے ۔

۳۵ سعید انصاری

ہندوستان میں جدید تعلیم کی رفتار — تعلیمی دستاویزوں کی روشنی میں

جامعہ ، دہلی ، فروری ۷۱ ، ص ٦۲ تا ۸۷

ہندوستان میں تعلیم جدید کی باضابطہ بنیاد ۱۸۱۳ع میں پڑی جب کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے پہلی بار ایک لاکھ روپئے کی رقم اپنے سالانہ بجٹ میں تعلیم کے لئے رکھی ۔ تعلیمی دستاویزوں کی روشنی میں انگریزی دور حکومت کی تمامتر کمیٹیوں ، کمیشنوں اور منصوبوں کا جائزہ لیا گیا ہے ۔

۳٦ سید احتشام احمد ندوی

سید رشید رضا کی تحریک المنار

اسلام اور عصر جدید ، دہلی ، جنوری ۷۱ ، ص ٦۸ تا ۸۸

المنار ایک اصلاحی تحریک تھی ۔ جسکا مقصد پان اسلامزم تھا ۔ یہ تحریک سید جمال الدین افغانی کی تحریک تجدد اور تحریک اخوان المسلمین کے درمیان دب کر رہ گئی ۔

۳۷ سید سخی نقوی

شاہ ولایت رح صاحب کا نسب

برہان ، دہلی ، جنوری ۷۱ ، ص ۴۰ تا ۴۷

امروہہ کے سادات نقویہ کے مورث اعلیٰ سید حسن شرف الدین شاہ ولایت رح کے نسب ، ان کی تاریخ پیدائش تاریخ ورود امروہہ ، تاریخ وفات ، ان کے چھوٹے فرزند سید عبد العزیز کی شہزادی کے ساتھ شادی نیز ان کے مذہب کے سلسلے میں اختلافات کا تصفیہ تاریخی شواہد سے کیا ہے ۔

۳۸ سید صباح الدین عبد الرحمٰن

ڈاکٹر سید محمود

معارف ، اعظم گڈھ ، نومبر ۷۱ ، ص ۳۷۴ تا ۲۹۶

دسمبر ۷۱ ، ص ۴۵۵ تا ۴۷۴

ڈاکٹر سید محمود کے انتقال پر ایک طویل مقالہ جس میں ان کے حالات زندگی ، تعلیم ، سیاست اور دار المصنفین سے ان کی شیفتگی کا ذکر کیا گیا ہے ۔

۳۹ سید صباح الدین عبد الرحمٰن

ملا عبد القادر بدایونی

معارف ، اعظم گڑھ ، اگست ۷۱ ، ص ۸۵ تا ۱۰۸

ستمبر ۷۱ ، ص ۱۶۵ تا ۱۸۰

ملا عبد القادر بدایونی کے حالات زندگی ، ان کی تصنیفات اور ان کے معاصرین کی آراء کا ذکر کیا ہے ۔

۴۰ شیخ فرید الدین

خزائن رحمت

نوائے ادب ، مبئی ، اکتوبر ۷۰ ، ص ۱۰ تا ۵۱

خزائن رحمت حضرت شیخ باجن کی قلمی یادگار ہے اس میں حضرت موصوف نے اپنے پیر و مرشد حضرت شاہ رحمت اللہ کے ارشادات اور دیگر مشائخین کے اقوال جمع کئے ہیں ، توحید ومعرفت کے اسرار و رموز بیان کئے ہیں اور جابجا اپنے ہندی اشعار اور دوہے نقل کئے ہیں ۔ مضمون نگار نے اس کا تعارف اور تبصرہ پیش کیا ہے ۔

۴۱ شیخ فرید الدین

شاہ بہاء الدین باجن رح

نوائے ادب ، بمبئی ، اکتوبر ۷۰ ، ص ۱ تا ۹

نویں صدی ہجری کے مشہور صوفی بزرگ شاہ باجن کے حالات زندگی ، ان کی تصنیف «خزائن رحمت» اور ان کے زہد و اتقا کا ذکر کیا ہے ۔

۴۲ ضیاء الحسن فاروقی

کمال محمد نامق

(۱۸۴۰ — ۱۸۸۸)

اسلام اور عصر جدید ، دہلی ، جنوری ۷۱ ، ص ۴۲ تا ۵۱

نامق کمال نے ترکی زبان کو ایک نیا اسلوب بخشا اور اسے اس قابل بنایا کہ اس کے ذریعے مغرب کے جدید خیالات و افکار زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکیں ۔ یہ آزادی اور وطنیت کا پیغامبر تھا ۔ — باقی دارد

۴۳ ضیاء الحسن فاروقی

ذاکر صاحب کے چند پسندیدہ اشعار

جامعہ ، دہلی ، مارچ ۷۱ ، ص ۱۱۹ تا ۲۶

ڈاکٹر ذاکر حسین کے چند پسندیدہ اشعار پیش کئے ہیں جن سے ان کے ذوق لطیف اور شخصیت پر روشنی پڑتی ہے ۔

۴۴ عبد العظیم اصلاحی

بدایۃ المجتہد لابن رشد

معارف ، اعظم گڈھ ، اگست ۷۱ ، ص ۱۰۹ تا ۱۳۲

ابن رشد جس درجہ کا فلسفی تھا اس درجہ کا فقیہ و مجتہد بھی تھا لیکن اس کی فلسفیانہ شہرت نے اس کی فقہی حیثیت کو بالکل دبا دیا اس مضمون میں اس کی اس حیثیت سے بحث کی گئی ہے ۔

۴۵ عبد السلام قدوائی

مصلح اعظم

الفرقان ، جنوری ۷۲ ، ص ۱۴ تا ۲۵

دنیا کے مختلف مذاہب اور اقوام کے مصلحین کے مقابل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصلاحی کارناموں کے پیش نظر آپ کو مصلح اعظم قرار دیا جا سکتا ہے ۔ اس سلسلہ میں آیات و احادیث سے استدلال کیا ہے ۔

۴۶ عبد اللطیف اعظمی

ذاکر صاحب کے ابتدائی حالات زندگی

جامعہ ، دہلی ، مارچ ۷۱ ، ص ۳۰ تا ۱۳۶

ڈاکٹر ذاکر حسین کی تاریخ پیدائش ، زمانۂ طالبعلمی اور اساتذہ سے متعلق ایک تحقیقی مضمون ہے ۔

۴۷ عبد الحلیم خاں ، ڈاکٹر

جمال الدین الاسنوی اور ان کی طبقات الشافعیہ

برہان ، دہلی ، جولائی ۷۱ ، ص ۲۹ تا ۴۷
اگست ، ، ص ۸۲ تا ۹۶
ستمبر ، ، ص ۱۵۳ تا ۹۷
اکتوبر ، ، ص ۲۲۵ تا ۲۴۴
نومبر ، ، ص ۲۹۷ تا ۳۱۶
دسمبر ، ، ص ۳۷۹ تا ۳۸۴

اسنا ، دریائے نیل کے مغربی کنارے پر ایک مردم خیز شہر ہے جہاں ۷ ہجری میں طبقات الشافعیہ کے مصنف جمال الدین کی ولادت ہوئی ۔ آپ کے حالات زندگی بتفصیل بیان کئے ہیں اور کتاب پر تبصرہ کیا ہے ۔

۴۸ قاضی اطہر مبارکپوری

ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی

معارف ، اعظم گڈھ ، اپریل ۷۱ ، ص ۲۴۵ تا ۲۶۵
مئی ، ،
جون ، ، ص ۴۰۵ تا ۴۲۴
اکتوبر ۷۱ ، ص ۲۹۰ تا ۳۱۱

قاضی شہاب الدین کے حالات زندگی ان کی علمی برتری اور زہد و تقوی پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے ۔ اس میں شیخ صفی الدین ردولوی اور شیخ عبد القدوس گنگوہی کا ذکر خاص طور سے کیا ہے

۴۹ قاضی زین العابدین

حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی رح

الفرقان ، اگست ، ستمبر ۷۱ ، ص ۲۲ تا ۳۰

ص ۳۳ تا ۴۱

مولانا کے کمال علم و اخلاق کا تذکرہ اور اپنے تاثرات پیش کئے ہیں ۔

۵۰ گوپال متل

ڈاکٹر سید عبد اللطیف

تحریک ، دسمبر ۷۱، ص ۵ تا ۶

ڈاکٹر مرحوم کی شخصیت کے چند نقوش پیش کئے ہیں ۔ مضمون میں یہ بھی بتایا ہے کہ غالب کی قدح سے ان کا مقصود اصلی نقادوں کے رجحانات کو صحیح راہ تنقید کی طرف پھیرنا تھا ۔

۵۱ گیان چند ، ڈاکٹر

اعجاز صاحب ــــ میرے استاد

فروغ اردو ۔ جولائی ۷۱، ص ۵ تا ۹

ڈاکٹر اعجاز حسین (الہ آباد) سے متعلق اپنے زمانۂ طالب‌علمی کے تاثرات اور ان کے حسن اخلاق کی تعریفیں کی ہیں موصوف کی تنقیدی بصیرت پر اختصار کے ساتھ ریمارکس بھی کئے ہیں ۔

۵۲ محمد اجتباء حسین ندوی

امام شافعی رح

شاعر اور ادیب

جامعہ ، دہلی ، مارچ ۷۱، ص ۱۳۸ تا ۱۴۴

حضرت امام شافعی رح کی نشو و نما اور تربیت عرب کے مشہور فصیح و بلیغ قبیلہ بنو اسد میں ہوئی تھی ۔ وہ بلندپایہ شاعر اور ادیب بھی تھے ۔ مضمون نگار نے حالات زندگی کا مختصر خاکہ پیش کیا ہے اور کلام پر تبصرہ کیا ہے ۔

۵۳ محمد رضا ، مفتی

بانی درس نظامی استاد الهند ملا نظام الدین محمد فرنگی محلی رح

معارف، اعظم گڈھ ، جنوری ۷۱، قسط نمبر ۷، ص ۵ تا ۲۴

فروری ۷۱، قسط ۸، ص ۸۵ تا ۱۱۰

مارچ ۷۱، قسط ۹ ص ۱۱۲ تا ۱۳۴

گذشتہ سے پیوستہ

۵۴ محمد رضا انصاری

لطائف اکبری ــــ نادر قلمی ملفوظ

برہان ، دہلی ، مارچ ۷۱ ، ص ۱۸۰ تا ۱۹۴

مئی " ، ص ۳۱۳ تا ۳۲۵

جون " ، ص ۳۸۶ تا ۳۹۷

جولائی " ، ص ۴۸ تا ۵۶

ستمبر " ، ص ۱۸۸ تا ۱۹۹

اکتوبر " ، ص ۲۶۱ تا ۲۷۴

خواجہ علی اکبر مودودی رح (۱۲۰۹ھ) کے احوال و اقوال پر مشتمل ایک قلمی ملفوظ کا تعارف اور جستہ جستہ متن پیش کیا ہے ۔

۵۵ محمد زمان سیفی

حکیم علوی خان دہلوی

معارف ، اعظم گڈھ ، اگست ۷۱ ، ص ۱۳۳ تا ۱۴۱

حکیم علوی خان جو ایک مشہور

طبیب تھے ان کے حالات زندگی اور طبی تصانیف کا جائزہ لیا ہے۔

۵۶　محمد نعیم ندوی

ہندوستان سے تعلق رکھنے والے چند تبع تابعین

برہان، دہلی، اگست ۷۱، ص ۱۰۸ تا ۱۲۳
ستمبر " ، ص ۱۷۹ تا ۱۸۷

اسرائیل بن موسی، ربیع بن صبیح اور ابومعشر بخیح سندھی الاصل کے ہندوستان سے تعلقات اور حدیثوں کی روایت میں ثقاہت سے متعلق تفصیلات درج ہیں۔

۵۷　محمد نعیم ندوی

عبدالعزیز بن عبداللہ الماجشون

الفرقان، نومبر ۷۱، ص ۲۷ تا ۳۷

ماجشون کی وجہ تسمیہ کا بیان، نیز ان کے فضل و کمال کا تذکرہ

۵۸　منت اللہ رحمانی

حضرت مولانا فضل الرحمن گنج مرادآبادی اور اتباع شریعت و سنت

الفرقان، مئی۔جون ۷۱، ص ۲۷ تا ۳۹

اتباع شریعت کی وہ مثالیں لکھی ہیں جن کے پیش نظر اس سلسلہ میں مولانا کی انفرادیت نمایاں ہوتی ہے۔

۵۹　نسیم احمد فریدی

داماں کوہ سے ایک مرد حق آگاہ کی آواز بازگشت

الفرقان، جون۔جولائی ۷۱، ص ۴۰ تا ۴۶
ص ۲۵ تا ۳۲

خواجہ محمد عثمان دامانی کے ملفوظات

۶۰　نسیم احمد فریدی

بزم خواجہ خرد دہلوی کی ایک جھلک

الفرقان، جنوری ۷۱، ص ۴۵ تا ۵۲
فروری " ص ۵ تا ۱۲

حضرت خواجہ خرد (صاحبزادہ خواجہ باقی باللہ دہلوی) کے ملفوظات کا انتخاب

۶۱　نعمانی محمد منظور

مولانا عبدالحفیظ صاحب بلیاوی مرحوم

الفرقان، ستمبر ۷۱، ص ۴۹ تا ۵۰

ذاتی تعلقات کا تذکرہ، اس کے علاوہ مرحوم کی تالیفات کا مختصر تعارف

۶۲　نعمانی محمد منظور

یاد رفتگان

الفرقان، فروری ۷۱، ص ۴۳ تا ۵۲

شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی، قاری محمد شبیر لکھنوی، مولانا خیر محمد جالندھری اور مولانا مفتی محمد نعیم لدھیانوی سے متعلق اپنے تاثرات۔

۳۔ تنقید، ادب، لسانیات

۶۳ آزاد جگن ناتھ
اقبال اور برگساں
صبح امید، بمبئی، ستمبر ۷۱، ص ۴ تا ۷

اقبال اور برگساں اس نظریہ پر متفق ہیں کہ عقل حقیقت کا ادراک اس وقت تک نہیں کرسکتی جب تک وجدان کی حدوں میں داخل نہ ہوجائے۔ نظریۂ زمان کے بارے میں اقبال کو برگساں سے اختلاف ہے کیونکہ برگساں زمان کو حقیقت کہتا ہے۔

۶۴ آل احمد سرور، پروفیسر
تراجم اور اصطلاح سازی کے مسائل
جامعہ، دہلی، جنوری ۷۱، ص ۱۲۹ تا ۱۳۵

غلط تراجم کی مثالیں پیش کی ہیں اچھے تراجم کی نشاندہی کی ہے اور اصطلاح سازی کے مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے چند اصول پیش کئے ہیں۔

۶۵ ابوالفیض سحر
اردو، اور اس کا رسم الخط
تحریک، فروری ۷۱، ص ۱۵ تا ۱۸

اردو کے موجودہ رسم الخط کی تائید کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اس کے بدلنے سے کیا کیا خطرات درپیش ہونگے رسم الخط کی تبدیلی، صرف رسم الخط کا مسئلہ نہیں بلکہ وہ ایک تہذیبی مسئلہ بھی ہے۔

۶۶ ابوالنصر محمد خالدی
قصیدۂ امین گجراتی
نوائے ادب، بمبئی، اکتوبر ۷۰، ص ۵۲ تا ۶۳

محمد امین نے یوسف زلیخا کی داستان گوجری زبان میں منظوم کی اس کا ایک مخطوطہ مصنف کو کتب خانہ مختاریہ میں ملا ہے اسکا اصل متن پیش کیا ہے۔

۶۷ ابوالنصر محمد خالدی
اصلاح کلام: حالی کی مثال
جامعہ، دہلی، نومبر ۷۱، ص ۲۳۶ تا ۲۵۰

عرب شعراء ارتجالاً صادر ہونیوالے ابیات کو ایک مدت تک کانٹ چھانٹ کے ذریعے درست کرتے رہتے تھے۔ اسی طرح حالی نے بھی مسدس کو سات سال کے بعد دوبارہ شائع کیا تو کئی بند اور ابیات میں تبدیلی کی ہے۔

۶۸ ابو محمد سحر
گل رعنا اور اس سے متعلق مسائل
تحریک، نومبر ۷۱، ص ۱۳ تا ۱۷

انتخاب کلام غالب مسمیٰ بہ گل رعنا کے مختلف نسخوں اور انکے مالکوں کی نشاندہی کی ہے۔ ساتھ ہی اس انتخاب کی صحیح تاریخ تالیف کا تعین بھی زیر بحث ہے

۶۹ احتشام احمد ندوی

عربی ادب میں نثر کی تنقید کا ارتقاء

معارف ، اعظم گڈھ ، جون ۷۱ ، ص ٦٦ م تا ۷۴

عربی ادب میں نثر کی تنقید کے ارتقا کا مجمل جائزہ ہے۔

۷۰ اختر بستوی

حبسۂ غالب — ایک ناقابل فراموش کتاب

فروغ اردو ، جولائی ۷۱ ، ص ۲۴ تا ۲۸

سعادت علی صدیقی کی کتاب «حبسۂ غالب» (جس میں مصنف نے غالب کے حادثۂ اسیری کا پس منظر پیش کیا ہے) پر تبصرہ کیا ہے۔ اور زندانی ادب کے سلسلہ میں حبسۂ غالب کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

۷۱ اقبال بلگرامی

خطوط نگاری

فروغ اردو ، نومبر ـ دسمبر ۷۱ ، ص ٦ تا ۱۵

خطوط نگاری کا ادب میں کیا مقام ہے ؟ اردو خط و کتابت کے اہم اہم موڑ کون سے ہیں؟ خطوط نویسی کے سلسلے میں اردو کے اکابر کا طرز انشاء ؟ ان نقاط سے بحث کی ہے۔

۷۲ اکبر حیدری کاشمیری ، ڈاکٹر

تذکرۂ بہار بیخزاں

تحریر ، دہلی ، جنوری تا مارچ ۷۱ ، ص ۱۶۵ تا ۱۸۸

تذکرۂ بہار بیخزاں مولفہ احمد حسین پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے اس کے مطبوعہ نسخہ کی خامیوں کی نشاندہی کی ہے۔ اس کا اصلی خطی نسخہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

۷۳ اکبر رحمانی جلگانوی

ادب ، زندگی اور مقصد

صبح امید ، بمبئی ، مارچ ۷۱ ، ص ۱۱ تا ۱۲

ادب برائے ادب محض فرار ہے۔ اچھا ادب نہ صرف زندگی کی عکاسی کرتا ہے بلکہ تنقید و جراحی کرتا ہے اور اصلاح زندگی اس کا مقصد ہوتا ہے۔

۷۴ اکمل ایوبی ، ڈاکٹر

اردو پر ترکی زبان کے اثرات

تحریر ، دہلی ، جنوری تا مارچ ۷۱ ، ص ۵۳ تا ٦۴

اردو زبان پر ترکی زبان کے اثرات کا تاریخی و تحقیقی جائزہ لیتے ہوئے بہت سے الفاظ کی ایک فہرس پیش کی ہے جو اصلاً ترکی ہیں لیکن اردو میں بلاتکلف بولے جاتے ہیں اور جزو زبان بن گئے ہیں۔

۷۵ امیر عارفی

نیاز فتحپوری کی عقلیت پسندی

جامعہ ، دہلی ، جولائی ۷۱ ، ص ۴۵ تا ۵۰

نیاز نے شاہ ولی اللہ ، سرسید ، شبلی اور ابوالکلام آزاد کی روایات کو آگے بڑھایا اور عقل و ذہن کو کام میں لاکر مذہب کو سمجھنے کی ترغیب دی نیاز کی تصنیف من و یزدان اس کی شاہد ہے۔

۷۶ ایم. اے. نصر

مغربی بنگال میں اردو افسانہ نگاری

سب رس، حیدرآباد، اگست ۷۱ ص ۲۲ تا ۲۶

نو طرز مرصع اور رانی کیتکی کو چھوڑ کر جو داستانیں تصنیف و تالیف ہوئی ہیں کم و بیش فورٹ ولیم کالج میں ترتیب دی گئی ہیں. مغربی بنگال میں افسانہ نگاری کے تدریجی ارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے.

۷۷ انور صدیقی

روش — ایک رومانی شاعر

جامعہ، دہلی، اپریل ۷۱، ص ۱۷۵ تا ۱۸۴

روش صدیقی اور ان کے ہمعصروں کی رومانی شاعری دراصل اردو کی اصلاحی اور مقصدی شاعری کے خلاف ایک طرح کا رد عمل تھی.

۷۸ اوتار کرشن دبیر

کشمیری ادب — ایک تعارف، ایک جائزہ

شہرازہ، سرینگر، جلد ۹ شمارہ ۳، ص ۱ تا ۹

کشمیری شاعری کے ابتدائی نقوش گیارھویں صدی عیسوی سے ملتے ہیں لیکن اس کی ادبی تاریخ تیرھویں صدی سے شروع ہوتی ہے. مضمون نگار نے شاعری اور ادب کو چار حصوں میں تقسیم کر کے ہر دور کا تعارف اور جائزہ پیش کیا ہے.

۷۹ باقر کاظمی

شہر حیدرآباد کی دکنی بول چال اس کی نفسیات اور مضمرات

سب رس، حیدرآباد، اگست ۷۱، ص ۸ تا ۱۷

معاشرتی نکتۂ نگاہ سے حیدرآباد کی اردو بول چال میں جو جامعیت اور کلاسیکی انداز ہے وہ شاید دلی کی بول چال اور لکھنؤ کے روز مرہ میں بھی نہ ہو.

۸۰ بدیع الزمان

محاکاتی شاعری

شیرازہ، سری نگر، جلد ۹ شمارہ ۲، ص ۸۴ تا ۹۶

محاکاتی شاعری کی وضاحت کے سلسلے میں رسوا، اثر، حالی، شبلی، ارسطو اور ایڈیسن کے خیالات کے ساتھ ساتھ محاکاتی شاعری کے نمونے پیش کئے گئے ہیں.

۸۱ بشیر بدر

مرزا دبیر کی مرثیہ نگاری کی خصوصیات

شہرازہ، سری نگر، جلد ۹ شمارہ ، ص ۶۷ تا ۹۵

مرزا دبیر کی مرثیہ نگاری کی خوبیاں بتائی ہیں اور مولانا شبلی کی اس رائے کو غلط بتایا ہے کہ مرزا دبیر کے کلام میں فصاحت و بلاغت کی کمی ہے.

۸۲ تسنیم فاروقی

اردو شاعری اور غیر مسلم خواتین

شیرازہ ، سری نگر، جلد ۹ شمارہ ۱ ، ص ۷۰ تا ۷۵

چار عیسائی اور پانچ ہندو شاعرات کا مختصر تعارف نمونہ کلام کے ساتھ پیش کیا گیا ہے

۸۳ تنویر احمد علوی، ڈاکٹر

تنقید متن

نوائے ادب، بمبئی، جولائی ۷۰ ، ص ۳۲ تا ۵۶

بتایا ہے کہ تنقید متن اپنی نوعیت اور مقصد کے اعتبار سے ادبی تنقید سے مختلف چیز ہے اس کو اساسی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ معروضی مطالعہ اور موضوعی مطالعہ ، مضمون نگار نے اسکی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔

۸۴ جاوید وشسٹ

ملا وجہی پر سرقہ کا الزام غلط اور بے بنیاد ہے

نوائے ادب، بمبئی، جنوری ۷۰، ص ۲۶ تا ۳۸

مولوی عبدالحق اور نورالسعید اختر کے اس الزام کی تردید کی ہے کہ سب رس ملا فتاحی نے لکھا اور تحقیق سے یہ بات ثابت کی ہے کہ «سب رس» کا اصل ماخذ «پربھودھ چندرودے» مصنفہ کرشن مشر ہے اور دکنی اردو میں اسکو طبع زاد طور پر ملا وجہی نے پیش کیا ہے۔

۸۵ حامداللہ ندوی

تامل پر عربی، فارسی، اردو کے اثرات

ہندوستانی زبان ، بمبئی ، اکتوبر ۷۰، ص ۲۵

تامل ہندوستان کی ایک بہت ہی قدیم زبان ہے جسکے ادب کی بنیاد تیسری صدی قبل مسیح سے پہلے پڑچکی تھی۔ ایک جائزے کے مطابق تامل میں عربی کے ۲۸۹، فارسی کے ۱۱۹ اور اردو کے ایکہزار سے بھی زیادہ الفاظ مروج ہیں جنکی تامل قواعد کے مطابق باقاعدہ شدھی کردی گئی ہے۔

۸۶ حامد علی خاں ، ڈاکٹر

ہندوستان کی عربی شاعری میں عجمیت

معارف ، اعظم گڈھ، ستمبر ۷۱ ، ص ۲۰۶ تا ۲۱۹

ہندوستان کی عربی شاعری میں عجمی اثرات کی نشاندہی کرتے ہوئے ہندوستان کے مشہور عربی شعراء آزاد بلگرامی ، قاضی عبدالمقتدر ، شاہ ولی اللہ وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔

۸۷ حامد علی خاں

خواجہ کشمیریؒ کی عربی شاعری

شیرازہ ، سری نگر، جلد ۹ شمارہ ۲ ، ص ۵ تا ۱۵

خواجہ حبیب اللہؒ کشمیری کی ایک عربی مثنوی الانصاف فی بیان طریق النجاۃ کا قلمی نسخہ رضا لائبریری میں دستیاب ہوا ہے جسکی بنا پر مضمون نگار نے خواجہ موصوف کو عربی زبان کا پہلا ہندوستانی صاحب تصنیف عربی شاعر گردانا ہے۔ مثنوی مع اردو ترجمہ پیش کی گئی ہے۔

۸۸ حسینی شاہد
کلمۃ الحقائق — اردو نثر کا پہلا مستند نقش
نوائے ادب ، بمبئی ، جولائی ۷۰ ، ص ۱ تا ۳۱
کلمۃ الحقائق مصنفہ برہان الدین جانم کو اردو نثر کا پہلا نمونہ بتایا ہے. اور اس کے دو مطبوعہ متن مرتبہ اکبرالدین صدیقی اور ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا ہے .مرتبین نے اس کتاب کے صرف چار نسخوں سے استفادہ کیا ہے اور باقی چارنسخے ان کی دسترس سے باہر رہے ہیں.

۸۹ رادھے شیام پاٹھک
خان خانان کی اخلاقی شاعری
جامعہ ، دہلی ، مارچ ۷۱ ، ص ۱۴۵ تا ۱۴۹
عبدالرحیم خان خانان کی ہندی اخلاقی شاعری ست سئی ، شتک ، دوہوں اور آزاد نظموں کے روپ میں ہے جو پر اثر صاف و شستہ زبان میں ہے اور قومی مزاج کی ترجمانی کرتی ہے.

۹۰ رقیہ انعامدار
مقالہ نما ، نوائے ادب
نوائے ادب ، بمبئی ، اپریل ۷۰ ، ص ۱ تا ۶۶
جلد ۱ تا ۲۰ (۱۹۵۰ تا ۱۹۶۹ء) تک شائع ہونیوالے مضامین کا اشاریہ تیار کیا ہے.

۹۱ زرینہ ثانی
اردو نظم کا تاریخی ارتقاء
شیرازہ ، سرینگر ، جلد ۹ شمارہ ۲ ، ص ۶۲ تا ۷۸
دکنی شعرا سے لیکر حالی ، شبلی اقبال ، جوش اور تلک چند محروم تک ہر دور کے شعراء کی مختلف اقسام کی نظموں کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے.

۹۲ سخاوت مرزا
پریم کہانی
ہندوستانی زبان ، بمبئی ، اکتوبر ۷۰ . ص ۵۲ تا ۵۶
مولوی شیخ فرید صاحب برہانپوری نے پریم کہانی کو شیخ برہان الدین راز الٰہیؒ المتوفی ۱۰۸۳ھ کی تصنیف بتایا ہے. مضمون نگار کی تحقیق کے مطابق یہ کتاب دوست محمد برہانپوری کی تصنیف ہے.

۹۳ سلطانہ طاہرہ قریشی ، ڈاکٹر
کشمیر میں فارسی کا عروج شاہجہانی عہد میں
شیرازہ ، سرینگر ، جلد ۹ شمارہ ۲ ، ص ۳۴ تا ۶۶
بشمول کلیم ، صائب ، میرالٰہی ، قدسی غنی اور چندر بھان برہمن ۲۹ فارسی شعراء کا تذکرہ ہے. ان میں سے بیشتر نظامت کشمیر سے منسلک تھے یا الطاف خسروانہ یا شاہی خاندان کے دیگر افراد کی داد و دہش سے سرفراز ہوتے رہے.

۹۴ سلیمان اطہر جاوید ، ڈاکٹر
نذرل کا ذہنی ارتقا
شاعر ، بمبئی ، جنوری ۷۱ ، ص ۲۱ تا ۲۸
قاضی نذرالسلام کی شاعری کے

متضاد پہلوؤں پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ سب اختلافات ایک ہی شخصیت کے ارتقا کے مختلف مدارج ہیں البتہ یہ ضرور ہے کہ باغی ہونے کی وجہ سے نذرل کی شاعری میں انتہا پسندی اس حد تک ہے کہ اس کے مواد ہی میں نہیں اسلوب ولب ولہجہ پر بھی چکا چوند کی کیفیت نظر آتی ہے اس کی شخصیت اور شاعری ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں

۹۵ سید احتشام حسین ندوی

ادب اور نئی نسلیں

جامعہ، دہلی، مارچ ۷۱، ص ۱۵۰ تا ۱۵۴

قدامت پرستی تو یقینی طور پر غلط بات ہے لیکن ترقی پسندی میں قدامت سے رشتہ منقطع نہ کرنا چاہئے۔

۹٦ سید حامد حسین، ڈاکٹر

نقش فریادی ہے کس کی شوخئ تحریر کا!

شاعر، بمبئی، ستمبر ۷۱، ص ۱۰ تا ۱۷

مضمون نگار کا خیال ہے کہ ابتک ہم غالب کے بارے میں صرف وہی تاثرات رکھتے ہیں جیسے خود غالب اپنے بیانات سے پیدا کرنا چاہتے تھے لیکن اب اس بات کی ضرورت ہے کہ غالب کی شاعرانہ زندگی کا تجزیہ ازسرنو اور ایک آزادنہ اور غیر جانبدارانہ انداز سے کیا جائے اور ان کی شاعرانہ عظمت کو اس کے اصل روپ میں پیش کیا جائے۔

۹۷ سید صباح الدین عبدالرحمن

ابوالفضل اور اس کی انشاپردازی پر ایک نظر

معارف، اعظم گڈھ، جولائی ۷۱، ص ۳۰ تا ۵۲

ابوالفضل کے حالات زندگی اور اکبر نامہ اور دوسری اہم تصانیف سے اسکی انشاپردازی پر جو روشنی پڑتی ہے اس کا ذکر کیا ہے۔

۹۸ سید صباح الدین عبدالرحمن

غالب کی وطنیت پر ایک نظر

معارف، اعظم گڈھ، اپریل ۷۱، ص ۲٦٦ تا ۲۸٦

غالب کا مولد اکبرآباد یعنی آگرہ تھا لیکن وہ اسے چھوڑ کر دلی میں آباد ہوگئے تھے اور یہی ان کا وطن ہوگیا تھا لیکن وہ اپنے ابتدائی وطن کو بھولے نہیں تھے جس کا ذکر انکی تحریروں میں اکثر ملتا ہے۔

۹۹ سید عبدالسلام

فیض محسن

فروغ اردو، نومبر-دسمبر، ص ۱٦ تا ۲۴

حضرت نیرنگ کاکوروی کے رنگ شاعری سے بحث، نیزان کے طریقہ اصلاح کلام کی خوبیاں، اشعار پیش کرکے بیان کی ہیں۔

۱۰۰ سید علی جواد زیدی

باز یافت

تحریر، دہلی ، اپریل ۔جون ، شمارہ ۲ ، ص ۵۷ تا ۷۴

مکتوب افضل حسین ثابت رضوی بنام سید کرار حسین جس میں انیس و دبیر کی مساوات عمر اور تقدم شہرت کی بحث ہے، دوسرا مخطوطہ مخمس و مثنوی حمید الدولہ رضا قلی خاں حمید لکھنوی کا ہے دونوں کی شان نزول یہ ہے کہ والی اودھ محمد علی شاہ نے چند خواب دیکھے اور حمید سے بیان کئے انہیں کی فرمایش پر یہ مخمس اور مثنوی لکھی گئی ۔

۱۰۱ سید مسعود حسن رضوی

مراثی ریختہ — شمالی ہند کی قدیم ترین اردو نظمیں

تحریر، دہلی ، اپریل تا جون ۷۱ ، ص ۳ تا ۵۶

یہ مرثیے جو پہلے پہل منظر عام پر پیش کئے گئے ہیں ان سے قدیم تر نظم یا نثر کی کوئی چیز شمالی ہند میں اب تک دستیاب نہیں ہوئی ہے ۔ یہ مرثیے مشترک اور مختص خصوصیات کے حامل ہیں اور ایک مخصوص دور کی پوری نمائندگی کرتے ہیں صلاح کے مرثیوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے ۔ ان کے علاوہ قربان علی ، قاسم ، خادم ، سعید ، محب ، صادق اور کلیم وغیرہ کے مراثی بھی شامل ہیں ۔

۱۰۲ شاکرہ بیگم

اردو میں فہرست اور اشاریہ سازی کے کچھ مسائل

نوائے ادب ، بمبئی ، اپریل ۷۰ ، ص ۹ تا ۱۲

لائبریریوں میں کتابوں کی فہرست سازی اور رسالوں میں شائع ہونے والے مواد کی اشاریہ سازی کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے مختلف مسائل پر بحث کی ہے اور چند تجاویز پیش کی ہیں

۱۰۳ شاہ معین الدین احمد ندوی

ارمغان سلیمان

معارف ، اعظمگڈھ ، جولائی ۷۱ ، ص ۵ تا ۲۹

سید صاحب کے مجموعۂ کلام « ارمغان سلیمان » پر تبصرہ اور ان کی شاعرانہ صلاحیت پر بحث کی ہے ۔

۱۰۴ شاہ معین الدین احمد ندوی

اقبال کی تعلیمات پر ایک نظر

معارف ، اعظمگڈھ ، اکتوبر ۷۱ ، ص ۲۴۵ تا ۲۷۰
نومبر ۷۱ ص ۳۲۵ تا ۳۶۲
دسمبر " ص ۴۰۵ تا ۴۲۵

اس مقالہ میں اقبال کی دوسری تعلیمات کے ساتھ اسلام کے بنیادی ارکان توحید ، رسالت ، وحی قرآن اور اسلامی شریعت وغیرہ کے متعلق ان کے خیالات کو خصوصیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے ۔

۱۰۵ شمیم احمد

اردو کا تمدنی مزاج

شاعر، بمبئی ، نومبر ۷۱ ، ص ۲۷ تا ۴۰
دسمبر " ص ۹ تا ۱۲

بتایا ہے کہ ہر زبان کی طرح اردو بولنے والوں میں بھی تمدنی خصوصیات کی جھلک نظر آتی ہے اور اس سے مسلمانوں کے تہذیب و تمدن کی شکل نمودار ہوتی ہے۔

۱۰۶ صاحبزادہ شوکت علی خاں

میر ممنون اور مرزا غالب

شیرازہ، سرینگر، جلد ۹ شمارہ ۳ ص ۱۰ تا ۳۲

« مرزا نے اپنی غزل کی بنیاد ایسے اچھوتے مضامین پر رکھی جن کو اردو شعرا کی فکر نے مس نہیں کیا تھا۔ » حالی کی اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے مضمون نگار نے بتایا ہے کہ غالب نے بیدل سے لے کر میر و ممنون تک کا تتبع کیا ہے۔ فخر الشعراء میر نظام الدین ممنون اجمیر میں صدر الصدور کے عہدے پر فائز تھے۔ کلیات غیرمطبوعہ ہے۔ غالب کا جوہر انہی کے تتبع سے چمکا۔

۱۰۷ صفدر آہ

امیر خسرو کی ہندی شاعری

تحریک، مارچ ۷۱، ص ۱۱ تا ۱۵

خسرو کی ہندی شاعری کی خصوصیات بیان کی ہیں اور ان کی ہندی شاعری کے چند نمونے پیش کئے ہیں۔

۱۰۸ طاہر محسن کاکوروی

ملا محسن کاکوروی اور ان کا معنی بند مضمون باب کلام

فروغ اردو، جولائی ۷۱، ص ۱۷ تا ۲۰

نعت گو شاعر محسن کاکوروی کے بلاغت کلام کی وضاحت اور بعض غیر مانوس الفاظ جو محسن نے استعمال کئے ہیں ان کے استعمال کا جواز پیش کیا ہے۔

۱۰۹ ظہیر الدین صدیقی، ڈاکٹر

اردو رسم خط کا تہذیب سے رشتہ

نوائے ادب، بمبئی، جنوری ۷۰، ص ۴۳ تا ۷۷

اردو رسم خط ہماری تہذیب کا آئینہ دار ہے۔ اس کی تبدیلی کی مخالفت کی ہے۔

۱۱۰ ۱) عبد الحلیم ساحل

۲) علاءالدین جینا بڑے

۳) خورشید مظہر الحق نعمانی

نوائے ادب، بمبئی، اکتوبر ۷۰، ص ۱ تا ۲۶

سنہ ۱۹۶۹ ع میں شائع شدہ اردو مضامین کا اشاریہ ہند و پاک کے مختلف جرائد و رسائل سے لیا گیا ہے۔

۱۱۱ عبد الرزاق قریشی

سودا کا ایک قطعہ

نوائے ادب، بمبئی، جولائی ۷۰، ص ۶۵ تا ۷۰

سودا کے ایک قطعہ پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ سودا کا کلام نہیں معلوم ہوتا بلکہ الحاقی معلوم ہوتا ہے، کیونکہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں جو مخطوطہ کلیات سودا کا ہے اس میں یہ قطعہ درج نہیں ہے اور قیاس یہی ہے کہ یہ کلیات سودا کا سب سے قدیم مخطوطہ ہے۔

۱۱۲ عبدالستار دلوی ، ڈاکٹر

دکنی پر مراٹھی کا اثر

ہندوستانی زبان ، بمبئی ، اکتوبر ۷۰ ، ص ۵ تا ۲۷

گیانیشور ، مکتا بائی ، نام دیو ، شیخ محمد اور امرت رائے قدیم عہد میں مراٹھی کے باکمال صوفی شاعر ہو گذرے ہیں۔ ان کے ہاں کھڑی بولی میں شاعری کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ مرہٹی اور اردو دونوں انڈو آریائی خاندان السنہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ لہذا مرہٹی کے بے شمار الفاظ من و عن یا تبدیلیوں کے ساتھ جن کی توجیہات مضمون میں کی گئی ہیں ، دکنی میں شامل ہوگئے ہیں۔

۱۱۳ عصمت جاوید

عبدالحق کا اسلوب نگارش

ہندوستانی زبان ، بمبئی ، اکتوبر ۷۰ ، ص ۵۷ تا ۷۳

مولوی عبدالحق نے صاحبِ طرز انشا پرداز ہونے کی کبھی شعوری کوشش نہیں کی بلکہ ان کی تحریروں میں انشا پردازی کا رنگ خود بخود ابھر آیا ہے۔ وہ جذبات لطیفہ اور وجدانِ قلب کو ایک محقق اور نقاد ہونے کے باوجود اہمیت دیتے تھے۔ شخصیت اور اسلوب نگارش کا ملاجلا تجزیہ کیا ہے۔

۱۱۴ گوپال متل

اردو ادب میں ہندوستانیت کا فقدان

حقیقت یا واہمہ !

تحریک ، فروری ۷۱ ، ص ۵ تا ۶

اردو ادب اور شاعری میں «ہندوستانیت» کی کمی کا اعتراف اور اس کمی کے وجوہات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس ہندوستانیت کو اردو ادب میں لانے کا ذریعہ منصوبہ بندی نہیں بلکہ اس کے تخلیقی اظہار کے لئے ماحول کو بدلنا ضروری ہے۔

۱۱۵ گوپی چند نارنگ

اردو میں لسانیاتی تحقیق

نوائے ادب ، بمبئی ، اکتوبر ۷۰ ، ص ۶۴ تا ۷۰

اردو میں لسانیاتی تحقنق کا جائزہ باغ و بہار، آثار الصنادید و آب حیات سے لیتے ہوئے موجودہ دور تک کی تمام اہم کتابوں اور مصنفین کا ذکر کیا ہے۔

۱۱۶ گوپی چند نارنگ

امریکہ میں اردو

تحریر، دہلی ، جولائی - ستمبر ۷۱ ، ص ۶۹ تا ۷۸

یہ بتایا ہے کہ عام طور سے غیر ممالک میں اردو کی تعلیم سے متعلق لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ وہاں کے لوگوں کو اردو سے عشق ہے۔ اردو زبان سے اس کا ادب مراد ہوتا ہے اور ادب سے مراد محض شاعری ، لیکن امریکہ اور دوسرے ممالک میں زبان کی تعلیم اپنی لسانی و ثقافتی اہمیت کے پیش نظر دی جاتی ہے۔

۱۱۷ گیان چند ، ڈاکٹر

خودنوشت دیوان غالب اور اس کی اصلاحیں

تحریر ، دہلی ، اپریل - جون ۷۱ ، ص ۷۵ تا ۱۱۲

سنہ ۱۹۶۹ع میں بھوپال سے دیوان غالب کا جو قلمی نسخہ دریافت ہوا ہے اس پر مفصل بحث کی ہے اور اسے غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا بتایا ہے ۔

۱۱۸ متین سید

فن شعر کا نیا رجحان

شاعر ، بمبئی ، جنوری ۷۱ ، ص ۱۰ تا ۱۴

اردو فن شعر کے نئے رجحان کا مطالعہ کرتے ہوئے مغربی ادب میں اس کا پس منظر تلاش کرنے کی کوشش کی ہے کیونکہ مغرب میں جدیدیت کی روایت کافی قدیم ہے اور اردو میں یہ رجحان یہیں سے پیدا ہوا ہے ۔ نیا شاعر ابھی عبوری دور میں ہے ۔ یہ دور گذرجانے کے بعد نئی شاعری کے حقیقی خدوخال واضح ہونگے ۔

۱۱۹ متین سید

قامت فکر

شاعر ، بمبئی ، نومبر ۷۱ ، ص ۱۰ تا ۲۱

اردو کے قدیم شعراء ولی و وجہی اور دور حاضر کے جدید شعراء کے کلام پر طائرانہ نظر ڈالی ہے ۔

۱۲۰ محمد رضوان احمد خان

خالق باری اور امیر خسرو

شیرازہ ، سرینگر ، جلد ۹ شمارہ ۱ ، ص ۴۹ تا ۶۵

خالق باری ، امیرخسرو کی تصنیف ہونے یا نہ ہونے کے موضوع پر محمدامین چریاکوٹی ڈاکٹر صفدر آہ اور حافظ محمود شیرانی کی تحریروں کا جائزہ لیتے ہوئے شیرانی صاحب کی رائے سے اختلاف کیا ہے ۔

۱۲۱ محمد عظیم اصلاحی

ہدایۃ المجتہد ابن رشد

الفرقان ، اکتوبر ۷۱ ، ص ۳۴ تا ۴۲

نومبر ۷۱ ، ص ۱۵ تا ۲۶

ابن رشد کے فقہی کمال کا تذکرہ ، اس کی کتابوں کا مختصر تعارف اور ہدایۃ المجتہد کی حسن ترتیب اور اصل مضامین پر بحث

۱۲۲ محمد عمر ، ڈاکٹر

اردو ادب کا سماجی پس منظر

تحریر ، دہلی ، جولائی - ستمبر ۷۱ ، ص ۳ تا ۶۸

اردو زبان کس طرح ہندوستان کی تہذیبی و ثقافتی زبان بنی اور اس میں ہندوستان کی عام باتوں کو کس طرح بیان کیا گیا ، تفصیل سے ذکر کیا ہے ۔

۱۲۳ محمد ہاشم علی

نصرتی کی چار غیرمطبوعہ غزلیں

نوائے ادب ، بمبئی ، اپریل ۷۰ ، ص ۱ تا ۸

نصرتی کی چار غیرمطبوعہ دکنی غزلوں کو پیش کیا ہے ۔

۱۲۴ مختار احمد شمیم

ریاست ٹونک میں اردو شاعری کی ابتدا
فروغ اردو، نومبر و دسمبر ۷۱، ص ۲۵ تا ۲۸
ریاست ٹونک کے باضابطہ ریاست بننے سے پیشتر جن شعراء اردو نے محفل شعر و سخن کو گرم رکھا، ان کا مختصر تذکرہ اور اس ضمن میں اردو نواز امراء ریاست کا بیان

۱۲۵ مولانا شبلی نعمانی
مکاتیب بنام مولانا حبیب الرحمان خان شیروانی
معارف، اعظم گڈھ، ستمبر ۷۱، ص ۲۲۰ تا ۲۲۹
مولانا شبلی کے وہ خطوط جو انھوں نے مولانا حبیب الرحمان شیروانی کو ندوہ کے اختلافات سے متعلق لکھے تھے شائع کردئے گئے ہیں۔

۱۲۶ میمونہ دلوی، ڈاکٹر
منشی محمد ابراہیم مقبہ
بمبئی میں ہندوستانی کے اولین معلم
ہندوستانی زبان، بمبئی، اکتوبر ۷۱، ص ۳۸ تا ۵۱
۱۸۰۳ع میں بمبئی کے ایک علاقے ورسووا میں کیڈٹ اسکول کھولا گیا جہاں منشی محمد ابراہیم مقبہ ہندوستانی کے اولین معلم مقرر ہوئے۔ اردو کے علاوہ فارسی، عربی، مرہٹی، گجراتی اور انگریزی میں بھی ان کی تصانیف ہیں۔

۱۲۷ نعیم احمد، ڈاکٹر
دیوان عبید اللہ خاں مبتلا
تحریر، دہلی، جنوری تا مارچ ۷۱، ص ۵ تا ۵۲
مبتلا کے دیوان کی لسانی اہمیت اور اردو ادب کی تاریخ میں اس کے مقام پر روشنی ڈالی ہے۔ دیوان پر مقدمہ قلمبند کیا ہے اور دیوان کا اصل متن پیش کیا ہے۔ اس میں کل ۱۹۷ غزلیں ہیں جن کے اشعار کی تعداد ۶۷۷ ہے۔

۱۲۸ نور السعید اختر، ڈاکٹر
گلزار وحدت از شاہ تراب چشتی
معارف، اعظم گڈھ، جولائی ۷۱، ص ۵۳ تا ۷۲
شاہ تراب کے حالات زندگی اور اور ان کی مشہور تصنیف گلزار وحدت جس کا موضوع تصوف کے اسرار ورموز کی عقدہ کشائی ہے اس کا ذکر کیا ہے اس کے ۱۴ باب ہیں، ہر باب کو گل کا نام دیا گیا ہے۔

۱۲۹ نور السعید اختر، ڈاکٹر
«گیان سروپ» از شاہ تراب چشتی
نوائے ادب، بمبئی، جنوری ۷۰، ص ۱ تا ۲۵
شاہ تراب چشتی کی تصنیف گیان سروپ کا تعارف اور اس کا متن پیش کیا ہے۔ انداز بیان اور لسانیاتی پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

۱۳۰ نور السعید اختر، ڈاکٹر
شاہ تراب کا کچھ نایاب کلام
سب رس، حیدرآباد، اگست ۷۱، ص ۳ تا ۷

انجمن ترقی اردو ، علی گڑھ کے کتب خانے سے اٹھارویں صدی عیسوی کے ایک دکنی صوفی شاہ تراب کا کچھ کلام دستیاب ہوا ہے جو اس مضمون میں پیش کیا گیا ہے ۔ — باقی ۔

۱۳۱ واقف محمد ایوب

یحییٰ اعظمی کی شاعری

سب رس ، حیدر آباد ، اگست ۷۱ ص ۲۷ تا ۲۹

اقبال سہیل کے شاگرد یحییٰ اعظمی ایک کہنہ مشق شاعر ہیں ۔ ان کی شاعری اور حالات زندگی پر تبصرہ کیا گیا ہے ۔

۱۳۲ ہادی نقشبندی

برق خاطف ، بمبئی — مہاراشٹر کا سب سے پہلا اردو اخبار

صبح امید ، بمبئی ، جولائی ۷۱ ، ص ۳۱ تا ۳۳

کتب خانۂ نقشبندیہ خانقاہ بالاپور میں مہاراشٹر کے سب سے پہلے اردو اخبار برق خاطف کی ایک فائل موجود ہے ۔ اس کا تعارف پیش کیا ہے ۔

۴ ۔ تاریخ و سیاسیات

۱۳۳ اداریــــہ

امن اور جنگ کا سرچشمہ

اسلام اور عصر جدید ، دہلی ، جنوری ۷۱ ، ص ۵ تا ۲۸

امن اور مذہب کی عالمی کانفرنس منعقدہ کیوٹو (جاپان) سنہ ۱۹۷۰ع کی کارروائی کی مختصر رپورٹ اور غور وفکر کے نتائج کا خلاصہ مع تنقید پیش کیا گیا ہے ۔

۱۳۴ ارک سٹوکس

تلخیص و ترجمہ : ماجد حسین

۱۸۵۷ع کی جنگ آزادی

جامعہ ، دہلی ، جولائی ۷۱ ، ص ۷ تا ۱۳

اگست ۷۱ ، ص ۶۳ تا ۷۴

سہارنپور اور مظفرنگر کے دیہی علاقوں کی بغـــاوت کی تفصیلات اور وجوہات کا بیان ہے ۔

۱۳۵ امینی محمد تقی ، مولانا

حضرت عمر کی سیاسی اصلاحات

الفرقان ، مئی-جون ۷۱ ، ص ۱۹ تا ۲۶

جولائی ، ص ۱۶ تا ۲۴

اسلامی تنظیم کے سلسلہ میں سیاست سے کام لینا پڑتا ہے ۔ اس ضمن میں حضرت عمر کی اجتہادی مساعی کا ذکر ہے ۔

۱۳۶ انور احمد

تاریخ کوکن مصنفہ ڈاکٹر مومن محی الدین

نوائے ادب ، بمبئی ، اپریل ۷۰ ، ص ۱۳ تا ۱۹

ڈاکٹر مومن کی کتاب پر نقدوتبصرہ کرتے ہوئے اس کی چند خامیوں کی نشاندہی کی ہے ۔

۱۳۷ جعفر رضا بلگرامی

کیرلا

جامعہ، دہلی، اپریل ۷۱، ص ۲۰۶ تا ۲۱۴
کیرالا کی قدیم تاریخ بیان کی ہے

۱۳۸ جواد علی
ترجمہ: نثار احمد فاروقی
تاریخ طبری کے مآخذ
برہان، دہلی، جنوری ۷۱، ص ۵۷ تا ۶۷
مارچ ″ ص ۱۹۵ تا ۲۰۲

عمر کسری، الہیثم بن عدی، سیف ابن عمر، ھشام بن عروۃ، السری بن یحیی عبیداللہ بن سعد الزھری، یعقوب بن ابراہیم ابو روق الہمدانی، المثنی بن ابراہیم اور یزید الفقعسی سے استفادوں کی نشان دہی کی ہے. یونان کی وجہ تسمیہ پر روشنی ڈالی ہے.

۱۳۹ حامد اللہ ندوی
ہندوستانیت اور اردو کا مزاج
شاعر، بمبئی، جنوری ۷۱، ص ۵۴ تا ۵۷

یہ بتایا ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندوستان میں مشترکہ تہذیب اور متحدہ ہندوستان کا تصور نہ تھا. مسلمانوں نے اردو کے ذریعہ یہ تصور یہاں پیدا کیا.

۱۴۰ خورشید احمد فاروق
علوی دور میں مسلمانوں کی اقتصادی حالت
برہان، دہلی، جنوری ۷۱، ص ۱۱ تا ۲۶

حضرت علی کے دور خلافت میں عام عرب، غیر ہاشمی قریش، انصار اور ہاشمی قریش کی اقتصادی حالت کا الگ الگ تفصیلی جائزہ لیا ہے اور غلام مکاتب اور موالی کی حیثیتوں پر روشنی ڈالی ہے.

۱۴۱ سید اکبر علی ترمذی
ہندوستانی دفترخانوں میں فارسی دستاویزیں
تحریر، دہلی، جولائی تا ستمبر شمارہ ۳، ص ۷۹ تا ۹۲

مغلیہ، راجپوت و دکن وغیرہ میں فارسی دستاویزوں یعنی فرامین، نشانات، اسناد واخبارات وغیرہ کا ذکر کیا ہے.

۱۴۲ سید صباح الدین عبدالرحمن
«تاریخ بنگالہ مہابت جنگی»
از یوسف علی خاں
مرتبہ عبدالسبحان، ڈاکٹر
معارف، اعظم گڈھ، ستمبر ۷۱، ص ۲۳۰ تا ۲۳۶

ڈاکٹر عبدالسبحان نے یہ کتاب ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے شائع کی ہے. اس کتاب سے اٹھارہویں صدی کے بنگال کے بہت کچھ واقعات معلوم ہو جاتے ہیں.

۱۴۳ ضیاء الحق ندوی
چینی مسلمانوں کا ماضی اور حال
معارف، اعظم گڈھ، اپریل ۷۱، ص ۳۰۹ تا ۳۱۶

عالم اسلام کے ایک فاضل مبصر جمیل بہیم حکومت کی دعوت پر چین تشریف لے گئے تھے جہاں ان کا قیام

ایک مہینہ رہا، انھوں نے مسلمانان چین کے دینی، تعلیمی اور تمدنی حالات کا جائزہ لیا ہے۔ اس کی تلخیص پیش کی گئی ہے۔

۱۴۴ ضیاء الحق ندوی

یمن کا تاریخی اور پر رونق شہر «تعز»

معارف، اعظم‌گڈھ فروری ۷۱، ص ۱۵۰ تا ۱۵۶

تعز یمن کا ایک خوبصورت شہر ہے۔ اس مضمون میں اس کی تاریخی معاشی، زرعی اور تعلیمی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۴۵ ضیاء الحق ندوی

عمان

معارف، اعظم گڑھ، اگست ۷۱، ص ۱۴۲ تا ۱۴۸

عمان عرب کی ایک چھوٹی سی عرب ریاست ہے، ایک عرب سیاح نے اس کے چشم دید حالات لکھے تھے جو مفید معلومات پر مشتمل ہیں ان کی تلخیص پیش کی ہے۔

۱۴۶ عبد الحق ادنان ادیوار

تلخیص و ترجمہ: ضیاء الحسن فاروقی

ترکی میں مشرق و مغرب

جامعہ، دہلی، مئی ۷۱، ص ۲۳۶ تا ۲۴۸

سلطان محمد فاتح نے اسلام اور عیسائیت کا تقابلی مطالعہ کیا۔ انقلاب فرانس اور مطابع کے سبب نئے خیالات فروغ پائے۔ بیچ بیچ میں فکر و فلسفہ پر پابندیاں بھی عائد ہوتی رہیں۔ ترکی میں مذہبی خیالات کی ترویج و اشاعت کا تاریخی جائزہ لیا گیا ہے۔

۱۴۷ محمد نعیم ندوی

آٹھویں صدی ہجری میں اسلامی علوم و فنون کا ارتقا

معارف، اعظم گڈھ، جنوری ۷۱، ص ۵۰ تا ۶۷
فروری « ص ۱۲۲ تا ۱۳۹
مارچ « ص ۱۸۹ تا ۲۱۱

آٹھویں صدی ہجری اور بالخصوص اس کے عہد اواخر کی علمی ترقیوں کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔

۱۴۸ مسعود حسن

مرزا غالب اور مدرسہ عالیہ کلکتہ

معارف، اعظم گڈھ، جون ۷۱، ص ۴۲۵ تا ۴۴۴

مرزا غالب کا سفر کلکتہ ان کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سفر نے ان کی شاعری، ان کے طرز فکر اور ان کے دل و دماغ پر گہرے نقوش چھوڑے مضمون میں انھیں اثرات کا اعادہ کیا گیا ہے۔

۱۴۹ میر حسین شاہ

ترجمہ: محمد خلیق صدیقی

امیر امان اللہ خاں کی اصلاحات

جامعہ، دہلی، جولائی ۷۱، ص ۲۵ تا ۲۸

فرماں روائے افغانستان امیر امان اللہ خان نے تعلیمی اصلاحات پر خصوصیت کے ساتھ توجہ دی اور اس میں ہندوستانی ماہرین سے مدد لی تھی۔

۵ ۔ تعلیمات

۱۵۰ خواجہ احمد فاروقی
اردو یونیورسٹی کی تجویز
الفرقان ، مئی ۔ جون ۷۱ء ص ۷۸ تا ۸۰
مجوزہ «اردو یونیورسٹی» کی افادیت ، نوعیت اور ہمہ جہتی سے بحث کی ہے ۔

۱۵۱ خواجہ احمد فاروقی
ثانوی سطح پر تدریس اردو کے عام مسائل
نوائے ادب ، بمبئی ، جولائی ۷۰ء ص ۵۷ تا ۶۴
عام مسائل میں اردو ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے اردو کا نصاب ، درسی کتب فراہمی اور اساتذہ کی تیاری کو شامل گیا ہے اور اس پر بحث کی ہے ۔

۱۵۲ شانتی رنجن بھٹاچاریہ
ہندوستان میں میڈیکل تعلیم کی ابتدا
جامعہ ، دہلی ، مئی ۷۱ء ص ۲۴۹ تا ۲۵۸
ہندوستانی زبانوں میں جدید یورپ کی میڈیکل تصانیف کا ترجمہ کرنے پر سب سے پہلے راجہ رام موہن رائے نے ہی زور دیا ۔ ڈاکٹر برٹن کی ۲۲ اردو تصانیف کی فہرست کے ساتھ میڈیکل تعلیم کی ابتدائی تاریخ بیان کی گئی ہے ۔

۱۵۳ محمد اجتباء ندوی
نظام الملک طوسی اور اس کے مدارس
جامعہ ، دہلی ، اکتوبر ۷۱ ، ص ۱۸۲ تا ۱۸۹
مذہبی تنازعات کے باعث سلجوقی حکومت کی ڈگمگاتی ہوئی کشتی کو بچانے کے لئے وزیر نظام الملک طوسی نے نو مدارس قائم کئے جو آج کی یونیورسٹیوں کے برابر تھے ۔ مضمون نگار نے مدارس کی تاسیس ، انتظامات اور نصاب کے متعلق تفصیلات پیش کی ہیں

۶ ۔ آرٹ

۱۵۴ غلام ربانی
اجنتا کا تحفظ
جامعہ ، دہلی ، اگست ۷۱ء ص ۷۵ تا ۷۹
سابق حکومت نظام نے اجنتا کے غاروں کی حفاظت کے لئے جو اقدامات کئے ان کا تفصیلی بیان

۷ ـ متفرفات

۱۵۵ اندرجیت لال

پھلوں کا بادشاہ — آم

شیرازہ، سری نگر، جلد ۹ شمارہ ۱، ص ۸۴ تا ۹۵

آم جسے امیر خسرو «فخر گلشن» کہتے ہیں تقریباً چار ہزار سال سے اُگایا جاتا رہا ہے۔ سب سے پہلے ہیون سانگ نے آم کو بھارت سے باہر روشناس کرایا۔ آم سے متعلق مختلف قسم کی معلومات درج کی گئی ہیں۔

۱۵۶ سعید احمد اکبر آبادی

ایران میں چند روز

برہان، دہلی، جنوری ۷۱، ص ۴۸ تا ۵۶
فروری ״ ص ۱۲۵ تا ۱۳۲

سفر ایران کے تاثرات و مشاہدات بیان کئے ہیں۔ مضمون کی ساتویں اور آخری قسطیں ہیں۔

۱۵۷ عبداللطیف اعظمی

اردو صحافت نگاروں کا سمینار

جامعہ، دہلی، اگست ۷۱، ص ۹۹ تا ۱۱۰

اردو صحافت نگاروں کا ایک کل ہند سمینار ۲۵ سے ۲۷ جون (۱۹۷۱) تک نئی دہلی وگیان بھون میں منعقد ہوا تھا۔ کارروائی کا خلاصہ تبصرہ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

۱۵۸ قیصر سرمست

دم دار ستارے

شیرازہ، سری نگر، جلد ۹ شمارہ ۱، ص ۷۶ تا ۸۳

ہمارے نظام شمسی کے تحت سوا لاکھ دمدار ستارے ہیں۔ اجرام فلکی میں ان کا کیا مقام ہے اور یہ کس حساب سے نظر آتے ہیں؟ مضمون نگار نے ماہرین فلکیات کی دریافتوں کا خلاصہ پیش کیا ہے۔

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

اور

ادبی پبلشرز

کی مطبوعات

	قیمت
۱۔ ولی گجراتی از ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی	۳ رُپے
۲۔ نور المعرفت از ولی گجراتی مرتبہ ڈاکٹر سید ظہیرالدین مدنی	۲ «
۳۔ اردو مخطوطات مسجد جامع، بمبئی مرتبہ مولوی حامد اللہ ندوی	۴ «
۴۔ میرزا مظہر جان جاناں از عبدالرزاق قریشی	۶ «
۵۔ لغات گجری مرتبہ سید نجیب اشرف ندوی	۱۰ «
۶۔ دیوان عزلت « عبدالرزاق قریشی	۱۰ «
۷۔ مبادیات تحقیق از « «	۴ رپے، ۵۰ پیسے
۸۔ نوائے آزادی مرتبہ « «	۵ رپے
۹۔ مقالہ نما (نوائے ادب) مرتبہ مس رقیہ انعام دار	۲ «
۱۰۔ راگ مالا از سید عبد الولی عزلت مرتبہ عبدالرزاق قریشی	۴ «

ملنے کا پتا:

ادبی پبلشرز، شیفرڈ روڈ، بمبئی ۸

ایڈیٹر : عبدالرزاق قریشی

پرنٹر پبلشر سید شہاب الدین دسنوی نے ادبی پرنٹنگ پریس، ۸، شیفرڈ روڈ، بمبئی ۸، میں چھپوا کر، مالکان انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ۹۲، دادا بھائی نوروجی روڈ، بمبئی ۱، کے لئے شائع کیا۔

Nawa-e-Adab

A QUARTERLY JOURNAL OF

THE ANJUMAN-I-ISLAM URDU RESEARCH INSTITUTE

Annual Subscription:

Inland & Pakistan : Rs. 6 Foreign : Shillings 12
(inclusive of postage)

Price per copy: Rupee one & Paise fifty

[Vol. 22 1971 OCTOBER - DECEMBER No. 4]

All remittances to be made to

THE ADABI PUBLISHERS

8 Shepherd Road, Bombay 8 (India)

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

کا

سہ ماہی رسالہ

نوائے ادب

ناشر

ادبی پبلشرز (شعبۂ اشاعت انجمن اسلام) بمبئی ۸

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

(بمبئی یونیورسٹی سے ملحق)

کے

اغراض و مقاصد

۱. ایم اے کی تعلیم کا انتظام

۲. پی' ایچ' ڈی اور دوسرے تحقیقاتی کام کرنے والوں کی اعانت۔

۳. تحقیقاتی کام کرنے والے اداروں اور جامعوں سے تعاون۔

۴. ایک جامع کتب خانہ کا قیام۔

۵. مختلف کتب خانوں کے اردو کے مخطوطات کی فہرست کی ترتیب۔

۶. نایاب مخطوطات و مطبوعات کی اشاعت۔

۷. اردو سے متعلق ایک علمی و تحقیقاتی سہ ماہی رسالہ کا اجراء۔

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

کے

سہ ماہی رسالہ نوائے ادب کی خصوصیات

۱. اردو زبان و ادب سے متعلق مختلف پہلوؤں پر بحث و تحقیق۔

۲. گجرات و دکن کی غیر مطبوعہ اردو تصانیف کی اشاعت

۳. اردو سے متعلق تحقیقاتی کاموں کی اطلاع۔

۴. اردو کے علمی و ادبی رسائل کے مضامین کی تلخیص و اشاعت۔

رسالہ سال میں چار بار شائع ہوگا

جنوری اپریل جولائی اکتوبر

چندہ سالانہ:- چھ روپے

فی پرچہ:- ڈیڑھ روپیہ

} مع محصول ڈاک

ایڈیٹر: عبدالرزاق قریشی

ترسیل مضامین و خط و کتابت

ڈائرکٹر

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

۹۲. دادا بھائی نوروجی روڈ

بمبئی ۱

خریداری و ترسیل زر

ہندوستان میں:-

ادبی پبلشرز

۸ شیفرڈ روڈ، بمبئی ۸

نوائے ادب بمبئی

تاریخ اشاعت ۱۵ جولائی ۱۹۷۱ ع

جلد ۲۲	جولائی ۱۹۷۱	شمارہ ۳

شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	میراں جی شمس العشاق	حسینی شاہد	۱
۲	تاریخ متن	تنویر احمد	۳۶
۳	سرسید کا لسانی اسلوب	عتیق احمد صدیقی	۶۵
۴	تبصرے	(ڈاکٹر) عبدالستار دلوی (مولانا) مہرمحمد خان شہاب (ڈاکٹر) آدم شیخ	۷۷

*حسینی شاہد

میراں جی شمس العشاق

تذکروں اور شجروں میں ان کا نام میراں جی ، میرانجیو ، امیرالدین ، شمس الدین اور میراں خاں بتایا گیا ہے. شمس العشاق لقب ہے. سید محمد حسینی معظم کہتے ہیں کہ نام میراں جی تھا اور ان کے پیر کمال الدین بیابانی نے انہیں شمس عشاق ، کے لقب سے سرفراز کیا تھا:

کہے تم ہمارے پہ مشتاق ہیں　　دو عالم میں تم شمس عشاق ہیں
میراں جی اتھا نام ان کا اول　　لقب شمس عشاق کا کر فضل[1]

سید علی پیر کے مطابق یہ لقب عطائے رسول ہے:

لقب ایں را گرفتہ کن تو آواز　　جواب تو دہد آں شاہ شہباز
نبی گفتہ خدا ہست از تو مشتاق　　کہ برخیزاے مرانجی شمس العشاق[2]

خود نوشت کی بموجب ان کا نام امیرالدین ہے:

« اسمنا امیرالدین نہادند المعروف شاہ میراں جی . . . . »[3]

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے خزینۃ الاصفیا کے حوالے سے ان کا نام میاں جی بتایا ہے وہ لکھتی ہیں:

« شاہ میراں جی جو شمس العشاق کے لقب سے مشہور ہیں ارشاد و ہدایت کے ایک مشہور خاندان سے تعلق رکھتے تھے. خزینۃ الاصفیا کے مصنف نے ان کا نام میاں جی بتلایا ہے . »[4]

۱　شاہ معظم ، شجرۃ الاتقیا ، مخطوطہ ۱۲۱ تصوف ، کتب خانہ سالار جنگ ، حیدرآباد

۲　سید علی پیر ، سراج العشق ، مخطوطہ ۹۰ تصوف و اخلاق ، کتب خانۂ سالار جنگ ، حیدرآباد

۳　شاہ میراں جی شمس العشاق ، خود نوشت و نسل نامہ ، مخطوطہ ۸۶۳ ، ادارۂ ادبیات اردو ، حیدرآباد

۴　ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ ، اردو نثر کا آغاز اور ارتقاء ، ص ۱۲۸

---

* ڈاکٹر حسینی شاہد ، ام . اے ؛ پی اچ . ڈی ؛ پرنسپل اردو آرٹ کالج ، حیدرآباد ، دکن سنیٹ ، عثمانیہ یونی ورسٹی ، حیدرآباد ؛ دکن ساہتیہ اکیڈمی ، آندھرا پردیس ، حیدرآباد وغیرہ .

صاحب خزینۃ الاصفیا نے میراں جی شمس العشاق کا نام میاں جی نہیں بتایا ہے بلکہ اس نے مانڈو کے ایک بزرگ کا ذکر کیا ہے جن کا نام شاہ میاں جی تھا اور وہ بہ یک واسطہ سید محمد حسینی گیسو دراز کے مرید تھے :

> "شاہ میاں جی بہ یک واسطہ مرید محمد گیسو دراز است و درویشِ کامل و اکمل بود . در زمانِ وی در ولایت منڈو کسی ازوی بزرگ تر نبود ."[1]

شاہ میاں جی اور شاہ میراں جی شمس العشاق دو علاحدہ شخصیتیں ہیں . نام کی مماثلت کی وجہ سے تسامح سمجھ میں تو آتا ہے لیکن یہ غلط فہمی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی . اس لئے کہ میراں جی کے نام کے ساتھ شمس العشاق کا لقب بھی ہے جو نام کا جزو بن گیا ہے اور میاں جی کا ایسا کوئی لقب نہیں تھا .

دونوں بزرگ بندہ نواز کے سلسلے سے منسلک ضرور ہیں لیکن میاں جی ایک واسطے سے مرید ہیں اور میراں جی دو واسطوں سے مرید ہی نہیں خلف بھی ہیں . تمام قدیم تذکرے متفق ہیں کہ میراں جی کمال الدین بیابانی سے ارادت و خلافت رکھتے تھے . معظم[2]، سید علی پیر[3] اور حالی[4] جو اس سلسلے کے بزرگ ہیں اور حضرت سے قرب زمانی رکھتے ہیں ، یہی سلسلۂ بیعت و خلافت بیان کرتے ہیں . بعد کے بزرگوں میں شاہ تراب[5]، حسین علی شاہ[6] اور عاشق[7] کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا . برہان الدین جانم اور امین الدین علی اعلیٰ کے خلفا اور اس سلسلے کے بیسیوں قلمی شجرے راقم الحروف کی نظر سے گذر چکے ہیں . ان سب میں بیعت و خلافت کا وہی سلسلہ ملتا ہے جو قدیم تذکرہ نگاروں نے دیا ہے . صرف تذکرۃ القادری ، صاحب محبوب ذی المنن اور مؤلف برکات الاولیا نے

۱　مفتی غلام سرور ، خزینۃ الاصفیا ، جلد اول ، ص ۴۰۱
۲　شاہ معظم ، شجرۃ الاتقیا ، مخطوطہ ۱۳۱ تصوف ، کتب خانۂ سالار جنگ ، حیدرآباد
۳　سید علی پیر ، سراج العشق ، مخطوطہ ۹۰ تصوف و اخلاق ، کتب خانۂ سالار جنگ ، حیدرآباد
۴　حالی ، مثنوی حالی ، مخطوطہ ۱۲۹ ، کتب خانۂ درگاہ شریف ، بیجاپور
۵　شاہ تراب ، خلافت نامہ ، مخطوطۂ کتب خانۂ انجمن ترقی اردو (ہند) ، علی گڑھ
۶　حسین علی شاہ ، مجمع العطا ، مخطوطہ ۲۵ ، کتب خانۂ روضتین ، گلبرگہ
۷　عاشق ، کلیات عاشق ، مخطوطہ ۶۲۲/۴ جدید ، کتب خانۂ آصفیہ ، حیدرآباد

میراں جی کو جمال الدین مغربی کا خلیفہ بتلایا ہے۔ لیکن انہوں نے کمال الدین بیابانی سے بھی خلافت کا ذکر کردیا ہے۔

ان سب سے اہم شیخ محمود خوش دہاں کا بیان ہے جنہوں نے اپنا سلسلۂ بیعت و خلافت اس طرح لکھا ہے:

> « بندگی حضرت شاہ برہان الحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز است و آنحضرت دست بیعت حضرت قطب الآفاق حضرت شاہ میرانجی شمس العشاق قدس اللہ سرہ العزیز ہستند و آنحضرت دست بیع (بیعت) کامل الاولیا حضرت شاہ کمال الدین مجرد بیابانی قدس اللہ سرہ العزیز بودہ اند و آنحضرت دست بیع کامل الاولیا حضرت شاہ جمال الدین مغربی قدس اللہ سرہ العزیز بودہ اند و آنحضرت دست بیع عاشق شہباز طالبان نواز نظرباز سرفراز خواجہ صدرالدین ابوالفتح بندگی حضرت مخدوم سید محمد حسین گیسودراز قدس اللہ سرہ العزیز بودہ اند۔»[۱]

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ اس حقیقت کو بھی نظر انداز کرگئیں کہ میاں جی کی وفات سنہ ۸۸۹ میں ہوئی[۲] اور میراں جی شمس العشاق کا سنہ وصال ۹۰۲[۳]، ۹۱۰[۴]، ۹۷۰[۵] اور ۱۰۸۰[۶] بتایا جاتا ہے۔[۷] میاں جی کا انتقال مانڈو میں ہوا اور وہ وہیں دفن ہیں[۸] لیکن میراں جی کی وفات شاہ پور (بیجاپور) میں ہوئی اور ان کا مزار یہیں واقع ہے[۹]۔ مزید براں کسی تذکرے سے یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ میراں جی کا مولد و منشاء مانڈو تھا یا کم از کم یہ کہ انہوں نے کچھ مدت ہی کے لیے سہی، وہاں قیام کیا تھا۔

بہر حال میراں جی کا نام میاں جی نہیں تھا۔ خود نوشت پر اعتماد کیا جائے تو ان کا نام امیرالدین اور عرف میراں جی ہے[۱۰] جس کی توثیق مسافر کے منظوم شجرے سے ہوتی ہے۔

---

۱ محمود خوش دہاں، معرفۃ السلوک، مخطوطہ مملوکہ راقم الحروف
۲ مفتی غلام سرور خزینۃ الاصفیاء جلد اول ص ۴۰۱
۳ مولوی عبدالحق «شاہ میراں جی شمس العشاق» رسالۂ اردو اپریل ۱۹۲۷ ص ۱۶۲
۴ عبدالجبار خان عطاپوری محبوب ذی المنن حصۂ دوم ص ۹۲۲
۵ ایضاً ص ۸۳۶
۶ سید امام الدین برکات الاولیا ص ۱۱۵
۷ میراں جی کے سنۂ وفات کے بارے میں تفصیلی بحث آگے آئے گی۔
۸ مفتی غلام سرور خزینۃ الاصفیا جلد اول ص ۴۰۱
۹ ملاحظہ ہو انوار الاخیار روضۃ الاولیا مشکواۃ النبوۃ تذکرۃ القادری حدیقۂ رحمانی محبوب ذی المنن برکات الاولیا اور واقعات مملکت بیجاپور
۱۰ میراں جی شمس العشاق خود نوشت و نسل نامہ مخطوطہ ۸۶۳ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد

امیرالدین میراں جی شمس العشاق برہان الدین پھر وو حق کا مشتاق[1]
پیرپا شاہ صاحب سجادۂ سالگندہ مملوکہ قدیم شاخ شجرے میں بھی خواجہ کے اضافہ کے ساتھ یہی نام ملتا ہے۔ اور اگر انوارالاخبار پر بھروسہ کیاجائے تو نام شمس الدین تسلیم کرنا پڑے گا[2] جس کی توثیق سید محمد قادری کے مرتبہ خلفائی شجرے[3] اور سید حسن صاحب قادری سجادہ الند کے مملوکہ شاخ شجروں[4] سے ہوتی ہے۔ اور اس قیاس کے لیے گنجایش نکل آتی ہے کہ نام کی رعایت سے ان کا لقب شمس العشاق مشہور ہوا اور اتنا مشہور ہوا کہ اصل نام کو لوگ بھلا بیٹھے صاحب مشکواۃ النبوۃ لکھتا ہے:

«گویند وی از قوم سادات بود که به چند واسطه نسب به زید مظلوم می رسد رضی الله عنه.»[5]

روضۃ الاولیا نے ان کی حسب ذیل الفاظ میں مدح کی ہے:

خدمت عالیش مقتدای اہل عرفان و سر آمد عرفانی دوران و از مشاہیر کمل و شیوخ بلدہ بیجاپور بودند.»[6]

لیکن ان کی سیادت کا ذکر نہیں کیا ہے۔ انوارالاخبار بھی اس سلسلے میں خاموش ہے۔ البتہ تذکرۃالقادری، حدیقۂ رحمانی، تذکرہ محبوب ذی‌المنن اور تذکرۃالانساب متفق ہیں کہ وہ صحیح النسب سید تھے اور ان کا سلسلۂ نسب زید شہید سے ملتا ہے۔ تذکرۃالانساب نے ان کا سلسلہ اس طرح بیان کیا ہے:

«شاہ میرانجی شمس العشاق بن حاجی شریف دوام الدین بن سید علی بن سید محمد بن سید حسین بن سید داود بن سید زین بن سید احمد بن سید حمزہ بن سید سیف اللہ بن سید ابوالحسن بن سید اسداللہ بن سید ابوالحسین بن سید عبداللہ المظلوم امام زید شہید »[7]

---

۱ مسافر شجرۂ منظوم مخطوطہ کتب خانۂ گچی محل بیجاپور

۲ انواراللہ انوارالاخبار مخطوطہ مملوکۂ راقم الحروف

۳ سید محمد قادری برادر کلاں سید محی الدین قادری صاحب مجمع الانساب نے ایک شجرۂ خلفائیہ مرتب کیا تھا جو کتب خانۂ گچی محل بیجاپور میں محفوظ ہے۔ اس شجرہ میں میراں جی کا نام میراں شاہ شمس الدین عشاق درج ہے۔

۴ سید حسن قادری صاحب سجادہ الند کے ہاں دو قدیم شاخ شجرے محفوظ ہیں۔ ان میں سے ایک میں میراں جی کا نام خواجہ شمس الدین العاشق اور دوسرے میں خواجہ شمس الدین شاہ میراں جی لکھا ہے۔

۵ شاہ غلام علی، مشکواۃ النبوۃ، مخطوطہ ۱۹۴ تذکرہ، کتب خانۂ آصفیہ، حیدرآباد

۶ محمد ابراہیم زبیری، روضۃ الاولیا مخطوطہ ۲۶۶ تذکرہ کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد

۷ سید امام الدین تذکرۃ الانساب ص ۴۷

میراں جی شمس العشاق کے سلسلۂ نسب کے تعلق سے تذکرۃ الانساب کے علاوہ خود نوشت ، نسل نامۂ سید علی پیر ، تذکرۃالانساب سادات سکنہ بیجاپور، مجمع الانساب، حدیقۂ رحمانی، تذکرۃالقادری ، مجمع العطا بیاض شجرات مشائخ بیجاپور ، شجرہ مخزونہ کتب خانۂ درگاہ شریف ، شاخ شجرہ مملوکہ مولانا علاءالدین جنیدی اور نسب نامہ مشمولہ مخطوطہ ۱۹۶ ، کتب خانۂ انجمن ترقیٔ اُردو ، ہند، علی گڑھ پیش نظر ہیں :

خودنوشت میں سلسلۂ نسب یوں ہے :

« حاجی شریف[1] دوام الدین بن سید علی[2] بن سید محمد[3] بن سید حسین[4] بن سید داؤد[5] بن سید زین[6] بن سید احمد[7] بن سید محمد[8] بن سید حمزہ[9] بن سید سیف اللہ[10] بن سید ابوالحسن[11] بن سید اسداللہ[12] بن سید ابوالحسین[13] بن سید عبیداللہ (عبداللہ) مظلوم[14] بن سید علی[15] بن سید زین العابدین[16] بن امام حسین[17] بن (علی) ابن ابوطالب کرم اللہ وجہہ[18] . »[1]

خود نوشت کے خاتمہ پر ایک اور نسل نامہ درج ہے جو سید علی پیر سے شروع ہوتا ہے . یہ نسل نامہ حسب ذیل ہے :

حضرت شاہ علی صاحب ابن حضرت بابا شاہ صاحب ابن حضرت شاہ امین الدین علی و ابن حضرت شاہ برہان الدین و ابن حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق و ابن حاجی شریف دوام الدین و ابن سید علی و ابن سید محمد و ابن سید حسین و ابن سید داؤد و ابن سید زین الدین و ابن سید احمد و ابن سید محمد و ابن سید حصین (حسین) و ابن سید حمزہ و ابن سید سیف اللہ و ابن سید ابوالحسن و ابن سید اسداللہ و ابن سید ابوالحصین (حسین) و ابن سید عبیداللہ (عبداللہ) مظلوم و ابن سید علی و ابن امام زین العابدین و ابن امام حسین و ابن حضرت علی ابن ابو طالب کرم اللہ وجہہ .

خود نوشت کے نسل نامہ اور دوسرے شجروں کا اختلاف درج ذیل ہے :

۱ - مجمع العطا میں حاجی شریف دوام الدین کا نام خواجہ سید حاجی شریف دوام الدین، انجمن ترقیٔ اُردو کے نسخے میں سید دوام الدین حاجی شریف ، تذکرۃالقادری میں خواجہ شریف دوام الدین اور مولانا علاءالدین جنیدی کے مملوکہ شاخ شجرے میں حاجی شریف ہے .

---

۱ میراں جی شمس العشاق ، خود نوشت و نسل نامہ ، مخطوطہ ۸۶۳ ، ادارۂ ادبیات اردو ، حیدرآباد

۲- مولانا علاءالدین جنیدی کے مملوکہ شاخ شجرے میں سید حسین (۴) اور سید داؤد (۵) کے نام نہیں ہیں۔

۳۔ نسل نامہ سید علی پیر اور تذکرۃالقادری میں سید زین (٦) کا نام سید زین‌الدین اور شجرۂ انجمن ترقیءِ اُردو میں سید زید لکھا ہے۔

۴۔ تذکرۃالانساب سادات سکنہ بیجا پور، مجمع‌الانساب، حدیقۂ رحمانی، بیاض شجرات مشائخین بیجا پور، شجرہ کتب خانہ درگاہ شریف، مجمع‌العطا اور تذکرۃ الانساب میں سید محمد (۸) کا نام نہیں ہے۔ تذکرۃالقادری میں سید محمد کی بجائے سید رحمان ہے۔

۵۔ مولانا علاءالدین جنیدی کے مملوکہ شاخ شجرے میں سید محمد (۸) کے بعد سید حسن کا نام زائد ہے۔ نسل نامۂ علی پیر میں سید حسن کی بجائے سید حسین ہے

٦۔ مولانا علاءالدین جنیدی کے مملوکہ شاخ شجرے اور تذکرۃالقادری میں سید حمزہ (۹) کا نام نہیں ہے۔

۷۔ تذکرۃالقادری میں سیف‌اللہ (۱۰) کا نام سید سیف‌الدین ہے۔ حدیقۂ رحمانی میں شمس‌العشاق کے حالات میں نسب نامہ نقل کرتے ہوئے سید سیف‌اللہ اور سید شاہ امین‌الدین علی اعلیٰ کے حالات میں سید سیف‌الدین لکھا ہے۔

۸- مجمع‌العطا، شجرۂ انجمن اور مولانا علاءالدین جنیدی کے مملوکہ شاخ شجرے میں سید ابوالحسین (۱۳) کی بجائے سید ابوالحسن لکھا ہے۔

۹۔ تذکرۃالقادری میں سید ابوالحسین (۱۳) کے بعد سید ابا عبداللہ بن سید زید مظلوم بن حضرت امام زین‌العابدین بن حضرت امام حسین علیہ السلام ہے۔

۱۰۔ خود نوشت، نسل نامہ علی پیر، مجمع‌الانساب سادات سکنہ بیجا پور میں زید شہید کا نام سید عبداللہ مظلوم، بیاض شجرات مشایخین بیجاپور میں سید امام عبداللہ مظلوم شہید، شجرۂ درگاہ شریف میں سید عبداللہ مظلومی، مجمع‌العطا میں خواجہ سید زید علی مظلوم حسینی، شجرۂ انجمن میں زید مظلوم، مولانا علاءالدین جنیدی کے مملوکہ شاخ شجرے میں سید مظلوم عبداللہ، تذکرۃالقادری میں سید زید مظلوم، حدیقۂ رحمانی میں ایک جگہ سید عبداللہ سید مظلوم شہید اور دوسری جگہ سید عبداللہ زید مظلوم اور تذکرۃالانساب میں سید عبداللہ المظلوم امام زید شہید ہے۔

۱۱- خود نوشت کے علاوہ صرف نسل نامہ سید علی پیر ، مجمع الانساب اور تذکرۃ الانساب سادات سکنہ بیجاپور میں سید علی (۱۵) کا نام ملتا ہے۔ مؤخر الذکر میں سید علی کے ساتھ اصغر کا اضافہ بھی ہے۔

۱۲- مجمع العطا میں سید محمد (۳) سے زید مظلوم (۱۴) تک ہر نام کے ساتھ خواجہ کا اضافہ ہے۔

۱۳- بیاض مشائخین بیجا پور میں سید علی (۲) سے سید ابوالحسین (۱۳) تک حسینی کا اضافہ ہے۔

تذکرۃ الانساب سادات سکنہ بیجا پور اور مجمع الانساب نے امین الدین علی اعلیٰ کی سیادت پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میراں جی کے والد کا نام حاجی شریف دوام الدین نہیں بلکہ حاجی دولت مکی تھا اور وہ سید نہیں مغل تھے :

« بداں کہ از ثقات ثبوت پیوستہ کہ شاہ امین الدین بیجاپوری قدس سرہ از قدیم الایام در اہل بیجا پور از قوم مغل مشہور و معروف ہستند واللہ اعلم بحقیقۃ الحال. ثانیاً آن کہ حاجی دولت مکی کہ جد حقیقی شاہ برہان الدین جانم والد شاہ امین الدین صاحب موصوف است اولاد ایشان در نسب خویش لفظ حاجی دولت مکی را متبدل بہ حاجی دوام الدین ساختہ نسب دروغ سیادت خود بہ سید عبداللہ مظلوم کہ فرزند سید علی اصغر ابن امام زین العابدین اند رسانیدہ خود را از سادات حسینی اشتہار دادہ اند و حقیقت حاجی دولت مکی بدین منوال است کہ حاجی دولت مکی را چہار فرزند بودند. یکی ہیبت خاں ، دویم مراتب خاں ، سویم تیغ جنگ خاں ، چہارم میراں خاں المعروف بہ میراں جی صاحب . . . .

« مشایخین ما سلف در بلدۂ بیجا پور شک در بعض بعض نسب ہای سیادت داشتہ اند و چنانکہ شک در سیادت شاہ امین الدین صاحب داشتہ اند. »[1]

صاحب مجمع الانساب لکھتا ہے :

«از قدیم الایام در اہل بیجا پور مشہور است کہ شاہ امین الدین صاحب از زمرۂ قوم مغل اند. واللہ اعلم بحقیقت حال . . . .

---

۱ تذکرۃ الانساب سادات سکنۂ بیجاپور ، مخطوطہ ملوکہ سید عبد اللطیف پیر قادری ، کرنول

«حاجی دولت مکی کہ اسم ایشان در نسب نامہ حاجی شریف دوام الدین نوشتہ اند، را چہار فرزند بودند. یکی ہیبت خاں، دویم مراتب خاں ، سیوم تیغ جنگ خاں ، چہارم میراں خاں عرف شاہ میراں جی ،»[1]

مجمع الانساب اور تذکرۂ سادات سکنۂ بیجاپور کے مؤلفین متفق ہیں کہ میراں جی شمس العشاق کے والد مکی تھے. اگر وہ مکی تھے تو پھر انہیں مغل کس بنیاد پر قرار دیا جا سکتا ہے؟

متذکرہ بالا تذکروں نے میراں جی کے بھائیوں کے نام ہیبت خاں ، مراتب خاں اور تیغ جنگ خاں بتائے ہیں . واقعہ یہ ہے کہ میراں جی کے خلفا میں ہیبت خاں ، مراتب خاں اور تیغ خاں بھی تھے .[2] امین الدین علی ثانی نے مخزن الامین میں سید محمد بخاری[3] اور امین الدین علی اعلیٰ کے درمیان تکرار سجدہ کا ذکر کرتے ہوئے امین الدین علی اعلیٰ کے مریدوں میں میراں جی ، میٹھے خاں ، مراتب خاں اور دولت خاں بن میٹھے خاں کا بھی ذکر کیا ہے .[4] جس سے شبہ ہوتا ہے کہ مجمع الانساب اور تذکرۃ الانساب سادات سکنۂ بیجاپور نے کہیں غلط فہمی کی وجہ سے میراں جی اور امین الدین علی اعلیٰ کے خلفا اور مریدوں کو بھائی اور عزیز خیال نہ کر لیا ہو .

یہ بھی ممکن ہے کہ میراں جی کی سیادت کا شاخسانہ محض مخاصمت کی بناء پر بعض تنگ نظر مشائخ نے کھڑا کیا ہو، اس لئے کہ بیجاپور میں طریق قادریہ عالیہ کا بول بالا تھا . لیکن میراں جی شمس العشاق اور شاہ برہان الدین جانم کی قدآور شخصیتوں کی وجہ سے طریق چشتیہ کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور شاہ امین الدین علی اعلیٰ کے عہد میں یہ مقبولیت انتہائے عروج کو پہنچ گئی . صاحب انوار الاخیار نے شاہ امین الدین علی اعلیٰ کے مریدوں کی تعداد ایک لاکھ بتائی ہے

۱　سید محی الدین قادری ، مجمع الانساب ، مخطوطہ کتب خانۂ گچی محل ، بیجاپور

۲　سید محمد قادری ، شجرۂ خلفائیہ قلمی ، کتب خانۂ گچی محل ، بیجاپور. ہیبت خاں کا مزار مسجد شاہیہ (قریب قادری محل) بیجاپور میں واقع ہے .

۳　بیجاپور کے نامور مشائخوں میں سے تھے . اجداد کا وطن بخارا تھا جو پہلے گجرات اور پھر بیجاپور چلے آئے . وہ جامع کمالات صوری و معنوی تھے اور شرع کا بڑا پاس رکھتے تھے . شہر کے اکثر امراء ان کے معتقد تھے . دربار رس تھے اور بادشاہان وقت بھی ان کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے . ۱۰۹۷ میں انتقال کیا اور علی باغ میں دفن ہوئے .　　(روضۃ الاولیا ، محبوب ذی المنن)

۴　سید امین الدین علی ثانی ، مخزن الامین ، مخطوطہ ۲۲۷ ، تصوف ، کتب خانۂ آصفیہ ، حیدرآباد

جن سے ان کے خلقۂ اثر کی وسعت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے سلوک کا جو نیا نظام پیش کیا تھا وہ عوام اور خواص دونوں کے دلوں میں گھر کر گیا تھا اور طریق قادریہ کے پیرو بھی اس سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہے تھے۔ یہ صورت حال بعض متأخرین مشائخ قادریہ کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ اس لئے وہ حضرت امین کو متہم کرنے اور ان کی تعلیمات کو غیر اسلامی قرار دینے لگے تھے تاکہ ان کا کھویا ہوا خاندانی وقار بحال ہو سکے۔ اس ذہنی کرب کا اندازہ سید شاہ کریم اللہ قادری (سالگندہ) کے ایک خط کے اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے:

«ہمہ سکان و قطان بیجا پور بر فضیلت خواجہ امین الدین علیہ الرحمۃ متفق بلکہ ہمہ اہل دکن قاطبۃً... بر بزرگیٔ اوشان مقرر و معترف تا بہ حدی کہ بعض جہال مشایخ قادریہ از متأخرین مقلد اوشان شدہ قائل عناصر خمسہ گشتند۔»[1]

انہیں سید شاہ کریم اللہ قادری کے مرید شاہ محمد صادق قادری مشربی نے اپنی ایک مثنوی میں نہ صرف حضرت امین کی ہجو کی ہے اور ان کی تعلیمات کا مذاق اڑایا ہے بلکہ ان کے خلاف الحاد کا فتویٰ بھی صادر کیا ہے:

... کتے ملحداں فریق امیں کئے اس تن کوں واجب وہ سارے کمیں
نہ واجب کے معنی کی ان کو خبر نہ ممکن کے معنی کو بوجھے وہ خر
کہے پانچ عناصر وو پچیس گن نہ منظور عارف کنے یہ سخن
نہیں پانچ عناصر وو ہیں پانچ بھوت کے جن سیتے جاکر کئے وہ ثبوت
اتھا مرد مجذوب مطلق امیں نہ مجذوب سے پائے کوئی راہ دیں[2]

مشربی کی اس دریدہ دہنی کو ان کے پیر سید شاہ کریم اللہ قادری نے «رد بلیغ» سے تعبیر کر کے اپنی مہر توثیق لگا دی ہے جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ بعض مشائخ قادریہ حضرت امین اور ان کی تعلیمات کی مخالفت میں ذہنی گراوٹ کی کس سطح تک پہنچ گئے تھے۔ اس لئے اگر انہیں گوشوں سے سیادت کا شاخسانہ کھڑا کیا جاتا ہے تو ہمیں کوئی تعجب نہیں ہونا چاہئے۔

حاجی دولت مکی کے بارے میں سید شاہ مرتضیٰ قادری سجادہ نشین گچی محل کا بیان ہے:

---

۱ سید شاہ کریم اللہ قادری، مکتوب بنام سید عبدالرزاق قادری، کتب خانۂ گچی محل، بیجاپور

۲ محمد صادق قادری مشربی، مثنوی، مخطوطہ، کتب خانۂ گچی محل، بیجاپور

«حاجی دولت مکی وہی بزرگ ہیں جن کا ذکر روضۃ الاولیاء میں حاجی رومی کے باب میں حاجی مکی[1] کے نام سے آیا ہے۔ ان کا مزار تکوٹہ میں ہے جو بیجاپور کے مغرب میں کم و بیش پانچ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ حاجی مکی کا عرس زمانہ قدیم سے سجادہ نشین درگاہ امین الدین علی اعلیٰ کیا کرتے ہیں۔»

حضرت امین الدین علی اعلیٰ کے موجودہ سجادے سید امام جعفر حسینی سے اس سلسلے میں توثیق چاہی گئی تو انھوں نے بتایا کہ انھیں اس کا علم نہیں ہے کہ حاجی مکی کون تھے اور ان سے میراں جی شمس العشاق یا امین الدین علی اعلیٰ کا کیا رشتہ تھا۔ البتہ یہ درست ہے کہ حاجی مکی کا عرس زمانۂ قدیم سے سجادہ درگاہ امین الدین علی اعلیٰ ہی انجام دیتے رہے ہیں۔

تذکروں نے کہیں صراحتاً اور کہیں اشارۃً میراں جی کا مقام پیدایش بیجاپور بتایا ہے۔

عبد الجبار خاں ملکاپوری نے میراں جی اور میراں جی شمس العشاق کو دو علاحدہ شخصیتیں سمجھ کر محبوب ذی المنن میں ان کا ذکر دو جگہ کیا ہے۔ میراں جی بیجاپوری کے عنوان کے تحت صفحہ ۸۳۶ پر اور شاہ میراں جی شمس العشاق کے عنوان کے تحت صفحہ ۹۹۱ پر۔ میراں جی بیجاپوری کے ضمن میں مقام پیدایش کے تعلق سے صاحب مکاشفہ کا وہی مبہم بیان دہرایا ہے جو مشکوٰۃ، روضۃ الاولیاء، تذکرۃ القادری، حدیقہ رحمانی اور برکات الاولیاء میں ملتا ہے:

«اوائل میں جب آپ پر محبت الٰہی غالب ہوئی، آپ تمام دنیوی تعلقات سے دست بردار ہوئے اور حرمین شریفین کی زیارت کو روانہ ہوئے۔ مدینۂ منورہ میں چند مدت تک گوشہ نشین رہے۔»[2]

البتہ میراں جی شمس العشاق چشتی کی سرخی کے تحت صاف لکھا ہے کہ

«آپ کا مولد و منشاء بیجاپور ہے۔ آپ نشوو نما و شعور کے بعد شہر میں علماء و فضلا کی خدمت میں علوم ظاہری سے فارغ ہوئے اور دل میں محبت الٰہی کا شوق پیدا ہوا۔ بیجاپور سے حرمین شریفین گئے۔»[3]

---

۱ بیجاپور کا ایک خاندان اپنے کو حاجی مکی کی اولاد سے بتاتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ وہ ایک شاخ سے ہے اور حضرت امین دوسری شاخ سے۔ لیکن راقم الحروف کو اس کا کوئی دستاویزی ثبوت نہیں ملا۔

۲ عبد الجبار خان ملکاپوری۔ محبوب ذی المنن، ص ۸۳۵

۳ ایضاً ص ۹۹۲

مولوی عبدالحق کے بیانات مختلف اور متضاد ہیں۔ رسالہ اُردو، اپریل ١٩٢٧ء، میں محبوب ذی المنن کی پیروی کی ہے اور صراحۃً تو نہیں اشارۃً میراں جی کا مقام پیدایش بیجاپور بتایا ہے۔ «اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیاے کرام کا کام» میں اپنی راے بدل دی ہے اور مولد مکۂ معظمہ قرار دیا ہے:

> «آپ مکہ میں پیدا ہوئے اور کچھ دنوں بعد ہندستان آئے ۔ ... چنانچہ وہ خود اپنے حال میں تحریر فرماتے ہیں کہ وہ مکہ سے مدینہ شریف کی زیارت کو گئے اور تقریباً بارہ سال روضہ مبارک کے قریب رہے۔ ایک روز شب جمعہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ہندوستان جانے کے لئے ارشاد فرمایا۔ تو آپ نے نہایت عجز سے یہ عذر کیا کہ میں ہندوستان کی زبان سے ناواقف ہوں۔ آنحضرت نے زبان مبارک سے فرمایا «ہمہ زبان شما معلوم خواہد شد» اور یہی ہوا۔»[1]

یہ بیان میراں جی کی کسی فارسی تحریر سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مولوی عبدالحق نے اس کا حوالہ نہیں دیا۔ راقم الحروف کا قیاس ہے کہ یہ حالات میراں جی کی خودنوشت (جس کا ذکر اگلے صفحات پر آئے گا) سے اخذ کئے گئے ہیں۔ لیکن حیرت ہوتی ہے کہ انھوں نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ «یہ امر تحقیق طلب ہے کہ یہ تحریر خود انھیں کی ہے۔ اس میں مجھے شبہ ہے۔»[2]

رسالۂ اردو، اکتوبر ١٩٣٩ء، میں مولوی عبدالحق نے اپنی رائے پر مزید نظر ثانی کرنے کے بعد میراں جی کو گجرات کا باشندہ بتایا ہے۔ لیکن اس موقع پر بھی انھوں نے نہ تو ماخذ کا حوالہ دیا ہے اور نہ رائے کی تبدیلی کے اسباب بتائے ہیں۔

پروفیسر سروری مولوی عبدالحق کے اس بیان سے اتفاق کرتے ہیں۔ جو «اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیاے کرام کا کام» میں ملتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر زور کا خیال ہے:

> «دکنی علماء کی صحبت میں تحصیل علم کرکے ملک عرب کے سفر

---

١ مولوی عبدالحق، اردو کی نشو و نما میں صوفیاے کرام کا کام، ص ٨٩

٢ مولوی عبدالحق، مکتوبات عبدالحق، مرتبہ جلیل قدوائی، مکتوب بنام سخاوت مرزا صاحب، ص ٦٢٨

٣ پروفیسر عبدالقادر سروری، اردو مثنوی کا ارتقاء ص ٣٠

روانہ ہوئے ۔ »[1]

اور خودنوشت کا تعارف[2] کرانے کے باوجود دکنی ادب کی تاریخ[3] میں اپنی اس رائے پر قائم ہیں ۔

ڈاکٹر نذیر احمد بھی اسی خیال کے حامی ہیں :

« بہرحال شمس العشاق کے متعلق اتنی بات مسلم ہے کہ علوم متداولہ کی تکمیل . . . کے بعد زیارت حرمین کو گئے ۔ »[4]

لیکن کسی نے خودنوشت کی تردید کی ہے نہ تائید. بلکہ واقعہ یہ ہے کہ کسی نے اس کو موضوع بحث بنایا ہی نہیں ہے. صرف مولوی عبدالحق نے اس پر شبہ کا اظہار کیا ہے ۔[5]

خودنوشت سے میراں جی کے وطن ، خاندان اور ورود ہند کے بارے میں نئی معلومات حاصل ہوتی ہیں. اس لئے اس کا پورا متن نقل کیا جاتا ہے :

بیتنا فی المحلة القریشیة عند بیت صحابة[6] کرام ابوبکر[7] بن قحافة ابن مبارک مکة[8] جاءنا فی[9] الهند. انسبت من قوم چغطیه. از قوم چغطیه نسبت کرده باز به مکه معظمه رفته. در مکه تولدم[10] شد. (و)[11] اسمنا امیرالدین نهادند المعروف شاه[12] میراں جی (و)[13] بعد از بست و دو سال یک طرفه حال پیدا شد. از مکه معظمه به زیارت مدینه شریف مشرف شدم. مدت دوازده سال و سه ماه و پنج روز به درگاه قبلهٔ کونین سید الانبیاء والمرسلین به یک پهلو افتاده در شب جمعه حضرت سید المرسلین (و)[14] با صحابه کرام قدوم سعادت ابد (کذا) بر این فقیر آوردند (و)[15] پابوس شدم دست مبارک بر سر[16] نهادند. الحمد لله به مراد رسیدم. چناں چه (کذا) سرفراز کردنی بود سرفراز[17] و مرحمت و عنایت رحمت (کذا) عطا شد (و)[18] سید الانبیا دست این

---

۱ ڈاکٹر زور ، اردو شہ پارے ، ص ۱۵

۲ ڈاکٹر زور ، تذکرۂ مخطوطات ادارۂ ادبیات اردو ، جلد چہارم ، ص ۲۱۶

۳ ڈاکٹر زور دکنی ادب کی تاریخ ، ص ۲۲

۴ علی گڑھ ، تاریخ ادب اردو ، ص ۲۰۹

۵ مولوی عبدالحق ، مکتوبات عبدالحق ، ص ۴۶۳

۶ صحابة الکرام ۷ ابی بکر ۸ بمکة ۹ من ۱۰ تولد شدم (ن ، آصفیه ، ۱۹۶ فلسفه

۱۱ آصفیه : ندارد ۱۲ آصفیه : ندارد ۱۳ آصفیه : ندارد ۱۴ آصفیه : ندارد ۱۵ آصفیه : ندارد

۱۶ آصفیه : سرم ۱۷ سرفراز کردند ۱۸ آصفیه : ندارد

فقیر گرفته بدست حضرت علی کرم الله وجهه سپردند. از[1] حضرت اسد الله الغالب نعمت بیکران عطا یافتم. من بعد حکم مصطفی و مرتضی به این فقیر صادر شد که به ہند بروند. نهایت عذر (و)[2] عجز آوردم که زبان ہند گوناگون فهمی نمی دارم (و)[3] به زبان مبارک فرمودند ہمه زبان بشما معلوم خواہد شد و ملاقات شاه کمال الدین بیابانی بگیرند (و)[4] ہرچه فرمایند قبول کنند. بر حکم معالی[5] به ہند آمده ام[6] و در خدمت شاه کمال الدین رسیدم (و)[7] چند ایام سعادت انجام خدمت کردم. از سر زمین ہند و از زبان ہندی واقف شدم. پیر این فقیر رخصت فرموده حکم کدخدائی کردند و به زبان مبارک فرمودند که ای امیر میراں، از شما بسیار عالم بهره خواہند یافت. بر حکم پیر این فقیر در بهنگار کدخدائی کرده. چند روز مانده، در خدمت پیر آمدم. فرمودند که حکم نبی علیه الصلوات والسلام شده است که به بیجاپور بروند و جائیکه اشارة نبی الله شود در این جا مستقیم و ساکن باشند. بر حکم پیر فقیر در عهد علی عادل شاه آمد به استعانت اشاره ساکن و مستقیم (و ساکن)[8] شدم. الحمد لله علی ذالک. تمت تمام شد.[9]

اس خودنوشت سے جو باتیں معلوم ہوتی ہیں وہ یہ ہیں:

۱ ـ میراں جی سادات زیدی سے تھے۔

۲ ـ ان کا نام امیر الدین عرف میراں جی تھا۔

۳ ـ ان کے والد کا نام حاجی شریف دوام الدین تھا اور وہ مکی تھے۔ ان کی والدہ ایک ایسے چغطائی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں جو ہندوستان میں اقامت گزین تھا۔

---

۱ آصفیه: متن ندارد ۲ آصفیه: ندارد ۳ آصفیه: ندارد

۴ آصفیه: ندارد ۵ آصفیه: معلی ۶ آصفیه: آمدم ۷ آصقیه: ندارد ۸ آصفیه: ندارد

۹ میراں شمس العشاق، خود نوشت، مخطوطه ۸۶۳، ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد. ڈاکٹر زور نے خود نوشت کے بارے میں لکھا ہے «خط ثلث میں قدیم کاغذ پر سنه ۱۰۰۰ ھ سے قبل کی کتابت معلوم ہوتی ہے۔» لیکن راقم الحروف کا خیال ہے که یه ۱۱۱۹ ھ کے بعد کی کتابت ہے. اس لئے که خود نوشت کے خاتمے پر جو نسل نامه درج ہے اس میں سید علی پیر کا نام بھی ہے اور سید علی پیر کا سنۂ جلوس ۱۱۱۹ ھ ہے۔ حسب ذیل قطعه سے تاریخ برآمد ہوتی ہے:

آن ... مسند نشین کائنات دستگیر عالم قدسی صفات
چون در آمد بر سریر سروری در جلوس آمد بفقرا «دید ذات»
۱۱۱۹ ھ

۴ ۔ حاجی شریف دوام الدین شادی کی غرض سے ہندوستان آئے اور چغطائی خاندان میں بیاہ کرکے وطن لوٹ گئے۔

۵ ۔ ان کا آبائی مکان ابوبکر قحافہ کے گھر کے برابر محلہ قریشیہ میں واقع تھا۔

۶ ۔ میراں جی اپنے آبائی مکان میں پیدا ہوئے اور بائیس سال کی عمر تک مکہ معظمہ ہی میں مقیم رہے جس کے بعد مدینہ منورہ روانہ ہوئے۔

۷ ۔ بارگاہ قبلۂ کونین میں بارہ سال تین ماہ پانچ دن گزارنے کے بعد حکم رسول کی متابعت میں شاہ کمال الدین بیابانی سے اکتساب فیض کے لئے ہندوستان روانہ ہوئے۔ (اس وقت ان کی عمر ۳۴ سال سے کچھ اوپر ہوگی)۔

۸ ۔ ہندوستان پہنچ کر وہ (غالباً گلبرگہ میں) شاہ کمال الدین بیابانی سے ملے، ان سے بیعت ہوے اور سرزمین ہند اور زبان ہندی سے واقفیت بہم پہنچائی۔

۹ ۔ تربیت کی تکمیل کے بعد بھنگار (احمدنگر) گئے اور شادی کی۔

۱۰ ۔ کچھ عرصہ بھنگار میں گزارنے کے بعد دوبارہ پیر کی خدمت میں حاضر ہوے۔ پیر نے بتایا کہ ان کے متعلق حکم نبی ہوا ہے کہ بیجاپور جائیں اور جہاں اشارہ ہو اقامت کریں۔

۱۱ ۔ میراں جی بالآخر علی عادل شاہ (اول) کے عہد میں بیجاپور پہنچے۔

خودنوشت میں نہ تو اس مقام کا ذکر ہے جہاں شاہ کمال الدین بیابانی سے میراں جی کی ملاقات ہوئی اور نہ یہ بتایا گیا ہے کہ انھوں نے اپنے پیر کے ساتھ کتنی مدت گزاری، بھنگار میں کتنے سال قیام کیا اور بھنگار سے لوٹ کر پیر کی خدمت میں کتنی مدت بسر کی۔ تاہم قرینہ اس کا ہے کہ شاہ کمال الدین بیابانی سے ان کی ملاقات گلبرگہ میں ہوئی اور انھوں نے اپنے پیر کے ساتھ ایک طویل مدت گزاری۔

شجرۃ الاتقیا[1] وہ قدیم ترین ماخذ ہے جس سے میراں جی کی زندگی کے بعض گوشوں پر روشنی پڑتی ہے، لیکن اس سے بھی میراں جی کی پیدایش، ان کی

---

۱ سید محمد حسینی معظم قادر لنگا کے مرید، امین الدین علی اعلی کے تربیت یافتہ اور کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ انھوں نے بابا شاہ حسینی اور سید علی پیر کا زمانہ بھی دیکھا ہے۔ شجرۃ الاتقیا میں انھوں نے میراں جی، برہان الدین جانم، امین الدین علی اعلی، بابا شاہ حسینی اور سید علی پیر کے حالات قلمبند کئے ہیں۔

زندگی کے ابتدائی دور، اجداد اور وطن کے بارے میں کوئی معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔

شجرۃ الاتقیا میں میراں‌جی کے حالات کا آغاز مدینۂ منورہ میں ان کے قیام سے ہوتا ہے:

سنا ہوں روایت مجھے یاد ہے اسی بات سوں دل مرا شاد ہے
کتے ایک حاجی مدینہ بھتر سوتے تھے او سر رکھ کے سیڑی اوپر[1]

وہ حرم نبوی کی سیڑھیوں پر بارہ برس[2] تک مقیم رہے۔ پاس ادب کا یہ حال تھا کہ اس پورے عرصہ میں ایک ہی پہلو پر سوتے تھے جس کی وجہ سے جسم کے ایک حصہ کو دیمک چاٹ گئی تھی۔ بالآخر رسول اللہ صلعم ایک رات خواب میں تشریف لائے۔ ان کے ساتھ صحابۂ کرام بھی تھے اور میراں‌جی سے پوچھا کہ اے میرے دوست، تیری کیا آرزو ہے؟ میراں‌جی نے عرض کیا:

مرے دل میں یہ شوق آنا اتال جو ظاہر دسے مجھ تمھارا جمال[3]
تب: نبی رحم کرکے کہے یا علی کرو ان کو بیعت خدا کے ولی
نبی کے امر سوں یو بیعت کئے خلافت کی اس ٹھار خلعت دئے
نبی نے کہے اب تو پایا شرف ولے جا اتا تو بیجاپور طرف
بیجاپور میں اک شہر شاہ پور ہے میرے نور سوں سب او معمور ہے
وہاں ٹیک دستا ہے یک دورسوں چمکتا ہے روشن مرے نور سوں
اوسی ٹھار ظاہر ملوں‌گا تجے ولے کیوں سمج تو سکے‌گا مجے
وہاں لوگ کہتے ہیں مجھ شہ کمال[4] اتا یاد رکھ خوب میرا جمال

میراں‌جی خوش‌خوش دکن کی طرف روانہ ہوئے اور بیجاپور[5] میں شاہ کمال

---

۱ شاہ معظم، شجرۃ الاتقیا، مخطوطہ ۱۳۱ تصوف، کتب خانۂ سالار جنگ، حیدر اباد

۲ سید علی پیر نے چندیں سال، (سراج المشاق) اور حالی نے شش سال، (مثنوی حالی) لکھا ہے۔

۳ شاہ معظم، شجرۃ الاتقیا، مخطوطہ ۱۳۱ تصوف، کتب خانۂ سالار جنگ، حیدر آباد

۴ مخطوطہ میں جمال ہے۔

۵ معظم کے بیان کے مطابق جمال الدین مغربی نے حضرت بندہ نواز سے بیعت و خلافت دکن میں حاصل کی اور اس کے بعد پیر کے حکم کے مطابق تبلیغ و تلقین کے لئے روانہ ہوئے۔ اس سیاحت میں ان کی ملاقات کمال الدین بیابانی سے ہوئی اور وہ مغربی کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگئے۔ پیر و مرید دونوں نے عرب اور عجم کے ایک ایک ملک اور ایک ایک شہر کی خاک چھانی اور امر رسول و پیغام بندہ نواز کو لوگوں تک پہنچایا اس طویل سفر کے بعد جب وہ لوٹے ہیں تو بندہ نواز کا وصال ہوچکا تھا جمال الدین مغربی کے لئے یہ سانحہ نا قابل برداشت تھا۔ انہوں نے شاہ کمال الدین بیابانی کو وصیت کی کہ بیجا پور جائیں اور وہاں بندہ نواز کی تعلیمات کو عام کریں اور انتقال فرمایا۔ شاہ کمال الدین پیر کے حکم کی تعمیل میں بیجا پور چلے آئے اور تلقین و ہدایت میں مصروف ہوگئے (شجرۃ الاتقیا) لیکن یہ بیان درست نہیں معلوم ہوتا۔

الدین بیابانی کو دیکھتے ہی پہچان لیا. شاہ کمـــال نے میراں جی کو اسی دن تمام منازل طے کرائیے ، خلافت سے سرفراز کیا ،شمس العشاق کا لقب عطا کیا اور کہا کہ اب شادی کرلو. تمہارے کئی اولاد ہوگی اور ان سے تمہارا سلسلہ چلے گا. یہ بشارت بھی دی کہ شادی کے فوراً بعد ایک لڑکا ہوگا جس کا نام لوح محفوظ پر برہان لکھا ہے . وہ عارف وکامل ہوگا اور خاص و عام اس کی پرستش کریں گے . ہم نے تمہاری بڑی راہ دیکھی ، اب بس تمہاری اولاد کو دیکھنے کی آرزو رہ گئی ہے . اسی دن شاہ کمال الدین بیابانی بیجاپور سے روانہ ہوگئے :

یو جس روز آکر میراں جی ملے   اوسی روز فاتحہ پڑے اور چلے (کذا)
ترک کرکے صحبت سو انسان کا   لئے رخ جنگل ہور بیابان کا
میراں‌جی کو حق وانچہ روشن کیا   اوسی ٹینک کو حق نے گلشن کیا
وہی ٹینک پھر جب ہوا ہے نشر   اوسی ٹھـــار آکر بسا ہے شہر[1]

سید علی پیر ابن باباشاہ حسینی کی مثنوی سراج عشق اور ان کے مرید حالی کی مثنوی سے بھی میراں‌جی کے بارے میں کچھ اشارے ملتے ہیں.

خود نوشت میں لکھا ہے کہ رسول اکرم صلعم نے جب میراں‌جی کو ہندوستان جانے کا حکم دیا تو انھوں نے ہندوستان کی زبانوں سے ناواقفیت کا عذر کیا. رسول اکرم صلعـــم نے فرمایا کہ تم کو سب زبانیں آ جائیں گی. لیکن سید علی پیر کے بیان کی بموجب عذر کچھ اور تھا :

کہ این‌ہا عذر کردند مصطفی را   ترا معلـوم ہست احوال ما را
حمل برداشتن طـاقت نـدارم   کہ حکـم تو شود دم بر نیـارم[2]

شاہ معظم کا بیان ہے کہ میراں‌جی کی ملاقات شاہ کمـال الدین بیابانی سے بیجاپور میں نہیں بلکہ شاہ‌پور میں ہوئی. لیکن سید علی پیر کا بیان ہے کہ میراں جی پہلے شاہ کمال الدین بیابانی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پھر وہاں سے شاہ‌پور آئے:

بہ نزد شـہ کمال الدین رسیدہ   کہ نعمت ظاہری از وے چشیدہ
از آن جا آمدہ آن شاہ شہ پور   ظہوری شد ہمون بو و ہمون نور[3]

---

۱ سید محمد حسینی معظم ، مخطوطہ ۱۲۱ تصوف ، کتب خانۂ سالار جنگ ، حیدر آباد

۲ سید علی پیر ، سراج العشق ، مخطوطہ ۹۰ کتب خانۂ سالار جنگ ، حیدر آباد
سراج العشق کا دوسرا نسخہ کتب خانۂ آصفیہ میں اور تیسرا کتب خانہ درگاہ شریف میں محفوظ ہے .

۳ سید علی پیر ، سراج عشق ، ۹۰ تصوف ، کتب خانہ سالار جنگ حیدر آباد

حالی نے کمال الدین بیابانی سے ملاقات کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے بلکہ صرف یہ لکھا ہے کہ رسول اکرم کی ہدایت کے بموجب حضرت علی نے میراں جی کو تلقین کرنے کے بعد کہا کہ اے شاہ دکن ، دکن میں ایک جگہ شاہ پور ہے جو طور سے زیادہ عالی مرتبہ ہے ۔ وہاں جاؤ اور اقامت کرو تاکہ دنیا تم سے فیض اٹھائے۔[1]

صاحب مشکواۃ النبوۃ نے مکاشفہ اور انوار الاخبار کے حوالے سے لکھا ہے :

«حضرت ایشان چون طلب الٰہی غالب شد از ہمہ قطع تعلق نمودہ بہ زیارت حرم شریف رفتند و از آنجا بہ روضۂ منورہ آنحضرت علیہ السلام آمدہ چندی آنجا معتکف بودند ۔ بعد از آن شیخ حرم در رویا نمودند کہ آنحضرت علیہ السلام می فرمایند کہ میراں جی را علمی[2] از سلح خانۂ ما دہ و حضرت ایشان را در معاملہ صادقہ فرمودند : ای فرزند ، علم از شیخ الحرم گرفتہ متوجہ بہ طرف دکن (روانہ) شو کہ نعمت تو در آنجا مقسوم یافتہ و بہ جائی کہ این علم بر زمین آید زمین جای سکونت و مدفن تو است ۔ پس علی الصباح حضرت ایشان بہ شیخ ملاقی شدہ علم غالب را گرفتہ بہ طرف دکن راہی شدند ۔ الغرض شاہ میراں جی شمس العشاق از مدینۂ منورہ بہ دکن آمدہ بخدمت شاہ کمال الدین بیابانی مرید شاہ جمال مغربی کہ بہ یک واسطہ خلیفۂ کمل سید محمد حسین گیسو دراز بودند دست بیعت دادہ خرقۂ خلافت از شاہ موصوف یافتند ۔ . . . . »

«الغرض چون حضرت میراں جی در شہر بیجاپور تشریف آوردند در جای قبر ایشان واقع است آنجا علم مذکور بر زمین آمد و بوی رسالت علیہ السلام کہ دلیل صحت آثار شریف است در شہر بیجاپور دریافت ، رخصت اقامت آنجا نمود ۔ »[3]

۱　حالی ، مثنوی حالی ، مخطوطہ ۱۲۹ ، کتب خانہ درگاہ شریف ، بیجاپور

۲　درگاہ شاہ معین الدین علی اعلیٰ میں ایک علم رکھا ہوا ہے کہا جاتا ہے کہ یہی وہ علم ہے جس کو لے کر میراں جی مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے تھے ۔

۳　شاہ غلام علی ، مشکواۃ النبوۃ ، مخطوطہ ۱۹۴ ، کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد ۔ تذکرۃ القادری اور حدیقہ رحمانی میں مشکواۃ ہی کے بیان دہرائے گئے ہیں البتہ تذکرۃ القادری میں لکھا ہے کہ « بخدمت شاہ جمال الدین دست بیعت دادہ خرقہ خلافت از شاہ موصوف یافتہ ۔ در شجرۂ خواجہ چشت نوشتہ کہ میراں جی صاحب شمس العشاق مرید و خلیفہ شاہ کمال الدین بیابانی است کہ مرید و خلیفہ شاہ جمال الدین مغربی بود » ۔ محبوب ذی المنن میں « میراں جی بیجاپوری کے عنوان سے مشکواۃ سے حالات اخذ کئے گئے ہیں ۔ [باقی ص ۱۸ پر]

روضة الاولیا کا بیان ہے :

« حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق قدس سرہ . خدمت عالیش مقتدای اہل عرفان و سر آمد عرفای دوران و از مشاہیر کمل و شیوخ بلدۂ بیجاپور بودہ اند . از سعادت حج کعبة اللہ و زیارت روضۂ منورہ شرف اندوز گشتہ مدت دراز در آنجا اقامت می داشت . گویند مدت دوازدہ سال ملازم آستانۂ نبوی بر یک پہلو میخسپید و بہ اشارۂ جناب رسالت مآب صلوات اللہ علیہ رخت اقامت از آنجای محترم برچیدہ رخ عزیمت بہ طرف دکن آورد . در اوائل عہد علی عادل شاہ بزرگ بیرون شہر پناہ بیجاپور قدوم کرامت ارزانی فرمود و از خدمت شیخ الکمل خواجہ کمال الدین بیابانی کہ بہ یک واسطہ از خلفای حضرت بندہ نواز شہباز بلند پرواز خواجہ سید محمد حسینی گیسو دراز قدس اللہ سرہ است و ارادت و نعمت خلافت چشتیہ حاصل نمودہ بہ تکمیل و رہنمائیء طالبان اشتغال می کرد . »[1]

صاحب انوار الاخیار اور صاحب مشکواۃ متفق ہیں کہ میراں جی پر جذب کی کیفیت غالب رہتی تھی اور وہ کبھی کبھی حالت سلوک میں ہوتے تھے :

« حضرت شمس الدین عشاق احوال جذب غالب داشتند از مجانین مکمل بودند . . . حالت سلوک کم بود . »[2]

لیکن اس کے باوجود ان سے دکن کی سرزمین پر بڑا فیض پہنچا .

خود نوشت میں لکھا ہے :

« بیتنا فی المحلة القریشیة عند بیت الصحابة الکرام ابی بکر بن

[بقیۂ ص ۱۷]

لیکن تذکرۃ القادری کی طرح بیعت و خلافت جمال الدین مغربی سے منسوب کی ہے اور شاہ میراں جی شمس العشاق چشتی کے عنوان کے تحت روضة الاولیا کے بیانات جزوی اختلاف کے ساتھ لکھے گئے ہیں . برکات الاولیا نے شاہ کمال الدین سے بیعت و خلافت کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ « کہتے ہیں کہ آپ نے شاہ جمال مغربی خلیفہ سید محمد گیسودراز سے بھی فیض چشتیہ و خرقۂ خلافت پایا ہے (ص ۱۱۵) شاہ حسن قادری صاحب کے مملوکہ طویل شجرے میں جمال الدین مغربی کے دو خلفا کے نام ہیں سید راجی اور شاہ کمال الدین بیابانی . میراں جی اور ان کے سلسلے کے بزرگوں کے نام سید راجی اور شاہ کمال الدین بیابانی دونوں ناموں کے تحت دئے گئے ہیں .

[نوٹ : ص ۱۸]

۱ محمد ابراہیم زبیری روضة الاولیا ، مخطوطہ ۲۶۶ ، کتب خانہ آصفیہ ، حیدر آباد

۲ انوار اللہ ، انوار الاخیار ، مخطوطہ مملوکہ راقم الحروف

قحافة بن مبارک بمکة جاءنا من الهند النسبة هذا قوم چغطیة . . .»[1]
یعنی خود نوشت کے بموجب خود میراں جی کا بیان ہے کہ ان کی ماں قوم چغطیہ سے تعلق رکھتی تھیں۔

میراں جی کی ایک مثنوی خوش نامہ ہے۔ اس نظم میں ایک نوجوان بھولی بھالی لڑکی خوش یا خوشنودی کا قصہ بیان کیا گیا ہے جو اپنی ہم‌عمر دوسری لڑکیوں کے برخلاف بناؤ سنگھار اور شوخی و شرارت سے دور عشق الٰہی کے جذبے سے سرشار تھی۔ اسے اپنے پیر سے بےپناہ پیار تھا اور وہ ہر وقت ان کی خدمت میں لگی رہتی تھی۔ اس لئے کہ وہ انھیں کی ذات کو وسیلۂ نجات جانتی تھی۔ اس لڑکی کا شاہ پور میں سترہ سال ایک مہینہ اور نو دن کی عمر میں انتقال ہوا۔[2]

میراں جی نے اس لڑکی کا بڑے پیار سے ذکر کیا ہے۔ اس بیان میں خود ان کے دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ خوش صرف ان کی محبوب مرید ہی نہیں تھی بلکہ کوئی اور رشتہ بھی رکھتی تھی۔ اس سلسلے میں عبدالحق نے بڑے پتے کی بات کہی ہے:

«اس نظم کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خوش یا خوشنودی
یا تو ایک فرضی لڑکی ہے یا حضرت کی کوئی عزیز یا بیٹی ہے۔»[3]

یہ حضرت کی بیٹی نہیں، سالی تھیں اور حضرت کے گنبد ہی میں دفن ہیں۔

راقم الحروف کو درگاہ شریف کے کتب خانے سے ایک پرانے کاغذ کا پرزہ دستیاب ہوا ہے۔ یہ کاغذ اگر پورا دستیاب ہوتا تو حضرت کے خاندان کے بارے میں کچھ نئی معلومات حاصل ہوتیں، اس لئے کہ اس پر احاطۂ درگاہ کی قبروں کی تفصیل درج تھی۔ تاہم جو پرزہ راقم الحروف کو ملا ہے اس سے یہ معلوم ہو سکا ہے کہ آپ کے گنبد میں کون کون دفن ہیں:

یاد داشت قبورہای اندرون درگاہ شریف در گنبد خورد تربت

میراں جی شمس العشاق	برہان الدین جانم قطب الاقطاب
اہلیۂ ایشان رابعہ مانصاحبہ اندرون	اہلیۂ ایشان[4] اسم شریف و بی بی مانصاحبہ

---

۱ میراں جی شمس العشاق، خودنوشت و نسل نامہ
۲ مولوی عبد الحق، شاہ میراں جی شمس العشاق، اردو، اپریل سنہ ۱۹۲۷ع، ص ۱۷۳ تا ۱۸۲
۳ ایضاً ۱۷۴
۴ انوار الاخیار اور تذکرۃالقادری کا یہ بیان درست نہیں کہ برہان الدین جانم کی اہلیہ بھی اس مقبرے میں دفن ہیں۔ ان کی قبر مقبرہ کے باہر علاحدہ چوکھنڈی میں ہے جس میں مردوں کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔

گنبد موصوف و نیز تربت ہمشیرۂ ماں بیرون گنبد شریف زیر گنبد چوکھنڈی صاحبہ موصوف اند. اسم ایشان خوش است
بی مانصاحبہ است

یہی خوش بی مانصاحبہ ہیں جن کا ذکر بڑے ماں کے نام سے میراں جی نے خوش نامے میں کیا ہے:

لاڑوں لاڑ چاؤں چاؤ سب گوتوں کی پیاری
ست سنبھالے عین جھوالے محبت کی ہماری[1]

اور ان سب کا نسب اس طرح بیان کیا ہے:

ذات ماں کی چغطا جانو باپ ترک افشاق
خوشی کی ذات علوی جانوں جس تھے نام رزاق[2]

خوش بی ماں صاحبہ کے ماں باپ میراں‌جی کے ساس اور سسر ہوئے. اس طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ میراں‌جی کی ننھیال کی طرح سسرال بھی قوم چغطیہ سے تعلق رکھتی تھی. بہت ممکن ہے کہ انہوں نے اپنی ننھیال ہی میں شادی کی ہو.

تذکرۃ الانساب سادات بیجاپور اور مجمع الانساب دونوں میراں‌جی کے والد کو مکی لکھتے ہیں اور نسب نامے اور شجرے متفق ہیں کہ وہ زید مظلوم کی اولاد سے تھے. اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ دودھیال کی طرف سے وہ مکی اور سید تھے لیکن ان کی ننھیال اور سسرال مغل تھی.

میراں‌جی کا سنۂ پیدائش[3] نہیں معلوم اور سنۂ وفات کے بارے میں بھی شدید اختلاف ہے. محبوب ذی المنن میں ایک جگہ ۲۵ شوال سنہ ۹۷۰ھ[4] اور دوسری جگہ ۲۵ شہر شوال تقریباً ۹۱۰ھ[5] لکھا ہے. برکات الاولیا میں ۲۲ ربیع الاول ۱۰۸۰ھ[6] درج ہے. مشکواۃ النبوۃ[7]، تذکرۃ القادری[8] اور حدیقۂ رحمانی[9] میں صرف

---

۱ مولوی عبدالحق، «شاہ میراں جی شمس العشاق» اردو، اپریل ۱۹۲۷ع، ص ۱۷۵
۲ ایضاً ص ۱۷۴
۳ راقم الحروف کو اپنی تحقیقات کے دوران کتب خانہ گچی محل کی ایک بیاض میں ان کا مادہ تاریخ پیدائش «شمس الشموس (۸۳۷ھ) دستیاب ہوا ہے لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا.
۴ عبدالجبار خاں ملکاپوری، محبوب ذی المنن، ص ۸۳۶
۵ ایضاً، ص ۹۹۲
۶ سید امام الدین، برکات الاولیا، ص ۱۱۵
۷ شاہ غلام علی، مشکواۃ النبوۃ، مخطوطہ ۱۹۴ تذکرہ، ورق ۹۵۴، کتب خانۂ آصفیہ، حیدر آباد
۸ منشی قادر خاں، تذکرۃ القادری، مخطوطہ ۱۰۸۶ جدید، کتب خانۂ آصفیہ، حیدر آباد
۹ ثقاف، حدیقۂ رحمانی، ص ۲۸۱، مخطوطہ مملوکہ فرید الدین صاحب حیدر آباد

تاریخ وفات ۲۵ شوال دی گئی ہے، سنہ کا ذکر نہیں ہے۔ روضۃ الاولیا کے ایک نسخے[1] میں نہ تاریخ درج ہے نہ سنہ۔ البتہ دوسرے نسخے[2] میں لکھا ہے کہ «عرس ۲۵ شوال کو ہوتا ہے»۔ تاریخ محمدیہ[3] میں نہ سنہ درج ہے نہ تاریخ۔

مولوی عبد الحق میراں جی کے سنۂ وفات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

تذکرۂ اولیائے دکن میں ان کی تاریخ وفات سنہ ۹۱۰ھ لکھی ہے، مگر یہ صحیح نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ شمس العشاق سے ان کی وفات کی تاریخ نکلتی ہے جو سنہ ۹۰۲ھ ہوتی ہے اور یہ مادۂ تاریخ شاہ حسین ذوقی کا کہا ہوا ہے۔ صاحب روضۃ الاولیائے بیجاپور نے جو اولیاء اللہ کے حالات میں ہے ان کے انتقال کی تاریخ نہیں دی۔ البتہ مجھے ایک پرانا مرثیہ ملا جو کسی نے حضرت میراں جی کی وفات پر لکھا ہے، اس سے ان کی وفات کی تاریخ ۲۵ شوال سنہ ۹۰۲ھ معلوم ہوتی ہے۔ جن اشعار میں تاریخ و سنہ کا ذکر ہے وہ یہ ہیں:

سرور میرا ڈھل گیا کرتار بھایا ان کیا
جو ان کیا میں سر لیا جے کچھ حکم الہی کا
تاریخ حضرت سال نو سو اس پر اگلے بھی دو
دو دین مدت وفا شو جے کچھ حکم الہی کا
اربع سوں یو سال ہے ماہے کوں شوال ہے
رحلت کئے اس حال ہے جو کچھ حکم الہی کا
تاریخ بست و پنج بود بسیار گریا رنج شد
درحال واصل گنج خود جے کچھ حکم الہی کا
شب پنجشنبہ روشن کیا ہجرت منور پور کیا
جیوڑا قبض کر ان لیا جے کچھ خکم الہی کا[4]

برہان الدین جانم کے سنین پیدائش و وفات نہیں ملتے۔ امین الدین علی اعلیٰ[1] کے سن پیدایش کے بارے میں بھی تذکرے خاموش ہیں۔ البتہ ان کا سن وفات

---

۱ محمد ابراہیم زبیری، روضۃ الاولیا، مخطوطہ ۲۶۶ تذکرہ، کتب خانۂ آصفیہ، حیدر آباد

۲ مخطوطہ ۱۹۶ تذکرہ، کتب خانۂ آصفیہ، حیدرآباد

۳ جہاں نما علی شاہ، تاریخ محمدیہ، ص ۲۰۲

۴ مولوی عبد الحق، شاہ میراں جی شمس العشاق، اردو، اپریل ۱۹۲۷ع، ص ۱۷۲

۱۰۸۶/۱۰۸۵ھ بتایا جاتا ہے. اس طرح دادا اور پوتے کی وفات کے درمیان ۱۸۳/۱۸۴ سال فصل ہوا جو قرین قیاس نہیں. غالباً یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر گراہم بیلی کو اس امر کا شبہ ہوا تھا کہ ان کے درمیان ایک آدھ پشت چھوٹ گئی ہے. بیلی کے الفاظ یہ ہیں:

> "The relationship of father, son and grandson said on P. 17 to have existed between No. 5, 6 and 8 (Shah Miranji, Shah Burhan and Ameenuddin A'la) is according to popular report obvious by one or two generations have dropped over." ۱

لیکن یہ محض شبہ ہے. اس لئے کہ تمام تذکرے اور نسب نامے متفق ہیں کہ امین الدین علی اعلیٰ برہان الدین جانم کے اور برہان الدین جانم میراں جی کے بیٹے تھے. نیز معرفۃ السلوک (خوش دہاں)، شجرۃ الاتقیا (معظم)، سراج العشق (سید علی پیر)، مثنوی حالی (حالی)، مجمع العطا (حسین علی شاہ). وصیت ناموں (سید علی پیر و بابا شاہ حسینی) اور اسناد و احکام سے بھی اس کی توثیق ہوتی ہے. یہی وجہ ہے کہ ہم یہ شبہ کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ میراں جی اور امین الدین علی اعلیٰ کے جو سنین وفات دئے جاتے ہیں ان میں سے کوئی ایک غلط ہے. امین الدین علی اعلیٰ کے سنہ وفات پر بحث آگے آئے گی. یہاں میراں جی کے سنہ وفات سے بحث ہے.

ڈاکٹر زور کو بھی میراں جی کے سنہ وفات پر شبہ تھا اس لئے انہوں نے مقدمۂ ارشادنامہ میں اس مسئلہ پر مولوی عبدالحق سے اختلاف کرتے ہوئے بڑی تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے. وہ لکھتے ہیں:

> «انہوں نے (عبدالحق نے) اپنے مضمون مندرجۂ رسالۂ اردو بابت اپریل سنہ ۲۷ع میں ایک نامعلوم شخص کا لکھا ہوا ... مرثیہ درج کیا ہے جس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ میراں جی ہی کی وفات کے متعلق ہے یا کسی اور بزرگ کی.
>
> «مولوی عبدالحق نے ... لکھا ہے کہ 'تذکرۂ اولیا میں ان کی تاریخ وفات سنہ ۹۱۰ھ لکھا ہے مگر یہ صحیح نہیں معلوم ہوتی'. عجیب بات ہے کہ تذکرۂ اولیاے دکن میں کہیں ۹۱۰ھ لکھا ہوا نہیں ملا، بلکہ صفحہ ۸۳۶ پر ہندسوں کے علاوہ الفاظ میں بھی لکھا ہے کہ ۲۵ شوال سنہ ۹۷۰ھ نو سو ستر ہجری میں فوت ہوئے.

---

۱ گراہم بیلی، تاریخ ادب اردو، ص ۹

اس تذکرے کا ایک ہی اڈیشن شائع ہوا ہے اور کسی اختلاف کی بھی گنجائش نہیں ہے۔[1]

«ہمارا خیال ہے کہ ۹۰۲ھ میراں جی کا سنہ وفات نہیں بلکہ سنہ پیدائش ہے اور ان کا سنہ وفات اصل میں سنہ ۹۷۰ھ صحیح جیسا کہ تذکرۂ اولیائے دکن میں درج ہے۔ اس کے اسباب حسب ذیل ہیں:

«۱۔ تمام تذکرے[2] اس امر کے اظہار میں متفق ہیں کہ شاہ میراں جی بیجاپور کو علی عادل شاہ کے عہد میں تشریف لائے۔ علی عادل شاہ ۹۶۵ھ میں تخت نشین ہوا اور ۹۸۸ھ میں فوت۔ اس طرح شاہ میراں جی کا ورود بیجاپور میں ۹۶۵ھ کے بعد ہوا اور انہوں نے یہاں چند ہی سال قیام کیا تھا کہ وفات پائی۔ تذکروں سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ مقیم ہونے کے بعد زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا۔

«۲۔ تمام تذکرے اس امر میں بھی متفق ہیں کہ شاہ صاحب نے عربستان سے واپسی پر قلعۂ بیجاپور کے حصار کے باہر قیام کیا اور یہ قلعہ ۹۱۸ھ میں تعمیر پایا۔ مولوی عبدالحق صاحب نے شاہ صاحب کی تاریخ پیدائش کو تاریخ وفات فرض کرکے قدیم تذکروں کے اس بیان کو کہ علی عادل شاہ کے عہد میں شاہ میراں جی بیجاپور پہنچے غلط بتاکر یہ قرار دیا کہ شاہ صاحب یوسف عادل شاہ کے عہد میں بیجاپور آئے ہوں گے۔ حالانکہ یوسف عادل شاہ ۹۱۵ھ میں انتقال کرچکا تھا اور حصار ۹۱۸ ہجری میں تعمیر پایا ظاہر ہے کہ شاہ صاحب جب حصار بننے کے بعد بیجاپور آئے تو ۹۰۲ھ ان کا سنہ وفات کس طرح قرار پاسکتا ہے۔

---

۱ ڈاکٹر زور کا یہ بیان درست نہیں ہے کہ تذکرۂ اولیائے دکن میں کہیں ۹۱۰ھ لکھا ہوا نہیں ہے۔ اس تذکرہ میں میراں جی کا ذکر میراں جی بجاپوری کے نام کے تحت ص ۸۳۵ تا ۸۳۷ پر اور شاہ میراں جی شمس العشاق چشتی کے عنوان سے ص ۹۹۱ تا ۹۹۳ پر دو جگہ آیا ہے۔ ڈاکٹر زور کے استدلال کی بنیاد اول الذکر بیان پر ہے اور مولوی عبدالحق نے ثانی الذکر سے بحث کی ہے۔

۲ ڈاکٹر زور کا یہ بیان بھی درست نہیں ہے کہ تذکرے اس امر کے اظہار میں متفق ہیں کہ شاہ میراں جی بیجاپور علی عادل شاہ کے عہد میں تشریف لائے۔ انوارالاخیار اور مشکواۃ میں یہ واقعہ درج نہیں ہے۔ البتہ روضۃ الاولیا میں یہ اشارہ ملتا ہے۔ محبوب ذی المنن اور برکات الاولیا کا ماخذ روضۃ الاولیا ہی ہے۔ اس لئے یہ بیان صرف روضۃ الاولیا کا سمجھا جانا چاہئے۔

«۳ ۔ ایک اہم اور قابل غور دلیل ۹۰۲ کے سنۂ وفات کے بجائے سنۂ پیدائش ہونے کی یہ بھی ہے کہ اگر تھوڑی دیر کے لئے اس سنہ کو صحیح مان لیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ شاہ میراں جی کے فرزند شاہ برہان الدین جانم کی وفات سو سال سے زیادہ عمر میں ہوئی۔ خود مولوی عبدالحق صاحب نے رسالۂ اردو بابت جولائی سنہ ۱۹۲۷ ع میں تحریر فرمایا ہے کہ ‹ اُن (شاہ برہان الدین جانم) کا ایک رسالہ ۹۹۰ھ کی تصنیف ہے۔ اور چونکہ یہ سنہ انہوں نے خود اپنی نظم میں لکھ دیا ہے اس لئے شک و شبہ کی گنجایش نہیں رہتی۔ ہمارے خیال میں یہ ان کی آخری تصنیف تھی اور اسی سال میں انتقال فرمایا۔ علاوہ اس کے ان کی ایک نظم نکتۂ واحد کے نیچے ان کی زبانی دو فرمان لکھے ہیں جن میں سے ایک کی تاریخ ۲ ماہ صفر ۹۶۷ھ اور دوسرے کی ماہ صفر ۹۷۷ھ درج ہے۔ اس سے بھی صاف صاف ظاہر ہے کہ وہ ان سنین میں زندہ تھے۔›

«غرض ۹۹۰ھ میں اگر شاہ برہان نے وفات پائی تو گویا اپنے والد کی وفات کے اٹھاسی سال بعد فوت ہوئے اور والد کی وفات کے وقت ان کی عمر بیس سال سے کم نہ ہوگی، کیونکہ تمام تذکروں میں درج ہے کہ وہ اپنے والد کے نہ صرف مرید بلکہ خلیفہ بھی تھے نیز اس عمر کو پہنچ چکے تھے کہ سلوک و عرفان کے مسائل کو بخوبی سمجھتے اور سمجھا سکتے تھے، چنانچہ بعض تذکروں میں یہ واقعہ مندرج ہے کہ

‹ آپ کے (شاہ میراں جی کے) پاس زمانۂ سلوک میں مسافت بعیدہ سے ایک طالب علم آیا اور آپ سے پوچھا خدا کہاں ہے۔ فرمایا: تمہارے پاس ہے اور اس کو کہا یہاں سے جاؤ۔ طالب علم کشیدہ خاطر ہوکر چلتا ہوا۔ آپ کے صاحبزادے شاہ برہان الدین اس بات پر مطلع ہوئے تو فوراً طالب علم کو بلایا اور گھر پر مہمان رکھا۔ پھر اس کو عرفان الٰہی سے آگاہ کیا اور اس سے کہا جو والد ماجد نے فرمایا تھا سچ ہے یا دروغ۔ طالب علم نے اقرار کیا کہ سچ ہے۔›

«اس سے ظاہر ہے کہ شاہ میراں جی کی زندگی میں شاہ برہان کس درجے کو پہنچ چکے تھے۔ لہٰذا والد کی وفات کے وقت شاہ برہان الدین جانم کم ازکم بیس سال کے تو ہونگے اور جب وہ ۹۰۲ھ

میں بیس سال کے تھے تو ۹۹۰ھ میں ایک سو آٹھ سال کے ہوئے اور جس وقت انہوں نے انتقال کیا ان کی بیوی حاملہ تھیں ۔ چنانچہ سب تذکرے متفق ہیں کہ ان کے فرزند شاہ امین الدین اعلیٰ ان کی وفات کے بعد پیدا ہوئے اور چونکہ والد سے کوئی فیض نہیں حاصل کیا تھا اس لئے اپنے چچا خواجہ عطاء اللہ سے بیعت کی ۔

« ایک سو آٹھ سال کی عمر تک زندہ رہنا تو قرین قیاس ہے لیکن توالد و تناسل کا سلسلہ جاری رکھنا سمجھ میں نہیں آتا جب کہ یہ معلوم ہے کہ اس عمر سے پہلے کوئی اولاد نہیں ہوئی ، یعنی شاہ امین الدین اعلیٰ حضرت شاہ برہان الدین جانم کی پہلی اولاد ہیں ۔

« غرض شاہ میراں جی کی تاریخ وفات ۹۰۲ کی جگہ ۹۷۰ ہی ماننی پڑےگی اور لقب شمس العشاق مادۂ تاریخ پیدائش ہونے کی وجہ سے ان کی زندگی ہی میں مشہور ہوا ہوگا جس کو شاہ حسین ذوقی اور ان کی تقلید میں مولوی عبد الحق صاحب نے تاریخ وفات سمجھ لیا ۔ »[1]

سخاوت مرزا نے بھی اس موضوع پر مولوی عبد الحق سے خط و کتابت کی تھی ۔ ان کے اعتراضات کم و بیش وہی ہیں جو ڈاکٹر زور نے مقدمۂ ارشادنامہ میں کئے تھے ۔ البتہ انہوں نے ایک انکشاف یہ کیا ہے کہ ان کے یہاں بساتین السلاطین کا ایک نسخہ ہے جس میں لکھا ہے کہ میراں جی سنہ ۹۶۶ھ میں واردِ بیجاپور ہوئے ۔[2]

مولوی عبد الحق نے ان اعتراضات کے جواب میں اپنے وہی پرانے دلائل دہرائے ہیں جو انہوں نے رسالۂ اردو[3] میں پیش کئے تھے ۔ لیکن آخر میں یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوگئے کہ

---

۱ ڈاکٹر زور ، ارشاد نامہ ، مقدمہ ، ص ۱۹ تا ۲۵

۲ سخاوت مرزا ، مکتوب بنام مولوی عبدالحق ، مکتوبات عبدالحق (مرتبہ : جلیل قدوائی) ص ۴۶۷ ؛ مزید ملاحظہ ہو سخاوت مرزا صاحب کا مضمون ، حضرت میراں جی شمس العشاق کی تاریخ وصال ، مطبوعہ رسالہ اردو نامہ ، کراچی ، بابتہ جنوری ۱۹۶۸ع جس میں وہ لکھتے ہیں کہ بساتین السلاطین مؤلفہ غلام مرتضی کا ایک خاص قلمی نسخہ میرے پاس ہے جس میں علی عادل شاہ اول (۹۶۵ تا ۹۸۸ھ) کے عہد کے اہم واقعات کے ضمن میں لکھا ہے کہ ورود میراں جی صاحب در سنہ نہ صد و شصت و شش ... بناہ شاہ پور متصل بیجاپور در سنہ نہ صد و شصت و ہفت ۔ گویا شاہ پور جہاں آپ کا مقبرہ ہے ۹۶۷ھ میں آباد ہوا

۳ مولوی عبدالحق ، شاہ میراں جی شمس العشاق ، اردو ، اپریل سنہ ۱۹۲۷ع ، ص ۱۷۲

« موجودہ حالات میں سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں ہے کہ یہ تسلیم کرلیا جائے کہ میراں جی علی عادل شاہ اول کے عہد میں آئے۔ آپ کے قلمی نسخے بساتین السلاطین کا قول صحیح معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۹٦٦ھ میں وارد بیجاپور ہوئے اور اس لحاظ سے ۹۷۰ھ ان کا سنہ وفات ہوگا۔ »[1]

ڈاکٹر زور کے دلائل بڑے وزنی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر نذیر احمد نے بھی ان سے اتفاق کرتے ہوئے لکھا ہے:

« ڈاکٹر زور نے مختلف شواہد کی بنا پر ان کا سنۂ وفات ۹۰۲ھ[2] بتایا ہے جو زیادہ قرین قیاس ہے۔ »[3]

ڈاکٹر زور نے جس مرثیہ کو کسی « نامعلوم شخص کا » سمجھ کر درخور اعتنا نہیں سمجھا اس کے بارے میں اکبرالدین صدیقی نے کتب خانۂ عنایت الٰہی کے مخطوطہ کی بناء پر لکھا ہے کہ یہ مرثیہ جانم کی تصنیف ہے۔[4] اس لئے سنۂ وفات کے تعین کے سلسلہ میں اس مرثیہ کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

ڈاکٹر زور کا خیال ہے کہ ‹ شمس العشاق › سے میراں جی کا سنۂ پیدایش نکلتا ہے اور مولوی عبدالحق اس کو مادۂ وفات مانتے ہیں۔ لیکن ان دونوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ شمس العشاق میراں جی کا لقب ہے جو بقول معظم عطائے پیر اور بقول علی پیر عطائے رسول ہے اور لقب سے سنۂ پیدایش یا سنۂ وفات کا برآمد ہونا قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ مولوی عبدالحق نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ مادۂ تاریخ شاہ حسین ذوقی نے کہا ہے۔ لیکن میراں جی کے نام کے ساتھ شمس العشاق کا لقب معرفۃ السلوک[5]، ارشادنامے[6] اور امین العرفان[7] میں بھی ملتا ہے، جس سے صاف ظاہر ہے کہ ذوقی سے بہت پہلے یہ لقب مشہور ہو چکا تھا۔

---

۱ مولوی عبدالحق، مکتوب بنام سخاوت مرزا، مکتوبات عبدالحق، (مرتبہ جلیل قدوائی) ص ۶۷

۲ سہو کتابت ہے۔ ۹۷۰ ہونا چاہئے

۳ علی گڑھ تاریخ ادب اردو، ص ۲۱۰

۴ اکبرالدین صدیقی، کلمۃ الحقائق، مقدمہ، ص ۴۔ اکبرالدین صدیقی نے مقدمۂ کلمۃ الحقائق میں وہ شعر نقل نہیں کیا ہے جس میں جانم کا تخلص آیا ہے لیکن اندرونی شہادت موجود ہے۔ انھوں نے یہ مرثیہ رسالہ سب رس حیدر آباد، اپریل ۱۹۶۸ میں شائع کردیا ہے۔

۵ محمود خوش دہاں، معرفت السلوک، مخطوطہ، مملوکہ راقم الحروف

٦ شاہ برہان الدین جانم، ارشاد نامہ (مرتبہ ڈاکٹر زور)، ص ۵

۷ شاہ امین الدین علی اعلیٰ، امین العرفان، مخطوطہ، مملوکہ سید امین الدین قادری، عرس، ورنگل

۹۰۲ھ کو میراں جی کا سنہ پیدائش تسلیم کرنے میں ایک قباحت یہ بھی ہے کہ کمال الدین بیابانی سے انکی ملاقات اور بیعت معرض بحث میں پڑ جاتی ہے، اس لئے کہ خودنوشت کے بیان کی بموجب میراں جی بائیس سال کی عمر میں حرمین شریفین کی زیارت کو گئے اور بارہ سال تین مہینے اور پانچ دن مدینۂ منورہ میں قیام کرنے کے بعد ہندوستان روانہ ہوئے۔ اس حساب سے ورود ہند کے وقت انکی عمر کم و بیش ۳۵/۳۴ سال ہوگی۔ اگر وہ ۹۰۲ھ میں پیدا ہوئے تو گویا ۹۳۷ھ کے لگ بھگ ہندوستان پہنچے۔

کمال الدین بیابانی اور جمال الدین مغربی کے مصدقہ سنین وفات نہیں ملتے۔ کتب خانۂ گچی محـــل کی ایک بیـاض میں کمال الدین بیابانی کا مادۂ سنہ وفات «کمال الدین بیابانی خدا پایا» (۸۸۱ھ) دستیاب ہوا ہے۔ اگر اس سنہ کو صحیح مانا جائے تو ان سے میراں جی کی بیعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مولوی علیم الدین صاحب کی مملوکہ ایک بیاض میں جمال الدین مغربی کا مادۂ وفات ابدالثانی جناں مثواہ (۸۱۹ ھ) لکھا ہے۔ اگر اس سنہ کو صحیح فرض کیا جائے اور یہ بھی فرض کیا جائے کہ بیعت و خلافت کے وقت حضرت بیابانی کی عمر کم از کم بیس سال کی ہوگی اور انہوں نے اپنے پیر سے ان کے وصال سے کچھ ہی پہلے خلافت حاصل کی تھی تو ان کا سنہ پیدائش (۸۱۹-۲۰) ۷۹۹ھ ہوا. اس حساب سے میراں جی کے ورود ہند (۹۳۷ھ) کے وقت ان کی عمر (۱۳۸) سال کے لگ بھگ ہوگی۔ اتنی عمر شاذ ہے، محال نہیں۔ لیکن ایسی صورت میں مرثیے کے مطابق میراں جی کا سنہ وفات (۹۰۲ + ۹۴ =) ۹۹۶ قرار پاتا ہے۔ اس سنہ میں ۲۵ شوال کو شنبہ کا دن تھا۔ اس لئے عمر کی استثنائی صورت کو تسلیم کرنے کے بعد بھی گتھی جوں کی توں رہ جاتی ہے۔

۹۷۰ھ کو میراں جی کا سنہ وفات تسلیم کرنے میں اس لئے تامل ہوتا ہے کہ اس سال ۲۵ شوال کو پنجشنبہ تھا۔ مرثیے کے مطابق ان کا انتقال پنجشنبہ کو نہیں شب پنجشنبہ کو ہوا۔

اکبرالدین صدیقی نے مرثیے کا وہ شعر جس میں سنہ وفات آیا ہے اس طرح نقل کیا ہے:

تاریخ حضرت سال نوسو وو اس پر اگلے بھی دو
دو دن مــدت وفا شو جے کچھ حکم الٰہی کا[1]

لیکن مولوی عبدالحق نے اس شعر کے مصرع اول کو یوں نقل کیا ہے:

تاریخ حضرت سال نو سو اس پر اگلے بھی دو[2]

یعنی اکبرالدین صدیقی کی قرأت کی بموجب مولوی عبدالحق کے نقل کئے ہوئے مصرع میں نو سو کے بعد وو کا لفظ چھوٹ گیا ہے۔ یہ لفظ «دو» بھی ہوسکتا ہے اور اگر یہ دو ہے تو سنہ ۹۰۲+۲=۹۰۴ھ ہوگا۔ ۹۰۴ھ میں ۲۵ شوال کو چہارشنبہ کا دن تھا اس لئے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ میراں‌جی کی وفات ۹۰۴ھ میں ہوئی۔ چنانچہ ہاشم علی صاحب نے اس سنہ کو میراں جی کا سنہ وفات قرار دیا ہے[3]، لیکن یہ میراں جی کا سنہ وفات نہیں ہوسکتا اس لئے کہ راقم الحروف کی تحقیق کی بموجب شاہ برہان الدین جانم کا سنہ وفات ۱۰۰۷ھ ہے۔ اگر ان کی عمر میراں جی کی وفات (۹۰۴ھ) کے وقت بیس سال تھی تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ (۱۰۰۷-۹۰۴+۲۰)=۱۲۳[4] سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ اس سن میں توالد و تناسل قرین قیاس نہیں۔ اور اگر بفرض محال اس عمر میں جانم کے اولاد ہوئی تھی تو اس خرق عادت کا ذکر ضرور تذکروں میں ہوتا۔ امین نامے میں حضرت امین کی پیدائش کے متعلق کئی خوارق بیان کئے گئے ہیں۔ اگر ان کی پیدائش کے وقت ان کے والد کی عمر (۱۲۳) سال ہوتی تو یقیناً اس کا بھی ذکر ہوتا اور اس کو بھی حضرت امین کی کرامت سمجھا جاتا۔

ہاشم علی صاحب لکھتے ہیں:

«خوارق حیدری میں لکھا ہے کہ سید شاہ حیدر ولی جو غواصی کے مرشد تھے ان کو ۱۲۰ سال کی عمر میں اولاد ہوئی۔ حیدر ولی (متوفی ۱۰۸۴ھ) جو برہان الدین جانم کے بعد کے بزرگ ہیں اگر ان کے ہاں ۱۲۰ سال کی عمر میں اولاد ہوسکتی ہے تو اس صــورت میں برہان الدین جانم کو ۱۰۸ سال یا ۱۱۸ سال کی عمر میں توالد و تناسل

---

۱ اکبرالدین صدیقی، کلمۃ الحقائق، مقدمہ، ص ۵

۲ مولوی عبد الحق، شاہ میراں جی شمس العشاق، اردو، اپریل ۱۹۲۷ء، ص ۱۷۲

۳ ہاشم علی، مغز مرغوب و چہار شہادت، مقدمہ، ص ۲۵

۴ اس سنہ کی تفصیلات آگے آئیں گی۔

کا سلسلہ جاری رکھنا بعید از قیاس نہیں۔"[1]

خوارق حیدری اسم بامسمی ہے۔ اس میں بعض ایسے واقعات لکھے گئے ہیں جن کو تسلیم کرنا مشکل ہے۔ اس لئے اس بیان کو بھی کسی مزید ثبوت کے بغیر تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ حیدر ولی نے سو سال کی عمر میں شادی کی۔ ۱۲۰ سال کی عمر میں صاحب اولاد ہوئے اور ۱۵۰ سال کی عمر میں انتقال کیا[2]

۹۰۴ھ کو سنہ وفات تسلیم کرنے میں ایک اور قباحت یہ ہے کہ میراں جی کے ورود بیجاپور کا مسئلہ الجھ جاتا ہے۔ اگر میراں جی کا انتقال ۹۴ سال کی عمر میں ۹۰۴ھ میں ہوا تھا تو ان کا سنہ پیدائش ۸۱۰ھ قرار پاتا ہے۔ خود نوشت کے بیان کے مطابق وہ کم از کم ۳۵ سال کی عمر میں ہندوستان آئے اور علی عادل شاہ اول کے عہد میں بیجاپور پہنچے۔ لیکن ۸۱۰ھ کو ان کا سنہ پیدائش تسلیم کیا جائے تو ان کے ورود ہند کا سنہ (۸۱۰+۳۵=) ۸۴۵ھ قرار پاتا ہے۔ جبکہ علاؤالدین احمد شاہ ثانی بہمنی (۳۸-۸۶۲ھ) برسر اقتدار تھا اور عادل شاہی حکومت ابھی قائم نہیں ہوئی تھی۔ اگر یہ قیاس کیا جائے کہ ۸۴۵ھ میں وہ ہندوستان آئے اور اپنی آخری عمر میں بیجاپور پہنچے تو یہ یوسف عادل شاہ کا زمانہ ہوا، حالانکہ میراں جی نے صراحۃ لکھا ہے کہ وہ علی عادل شاہ اول کے عہد میں بیجاپور آئے۔

میراں جی کے سنہ وفات کے تعین میں تین امور قابل توجہ ہیں:

۱۔ جانم کی عمر اتنی طویل نہ ہونے پائے کہ وہ وفات کے وقت توالد و تناسل کے قابل نہ رہیں۔

۲۔ خودنوشت کی تمام تفصیلات میراں جی کے سنین پیدائش و وفات سے میل کھائیں۔

۳۔ مرثیے کی تمام تفصیلات متذکرہ دونوں شقوں کے ساتھ چسپیدہ ہوں۔

اس سلسلے میں خودنوشت اور مرثیے کے اہم مندرجات کا تجزیہ کرلینا چاہئے

مرثیہ:

۱۔ مرثیہ کے اس مصرع کی قرأت میں اختلاف ہے جس میں سنہ وفات آیا ہے:

---

۱ ہاشم علی، مغز مرغوب، و چہار شہادت، مقدمہ، ص ۳۲

۲ ابوصالح صاحب کے خاندانی شجرے میں ان کی عمر (۱۷۵) سال لکھی ہے۔ شگوفۂ ولایت (۸۵۸ھ) سے تاریخ پیدائش اور حیدر آخری سے تاریخ وفات (۱۰۲۳ھ) نکلتی ہے۔

(الف) تاریخ حضرت سال نو سو اس پر اگلے بھی دو (عبدالحق)[۱]

(ب) تاریخ حضرت سال نوسو وو اس پر اگلے بھی دو (اکبرالدین صدیقی)[۲]

(ج) تاریخ حضرت سال نوسو دو اس پر اگلے بھی دو (ہاشم علی)[۳]

اسلئے صحیح قرأت کا تعین ضروری ہے۔

۲۔ تاریخ حضرت کا مفہوم کیا ہے۔

۳۔ اربع سوں یو سال ہے ماہے کوں شوال ہے میں اربع سوں کی صحیح قرأت کیا ہے۔

میراں جی کا سنہ وفات جو بھی ہو، ایسا ہونا چاہئے کہ اس سال ۲۵ شوال کو چہار شنبہ کا دن آتا ہو تاکہ شب پنجشنبہ میں ان کی وفات کا تعین ہوسکے۔

خود نوشت:

۱۔ ورود ہند کے وقت میراں جی کی عمر کم از کم ۳۵ سال ہونی چاہئے۔

۲۔ ورود بیجاپور کا تعین ۹۶۵۔۹۸۸ھ (عہد عادل شاہ اول) کے درمیان ہو۔

۳۔ ورود ہند کے وقت کمال الدین بیابانی بقید حیات ہوں۔

مولوی عبدالحق نے مرثیے کے جس مصرع کی قرأت «تاریخ حضرت سال نوسو اس پر اگلے دو» دی ہے اکبرالدین صاحب صدیقی نے اس کی قرأت «سال نو سو وو اس پر اگلے بھی دو» دی ہے۔ اس اختلاف کے باوجود دونوں نے اس مصرع سے میراں جی کا سنہ وفات ۹۰۲ھ نکالا ہے۔ یعنی صدیقی صاحب نے مولوی عبدالحق کے نقل کئے ہوئے مصرع میں صرف لفظ «وو» کا اضافہ کیا ہے۔ جس سے اس کے مفہوم میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ ہاشم علی صاحب کا قیاس ہے کہ یہ لفظ «وو» نہیں «دو» ہے۔ اس طرح متذکرہ مصرع میں جو سنہ لیا گیا ہے وہ ۹۰۲ کی بجائے ۹۰۴ھ ہے۔[۴] ۹۰۴ھ میں ۲۵ شوال کو چہار شنبہ کا دن تو آتا ہے لیکن اس سنہ کو میراں جی کا سال وفات تسلیم کیا جائے تو:

---

۱ مولوی عبدالحق، «میراں جی شمس العشاق» اردو، اپریل ۱۹۲۷ع، ص ۱۷۲

۲ اکبرالدین صدیقی، کلمۃ الحقائق، مقدمہ، ص ۵ (جولائی ۱۹۶۱ع) لیکن انھوں نے اپنے مضامین مرثیہ بر وصال میراں جی شمس العشاق مشمولہ رسالۂ سب رس، اپریل ۱۹۶۸ع اور کتبہ امین درگاہ بیجاپور مشمولہ رسالۂ اردو نامہ (کراچی)، اپریل تا جون ۱۹۶۸ع میں اپنی قرات پر نظر ثانی کرنے کے بعد «نو سو وو» کی بجائے نو سو دو لکھا ہے اور سنہ وفات ۹۰۲ھ کی بجائے ۹۰۴ھ قرار دیا ہے۔

۳ ہاشم علی، مغز مرغوب و چہار شہادت، مقدمہ، ص ۲۷، ۲۸

۴ ایضاً، ص ۲۸

۱۔ خود نوشت کے اس بیان کی تردید ہوتی ہے کہ وہ علی عادل شاہ کے عہد میں بیجاپور آئے اور

۲۔ جانم کی عمر اتنی طویل ہوجاتی ہے کہ اس عمر میں توالد و تناسل قرین قیاس نہیں۔

مرثیے کے جن اشعار میں سنہ آیا ہے ان میں «اربع‌سوں» سے ابہام پیدا ہوگیا ہے۔ یہ لفظ اربع تسوں (اربع تسعون) ہے جس کے معنی (۹۴) ہیں۔ یعنی شاعر یہ کہہ رہا ہے کہ میراں جی نے (۹۴) سال کی عمر میں رحلت کی۔

متذکرہ صدر محققین میں سے کسی نے «حضرت» کے لفظ پر غور نہیں کیا۔ اگر ۹۰۲ھ یا ۹۰۴ھ سنہ وفات ہوتا تو جانم بہ سہولت تمام رحلت کا لفظ استعمال کرسکتے تھے۔ لیکن انھوں نے حضرت کا لفظ استعمال کیا ہے اور رحلت کا لفظ «اربعہ سوں یو سال» کے سلسلے میں بعد کے شعر کے دوسرے مصرع میں باندھا ہے۔ حضرت کا لفظ رحلت کے معنی میں کسی مصنف نے استعمال نہیں کیا ہے۔ اس لفظ کے لغوی معنی نزدیکی، حضور، بارگاہ اور حاضر ہونا ہیں۔ یہ کلمۂ تعظیم بھی ہے۔ سال حضرت کو لازماً سنہ ولادت یا سنہ وفات ہی قرار دینا ہو تو لغوی معنوں کے پیش نظر اس کو کھینچ تان کر سنہ ولادت قرار دیا جاسکتا ہے۔ ۹۰۲ھ کے سنہ ولادت قرار دینے میں جو قباحتیں ہیں ان پر روشنی ڈالی جاچکی ہے، اور پھر حضرت کا لفظ ولادت کے معنوں میں بھی خلاف محاورہ ہے۔ اس لئے اس لفظ کے لغوی معنوں کو برقرار رکھتے ہوئے ہم یہی سمجھنے پر مجبور ہیں کہ «سال حضرت» سے مراد وہ سال ہے جبکہ میراں‌جی ہندوستان پہنچ کر کمال الدین بیابانی کے حضور میں بار یاب ہوئے۔ چونکہ میراں جی کے ورود ہند اور کمال الدین بیابانی سے ان کی بیعت و خلافت کا واقعہ ان کی زندگی کا اہم ترین واقعہ ہے اس لئے مرثیہ نگار نے اس سنہ کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سنہ ۹۰۲ھ ہے یا ۹۰۴ھ یا کچھ اور۔ اگر اس سنہ کو ۹۰۲ھ قرار دیا جائے اور ورود ہند کے وقت میراں جی کی عمر ۳۵ سال قیاس کی جائے تو ان کا سنہ پیدائش (۹۰۲-۳۵ =) ۸۶۷ھ اور سنہ وفات (۸۶۷+۹۴=) ۹۶۱ھ ہوگا۔ ۹۶۱ھ میں ۲۵ شوال کو یکشنبہ تھا۔ اس لئے یہ سنین پیدائش و وفات درست نہیں ہوسکتے۔

ہاشم علی صاحب کی قرأت کے مطابق اگر اس سنہ کو ۹۰۴ھ سمجھا جائے تو میراں جی کا سنہ پیدائش (۹۰۴—۳۵=) ۸۶۹ھ اور سنہ وفات (۸۶۹+۹۴=) ۹۶۳ھ قرار پائےگا ۔ ۹۶۳ھ میں ۲۵ شوال کو سہ شنبہ کا دن تھا ۔ اس لئے یہ سنین بھی درست نہیں ہوسکتے، اور ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ متذکرہ مصرع سے نہ تو ۹۰۲ھ کا استخراج صحیح ہے اور نہ ۹۰۴ھ کا، بلکہ یہ ۹۲۲ھ ہوسکتا ہے ۔ اس کا قرینہ یہ ہے کہ جانم نے پہلے صدی کا ذکر کیا ہے اور اس کے بعد (۲۲) کے عدد کو دو اور اگلے بھی دو سے ادا کیا ہے۔ اگر ۹۲۲ھ میں میراںجی ہندوستان آئے تو اس اعتبار سے ان کا سنہ پیدائش (۹۲۲ـ۳۵=) ۸۸۷ھ قرار پاتا ہے اور اگر انھوں نے ۹۴ سال کی عمر میں انتقال کیا تو ان کا سنہ وفات (۸۸۷+۹۴) = ۹۸۱ھ ہوگا ۔ اس سال ۲۵ شوال کو چہارشنبہ کا دن تھا ۔

اگر ۹۸۱ھ کو میراں جی کا سنہ وفات قرار دیا جائے تو

۱ـ جانم کی عمر کو غیرضروری طول دینے کی ضرورت نہیں رہتی ۔
۲ـ خود نوشت کی تمام تفصیلات اس سنہ سے میل کھاتی ہیں اور عادل شاہ اول کے عہد میں میراں جی کا بیجاپور میں ورود بھی ثابت ہوتا ہے۔
۳ـ مرثیہ کی تمام تفصیلات کا دوسری شقوں سے تطابق پیدا ہوجاتا ہے۔

البتہ کمال الدین بیابانی کے بارے میں یہ تسلیم کرنا پڑےگا کہ انھوں نے طویل عمر پائی۔ اگر ان کا سنہ پیدائش ۸۰۰ھ کے آس پاس قرار دیا جائے تو میراں جی کی بیعت کے وقت ان کی عمر لگ بھگ ۱۲۲ سال ہوگی ۔ قدما میں اتنی عمر حیرت انگیز نہیں ہے ۔

مجھے کتب خانۂ درگاہ شریف ، کتب خانۂ کچی محل اور ذخیرۂ مولوی علیم‌الدین سے جمال الدین مغربی، کمال الدین بیابانی، حاجی دوام الدین، میراں جی شمس العشاق، برہان الدین جانم اور امین الدین علی اعلی کے سنین پیدائش و وفات کے بارے میں جو متناقص اور متضاد مواد اور مادہ ہائے تاریخ دستیاب ہوئے ہیں ان سے ان بزرگوں کی عمروں کا تعین ممکن ہی نہیں۔ اس لئے اس مواد کو نظر انداز کرکے مرثیے اور خودنوشت حالات کے مندرجات میں تطابق پیدا کرکے نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

مزار:

میراں جی کا مزار حصار شہر کے باہر شاہ پور کے اسی ٹیلے پر ہے جہاں بیجاپور پہنچنے کے بعد انھوں نے اقامت اختیار کی تھی۔[1] مزار پر گنبد ہے۔ ان کے مقبرے میں ان کی بیوی رابعہ ماں صاحبہ، سالی خوش بی صاحبہ اور صاحبزادے شاہ برہان الدین جانم بھی دفن ہیں۔[2] یہ چھوٹا گنبد کہلاتا ہے۔ بڑا گنبد حضرت امین کے روضہ کو کہتے ہیں جو اسی احاطے میں ہے۔

احاطۂ درگاہ میں ایک چھوٹی سی مسجد ہے جس کے صحن میں ایک قبر ہے۔ موجودہ سجادہ صاحب کے پیر عطاء اللہ حسینی صاحب کا بیان ہے کہ یہ محمود خوش دہاں کا مزار ہے۔[3] مسجد سے متصل رہایشی مکان ہے جس کے قدیم حصہ کو برہان صوفہ (صحفة) کہتے ہیں۔ مکان کا بیرونی حصہ جو درگاہ حضرت امین کے مقابل ہے دو کمروں اور ایک برآمدے پر مشتمل ہے۔ برآمدے میں گدی بچھی رہتی ہے۔ یہیں کتب خانہ ہے۔ کتب خانہ کے برابر نقار خانہ ہے۔

حضرت امین کے مقبرے اور مکان کے درمیان جو صحن ہے اس میں سجادوں کی قبریں ہیں۔ شاہ برہان الدین جانم کے چھوٹے بھائی عطاء اللہ حسینی اس چوکھنڈی میں دفن ہیں جو حضرت امین کی درگاہ کی بائیں جانب واقع ہے۔ یہ چوکھنڈی ایک علاحدہ احاطہ میں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس احاطے میں صرف بچے اور ناکتخدا دفن کئے جاتے ہیں۔

میراں جی کے مقبرے کے قریب ہی صحن مسجد کے باہر ذرا نشیب میں ایک حجرہ ہے جس میں شاہ برہان الدین جانم کی بیوی دفن ہیں۔ حجرے کا دروازہ ہمیشہ بند رہتا ہے، اس میں کسی مرد کو جانے کی اجازت نہیں۔

احاطۂ درگاہ کے دو بڑے دروازے ہیں۔ صدر دروازہ کو رنگین دروازہ کہتے ہیں۔ دوسرا پکھال دروازے کے نام سے موسوم ہے۔

---

۱ شاہ غلام علی، مشکوٰۃ النبوہ، مخطوطہ ۱۹۴ تذکرہ، کتب خانۂ آصفیہ، حیدر آباد

۲ یاد داشت قبور

۳ اکبرالدین صدیقی نے کسی حوالے کے بغیر اس کو دن سنگھار خاں کا مزار بتایا ہے۔ (سب رس، دسمبر ۱۹۶۵ع ص ۳۰)

علاقۂ درگاہ میں سوائے اہل خاندان کے کسی کو دفن کرنے کی اجازت نہیں. کہا جاتا ہے کہ حضرت امین کے زمانے سے یہ قاعدہ چلا آرہا ہے. اگر کوئی مرید، خادم یا فقیر یہاں مر بھی جاتا ہے تو اسے باہر کے قبرستان میں دفن کیا جاتا ہے جو مریدوں وغیرہ کے لئے مختص ہے. یہاں یہ عجیب طریقہ رائج ہے کہ میت دروازے سے باہر نہیں لیجائی جاتی بلکہ احاطے کی دیوار کو توڑ کر راستہ بنایا جاتا ہے. یہ طریقہ سلاطین دکن میں بھی رائج رہا ہے.

اولاد :

تذکروں میں میراں جی کے صرف دو صاحبزادوں شاہ برہان الدین جانم اور شاہ عطاء اللہ حسینی کے نام ملتے ہیں. لیکن وصیت نامۂ بابا شاہ حسینی اور بعض دوسرے دستاویزات سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے تین صاحبزادے تھے :

«از میراں جی شمس العشاق سہ فرزند بودند، فرزند کلاں برہان الدین جانم صاحب، دویم عطاء اللہ حسینی صاحب و سیوم فریدصاحب»[1]

صاحب مجمع الانصاب اور تذکرۃ الانساب سادات سکنہ بیجاپور نے بھی تین صاحبزادوں کا ذکر کیا ہے لیکن شاہ برہان الدین جانم کے علاوہ دوسرے صاحبزادوں کے نام باباشاہ صاحب اور شیخ فرید بتاتے ہیں :

« شاہ میراں جی را سہ فرزند، یکی برہان الدین صاحب، دوم باباشاہ صاحب، سیوم شیخ فرید صاحب »[2]

خلفا :

میراں جی کا سلسلۂ فیض بہت وسیع تھا لیکن تذکروں میں شاہ برہان الدین جانم کے علاوہ ان کے صرف ایک خلیفہ میرزا فصیح الدین کا نام ملتا ہے جو بابا سجنجل خاکسار کے لقب سے مشہور ہوئے. صاحب روضۃ الاولیا نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

« میرزا فصیح الدین مشہور بابا سجنجل خاکسار کہ از مشاہیر وقت بود و در سلوک و تصوف چاشنیء وافر می داشت و در شعر و شاعری سرآمد دوران و کلامش پسند و مقبول سلاطین و خواتین زمان

---

۱ بابا شاہ حسینی، وصیت نامہ، قلمی، کتب خانۂ درگاہ شریف، بیجاپور

۲ سید محی الدین قادری، مجمع الانساب، مخطوطہ، کتب خانۂ گجی محل، بیجاپور

بود و مرقدش در قصبۂ ساغر از مریدان و تربیت یافتگان و خلفای آن
حضرت است.»[۱]

درگاہ شریف کے ایک شجرے اور شجرہ خلفائیہ مرتبہ سید محمد قادری سے معلوم ہوتا ہے کہ ہیبت خاں، مراتب خاں، تیغ خان، بابا گودھر، میاں من اللہ، میاں جانا، شیخ فرید چشتی اور بابا چاند بودے بھی ان کے خلفا میں شامل تھے۔

تصانیف:

میراں جی سے دکن کی سر زمین پر صرف روحانی فیض ہی عام نہیں ہوا بلکہ اردو زبان اور ادب کو بھی بڑا فروغ ہوا۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

«شاہ میراں جی بڑے بابرکت بزرگ تھے۔ انھوں نے بیجاپور میں ایک ایسے خاندان کی بنیاد ڈالی جس میں ان کے جانشین یکے بعد دیگر کئی پشت تک بڑے صاحب علم اور صاحب ذوق ہوئے اور انھوں نے اسی (اردو) کو اپنی زبان سمجھا اور اسی زبان میں سلوک و معرفت پر متعدد رسالے اور نظمیں لکھیں۔ اس خاندان کے مریدوں اور معتقدوں نے بھی اپنے مرشدوں کی پیروی میں اسی زبان کو اپنی تصنیف و تالیف کا ذریعہ بنایا۔ یہ اسی مبارک خاندان کا اثر تھا کہ بیجاپور میں (اردو) زبان کو اس قدر فروغ ہوا اور وہاں ایسے ایسے خوش بیان اور بلند خیال شاعر پیدا ہوئے جن کی نظیر اردو کے شاعروں میں بہت کم ملتی ہے۔»[۲]

میراں جی کی تصانیف اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ملتی ہیں۔ ان کی اردو تصانیف میں خوش نامہ، خوش نغز اور شہادت الحقیقت قابل ذکر ہیں۔ گل باس اور جلترنگ ناپید ہیں اور مغز مرغوب اور چہار شہادت کا انتساب مشتبہ ہے۔

---

۱ محمد ابراہیم زبیری، روضۃ الاولیا، مخطوطہ ۲۶۶ تذکرہ، کتب خانۂ آصفیہ، حیدرآباد

۲ مولوی عبدالحق، اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۵۰

* تنویر احمد علوی

تاریخ متن

متن کی صحیح حدود کے تعین، تحقیقی و تقابلی مطالعہ کی روشنی میں اس کے گمشدہ سلسوں کی بازیافت، غیر مشمولہ اجزائے متن کی شمولیت اور الحاق و اضافات کی مختلف صورتوں کی تردید یا تائید نیز اوریجنل روایت کی تحقیق کے بعد، اگر یہ سب ممکن ہوسکے، متن کی اپنی تاریخ پر توجہ دینا ضروری ہے جس سے متن کی تحقیق، تفہیم اور ترتیب کے متعدد مسائل وابستہ ہوتے ہیں۔

متن کی تاریخ کے مسائل کو ہم تین حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں: تبئیض متن، کتابت متن، انطباع متن۔

ضروری نہیں کہ کسی متن کی تاریخ کے مطالعہ کے وقت ایسے وسائل موجود ہوں جن سے ہر سہ عنوانات کے تحت تاریخ متن کے مسائل پر گفتگو کی جاسکے اور ایک کے بعد دوسرے سلسلہ کی ضروری کڑیاں ملتی چلی جائیں۔ ممکن ہے کسی متن کی ایک ہی روایت قلمی یا مطبوعہ صورت میں موجود ہو اور بس۔ نیز ایسے خارجی یا موقتی شواہد سے بھی یہ روایت محروم ہو جن سے اس کے زمانے کے تعین میں فی الجملہ مدد ملتی ہو۔ ایسی صورت میں تاریخ متن کے مختلف مسائل پر بحث کا دائرہ صرف متنی مطالعہ تک محدود رہے گا اور جو مسائل زیر بحث آئیں گے وہ اسی ایک روایت سے وابستہ ہوں گے اور اگر صورت حال اس کے برعکس ہوگی تو متن کی تاریخ پر بحث کا دائرہ بھی اسی نسبت سے وسعت اختیار کرتا چلا جائیگا۔

کسی متن کی تبئیض یا تالیف کی تاریخ کو ہم مندرجۂ ذیل سات صورتوں میں سے، حسب ضرورت و موقع، کسی ایک یا زائد صورتوں سے وابستہ کرکے دیکھ سکتے ہیں:

* ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ام. اے؛ پی اچ. ڈی، ڈی، لٹ؛ استاد شعبۂ اردو، دلی کالج، دہلی؛ رکن نصابی کمیٹی، شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی؛ مصنف ذوق، مرتب کلیات ذوق، کلیات شاہ نصیر وغیرہ۔

انضباطی تعین، اختتامی تعین ، تخمینی تعین ، ادواری تعین، استقرائی تعین، استشہادی تعین ، اور اجزائی تعین .

تاریخ کتابت متن کو زمانی تقدیم و تاخیر اور مصنف کے ساتھ ان کے تعلق کی نسبت سے مندرجۂ ذیل حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں :

خطی نسخے ، ہم عہد نسخے ، قریب العہد نسخے ، اہم نسخے ، بعد کے نسخے.

یہی اصول انطباع متن کی تاریخ کے سلسلے میں بھی پیش نظر رکھا جائیگا. مصحح طباعتیں، ہم عہد طباعتیں، قریب العہد طباعتیں، اہم اشاعتیں ، بعد کے انطباعات .

انضباطی تعین جسے دوسرے لفظوں میں حتمی تعین بھی کہا جا سکتا ہے وہ تعین ہے جب وثوق کے ساتھ یہ معلوم ہوسکے کہ متن کی ترتیب ، تالیف ، ترجمہ یا تلخیص کا کام فلاں وقت سے فلاں وقت تک ایک معینہ و طے شدہ مدت میں پورا ہوگیا . مدت کا تعین ، سنین یا کسی زمانہ اکائی کے تعین کا متقاضی ہے . اس کے بغیر حتمی تعین دشوار ہے . مثال کے طور پر کسی مصنف کے اپنے بیان یا اس سے متعلق کسی معتبر روایت سے یہ تو پتہ چل جاتا ہے کہ زیر بحث متن کی تالیف ، تبئیض کاری یا مسودہ سازی کا عمل اتنی مدت میں پورا ہوگیا. لیکن کب ، اس کا تعین نہ ہوسکا تو اسے حتمی تعین نہ کہا جائیگا. ہاں تبئیض کاری کی مدت کا تعین ضرور ہو جائےگا جو حتمی تعین کی ایک شق ہے . حتمی تعین کبھی داخلی و خارجی شہادت کے باوثوق سطح پر حاصل ہوجانے کے بعد ممکن ہوتا ہے اور کبھی متن کی اپنی نوعیت اس کے زمانے کا حتمی تعین کردیتی ہے. مثلاً خطوط ، روز نامچے ، قطعات تاریخ و قصاید تہنیت ، بشرطیکہ ان میں سے کسی پر مصنف نے بعد میں قلم نہ اٹھایا ہو. اول الذکر صورت حال کے لئے کچھ ایسی کتابوں کو پیش نظر رکھا جا سکتا ہے جن سے متعلق دیباچہ ، خاتمے یا مقامات آغاز و اختتام میں اس کی صراحت موجود ہو کہ مصنف نے یہ کام کب شروع کیا اور کتنی مدت گذر جانے پر اختتام پذیر ہوا . مثلاً اسد علی خاں تمنا نے اپنے تذکرہ گل عجائب میں قطعۂ تاریخ آغاز رقم کرتے ہوئے اس کی ابتدا کی طرف اشارہ کیا ہے : خرد گفت آغاز صفحہ بگو. آغاز صفحہ مادۂ تاریخ ہے جس سے اس کی ابتدا کے زمانے ۱۱۹۲ پر روشنی پڑتی ہے . اس کی تکمیل کی تاریخ کو اس مصرع میں شامل

مادۂ تاریخ سے نکالا جاسکتا ہے:

آمدہ آواز غیب شکر خدائے جہاں[1] (۱۱۹۴)

صاحب «گل رعنا» لچھمی نراین شفیق نے اپنے تذکرہ کے آغاز و اختتام کی تاریخ لفظوں اور ہندسوں میں لکھ دی ہے:

«این تالیف در سنه احدی وثمانین ومایة والف ۱۱۸۱ طرۂ آغاز برسر زد و در سنه اثنین و ثمانین و مایة و الف ۱۱۸۲ھ نگار اختتام درپا بست.»[2]

تذکرۂ روز روشن اس کی ایک اور مثال پیش کرتا ہے. مؤلف کے بیان کے مطابق اس کی تالیف کا کام ماہ شعبان سنہ ۱۲۹۶ھ میں شروع کیا گیا. اس کے دو سال بعد یہ سنہ ۱۲۹۸ھ میں مطبع شاہجہانی واقع دارالاقبال، بھوپال، سے شائع ہوا.[3] اس سے واضح طور پر اس کی تالیف کے زمانہ کا تعین ہوجاتا ہے.

مرزا قادر بخش صابر کا تذکرہ «گلستان سخن» بھی اسی زمرہ میں آتا ہے. اس کی تالیف کا کام یکم شعبان سنہ ۱۲۷۰ھ کو شروع کیا گیا. چونکہ اس کا اختتام ایک سال سے پہلے متوقع نہ تھا اس لئے نظام الدین جوش کا مجوزہ تاریخی نام «گلستان سخن» (۱۲۷۱ھ) رکھ لیا گیا. تالیف کا یہ کام آخر ماہ شوال سنہ ۱۲۷۲ھ تک پورا ہوا. اس حساب سے بقول مولانا امتیاز علی‌خاں عرشی اس کی تالیف میں ایک برس دو مہینے صرف ہوئے[4]

تذکروں کے علاوہ دوسری نوعیت کے متون میں بھی زمانۂ آغاز و اختتام کے تعین کی مثالیں مل جاتی ہیں. مخزن الفوائد کے مؤلف نے اپنی تالیف کے زمانۂ ترتیب پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

«آنچه در صفحهٔ خاطر فاتر مرتسم و مدام در مزاولت بودند بتالیف آن پرداختم و در ہمان سال که یکہزار و دو صد و بست و پنج ہجری بودند باتمام رسانیدم و نامش مخزن الفوائد و نام تالیفش خزینة الاصول داشتم.»[5]

---

۱ گل عجائب، ص ۱ اور ۱۶۶
۲ گل رعنا، ص ۱۸
۳ روز روشن، ص ۶۱۲
۴ دستور الفصاحت، دیباچۂ مصحح، ص ۱۰۳
۵ مخزن الفوائد، طبع مصطفائی ۱۲٦۷ھ، ص ۵

باغ و بہار کے زمانۂ تالیف پر میر امن کے اس بیان سے روشنی پڑتی ہے:

«جب یہ کتاب فضل الٰہی سے اختتام کو پہنچی جی میں آیا کہ اس کا نام بھی ایسا رکھوں کہ اس میں تاریخ نکلے. جب حساب کیا تو بارہ سو پندرہ ۱۲۱۵ ہجری تھے. اخیر سال میں لکھنا شروع کیا تھا. باعث عدم فرصتی کے بارہ سو سترہ ۱۲۱۷ھ کے ابتدا میں انجام ہوئی. اس فکر میں تھا کہ دل نے کہا 'باغ و بہار' اچھا نام ہے کہ ہم نام اور ہم تاریخ اس سنہ میں نکلی:

مرتب ہوا جب یہ باغ و بہار
تھے سن بارہ سو سترہ در شمار[1]

مجالس رنگین کو بھی اس کی ایک مثال کے طور پر سامنے رکھا جاسکتا ہے. مؤلف نے وجہ تالیف کے سلسلہ میں نعیم نامی اپنے ایک دوست سے ملاقات کا ذکر کیا ہے جس کا زمانہ اس کے مندرجہ ذیل بیان سے متعین ہوجاتا ہے:

«در عہد شاہ عالم بہادر بادشاہ غازی سنہ چہل و چہار از جلوس والا مطابق سنہ دوازدہ صد و پانزدہ ہجری بتاریخ ہفدہم رجب المرجب در لکھنؤ واقع شدہ.»

چونکہ تالیف کا کام ایک بہت مختصر مدت میں ہوگیا اس لئے اس کے زمانۂ تالیف کا تعین آسان ہوجاتا ہے.

دکن کے مشہور شاعر ملا غواصی نے اپنی مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال کے اختتامیہ شعر میں اس کے آغاز و انجام دونوں کی طرف اشارہ کردیا ہے:

برس یکہزار اور پنج تیس میں
کیا ختم یو نظم دن تیس میں

یعنی مصنف کے بیان کے مطابق یہ مثنوی سنہ ۱۰۳۵ھ میں صرف ایک ماہ کی قلیل مدت میں مکمل ہوگئی.

اسی طرح وجہی نے جو غواصی کا پیش‌رو ہے اپنی مشہور مثنوی قطب مشتری کے زمانۂ تالیف کو اس شعر میں پیش کیا ہے:

تمام اس کیا دیس بارہ منے
سن یکہزار ہور اٹھارہ منے ۱۰۱۸

---

۲ باغ و بہار، ص ۱۸۱

اس کی مثالیں اور بھی مل جائیں گی۔

لیکن بیشتر مصنفین اپنی تالیفات کے زمانۂ آغاز کی طرف کوئی اشارہ نہیں کرتے۔ صرف زمانۂ اختتام دے دیا جاتا ہے۔ مثلاً تذکرۂ دیوان جہاں کے سال تکمیل کا ذکر ان سادہ لفظوں میں ہوا ہے:

«تمام شد بتاریخ سیم ماہ ستمبر ۱۸۱۴ (۱۲۲۹) بتوفیق اللہ۔»[۱]

کبھی اعداد نظم کردئیے جاتے ہیں۔ چنانچہ تذکرۂ ہندی کے خاتمہ پر جو قطعۂ تاریخ دیا گیا ہے اس کا شعرِ آخر اس طور پر ہے:

سال او چوں ز خرد پرسیدم
یک ہزار و دو صد و نہ بنوشت[۲] ۱۲۰۹ ھ

یا مثلاً «عشق نامہ» کی تاریخ جو ایک قدیم دکنی مثنوی ہے اس شعر میں موجود ہے:

ہوا جب یو مبارک ختم مجھ قال
ہزار اک ہور نود پر تین تھے سال[۳]

اسی طرح ہاشمی کی مثنوی اس شعر کے مطابق سنہ ۱۰۹۹ھ میں تمام ہوتی ہے:

مرتب کیا جب یہ قصہ کو تو
ہزار اک برس پر نود پر تھے نو[۴] ۱۰۹۹ ھ

بعض دوسری دکنی تالیفات پر بھی ایسے شعر مل جاتے ہیں جن میں سال اختتام لفظی اعداد میں مرقوم ہوا ہے۔ لیکن ادب القدماء میں زیادہ تعداد ایسے متون کی ہے جن میں قدیم روش کے مطابق تاریخ اختتام قطعات تاریخ کی صورت میں درج کی گئی ہے۔ مثلاً، سفینۂ ہندی مولفہ بھگوان داس ہندی کی تاریخ تالیف «باغیچۂ بہار» سے برآمد ہوتی ہے جو اس کا مادۂ تاریخ ہے اور قطعۂ تاریخ کے اس آخری شعر میں موجود ہے:

گلہای خرد درو شگفتہ شد باغیچۂ بہار نامش[۵]

---

۱ مجالس رنگین، ص ۱
۲ دیوان جہاں، طبع ۱۹۵۹، ص ۳۵۰
۳ تذکرۂ ہندی، طبع اول، ص ۲۸۲
۴ اردوے قدیم، ص ۹۰
۵ ایضاً، ص ۹۰

سید حیدر بخش حیدری کی تاریخ تالیف کو اس شعر سے معلوم کیا جاسکتا ہے :

کر دور سر یاس کہا پیر خرد نے
کیونکر نہ کہیں ہم اسے آرایش محفل ۱۲۳۲ = ۱۰ — ۱۲۴۲

یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ تاریخ سر یاس بھی « ی » کے تخرجہ سے نکالی گئی ہے ۔

دواوین ، تذکروں اور دوسری کتابوں کے نام اکثر دستور قدیم کے مطابق مادۂ تاریخ سے وابستگی کے ساتھ رکھے جاتے تھے ۔ مثلاً ، مجموعۂ نغز (۱۲۲۱ھ) خوش معرکۂ زیبا (۱۲۶۱ھ) ، مخزن نکات (۱۱۶۸) ، غنچۂ ارم (۱۲۹۹ھ) ، انتخاب یادگار (۱۲۹۰ھ) ، سخن شعرا (۱۲۸۱ھ) ، ریاض الفصحا (۱۲۳۶ھ) ، گلستان بے خزاں (۱۲۹۹ھ) وغیرہ ۔

یہ تو کچھ تذکروں کے نام تھے ۔ بعض دواوین اور مجموعہ ہائے اشعار کے نام بھی اسی نہج پر رکھے گئے ہیں ۔ جیسے :

ریاض البحر (۱۲۵۲ھ) ، انتخاب دہر (۱۲۶۳ھ) ، تمکین معرفت (۱۳۱۰ھ) ، شاہد غیب (۱۳۲۲ھ) ، توشۂ آخرت (۱۹۱۲ء) وغیرہ ۔

یہ دوسری بات ہے کہ ایسے بعض متون کی تکمیل متوقع یا مقررہ مدت کے کچھ بعد ہوئی ہو یا مصنف نے ایک مختصر مدت تک اس پر نظر ثانی کی ہو ۔

تخمینی تعین :

ایسی بعض حالتوں میں جہاں تحقیقی ضرورتوں کے پیش نظر زمانۂ آغاز کا پتہ چلانے کی سعی کی جاتی ہے وہاں ابتدائی یا ثانوی روایت کی تکمیل کے بعد جو اضافے یا ترمیمات عمل میں آئی ہیں ان کے زمانی سلسلہ کی بھی کھوج کی جاتی ہے اور تحقیقی وتقابلی مطالعہ کی روشنی میں جن نتائج تک رسائی ہوتی ہے اور زمانۂ تالیف کی جو قیاسی حد بندی کی جاتی ہے اسے تخمینی تعین کہا جاسکتا ہے ۔ شعرائے اردو کے تذکروں اور ایسی ہی بعض دیگر تصانیف میں اکثر نگاہ دیدۂ تحقیق زمانۂ تالیف کے حتمی تعین نہ ہونے کی صورت میں تخمینی یا قیاسی تعین کی طرف مائل ہوتی ہے ۔

کہیں کہیں اساسی روایت اور اس کے ماضی و مستقبل کے مابین جہاں تک

مسودہ نگاری یا ترمیم و اصلاحات کا تعلق ہے کچھ زیادہ فاصلے نہیں ہوتے . مثلاً صاحب تذکرۂ « مسرت افزا » خاتمۃ الکتاب میں اس کی وضاحت کرتا ہے کہ اس نے سنہ ۱۱۹۳ھ میں سفر کلکتہ کے دوران یہ تذکرہ مکمل کیا تھا . اس کا امکان ہے کہ وہ اس سے کچھ پہلے سے اس کی ترتیب کے ابتدائی کام میں لگا ہوا ہو . سنہ ۱۱۹۴ھ میں پھر وہ لکھنؤ آیا تو اس زمانہ کے اکثر نکتہ پردازوں کے متعلق اسے اطلاع ملی جن کا تذکرہ اس نے اپنی تالیف میں ضروری سمجھا . چنانچہ مرتب تذکرہ نے لکھا ہے کہ :

> کام کی ابتداء ۱۱۹۲ھ میں ہوئی جبکہ وہ مرشدآباد میں مقیم تھے . کلکتہ کے دوران سفر میں ۳ جمادی الآخر سنہ ۱۱۹۳ھ کو یہ تذکرہ پایۂ تکمیل کو پہنچا اور بقول مؤلف جب سنہ ۱۱۹۴ھ میں لکھنؤ پہنچے تو اکثر شاعروں کے احوال کا اضافہ کیا . مثلاً ، شاہ عالم آفتاب کے ترجمے میں سنہ ۱۱۹۴ھ کا ذکر کیا ہے اور کم ازکم چار مقامات پر سنہ ۱۱۹۵ھ کا ذکر کیا ہے . مثلاً ، خلیل میر شورش ، مرزا مظہر اور تصور کے تراجم میں ۱۱۹۵ھ کا ذکر ہے جس کا مطلب ہے کہ مؤلف نے سنہ ۱۱۹۵ھ تک اضافے کئے ہیں . »[1]

تذکرہ نگار بالعموم پہلی روایت کے تتمہ کے طور پر جس زمانۂ تالیف کی طرف اشارہ کرتے ہیں وہ اکثر اس کی ابتدا اور انتہا کو محیط نہیں ہوتا . وہ کسی روایت کی تشکیل پذیری کے زمانہ کو اس کی تکمیل سے الگ نہیں کرتے اور اس کے اظہار کو ضروری خیال نہیں کرتے کہ یہ روایت کتنی مدت میں تیار ہوئی اور نہ اس کی نشان دہی ہوتی ہے کہ پہلی روایت کی تسوید کے بعد جو اضافے عمل میں آئے ان کی توسیعی مدت کیا ہے . مثلاً ، مصحفی نے اپنے تذکرۂ عقد ثریا کے دیباچہ میں سال اختتام کو ان الفاظ کے ساتھ درج کیا ہے : « تاریخش بدین گونہ صورت اتمام یافت » .مادۂ تاریخ اس مصرع میں موجود ہے : تاریخ یافت خامہ زہے باغ باصفا (۱۱۹۹) . لیکن خلیل الرحمن داؤدی نے لکھا ہے کہ یہ تذکرہ کی تالیف کے آغاز کا سن ہے ، اتمام کا نہیں . اس کی تکمیل بہت بعد میں ہوئی . مصحفی پنڈت بدھاد ہر فصیح کے حال میں لکھتے ہیں : « در یکہزار و دو صد و دوازدہ ہجری داخل تذکرہ شد . »

---

۱ تذکرۂ مسرت افزا (ترجمہ) ، ص ۱۳

کریا دیال مضطر تخلص کے ترجمہ میں لکھا ہے : « تا امسال کہ سنہ یکہزار و دو صد و سیزدہ ہجری است . . . » جس کے یہ معنی ہیں کہ یہ دونوں ترجمے بالترتیب ۱۲۱۲ھ اور سنہ ۱۲۱۳ھ میں قلمبند کئے گئے ہیں [1]

اس طرح تذکرہ کی روایت اول پر اضافات کا عمل ۱۲۱۳ھ تک جاری رہا . لیکن من حیثیت المجموع مصحفی کا یہ تذکرہ تذکرۂ ہندی کے کار تالیف کے آغاز سے پہلے پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا جس کی طرف مؤلف نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے :

> «چون این فقیر حقیر غلام ہمدانی مصحفی از تصنیف دیوان فارسی و ہندی و تالیف تذکرۂ فارسی فراعت حاصل کردہ مہم تالیف تذکرۂ ہندی درپیش آمد . » [2]

تذکرۂ مخزن نکات مؤلفہ قائم چاند پوری اس نوعیت کی ایک اور اہم مثال ہے جس کی روایت کی تکمیل کا سال جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ۱۱۶۸ھ ہے . لیکن اس تذکرہ کے مختلف اجزا کی شیرازہ بندی اور اس کے مشتملات کی جمع آوری کا کام اس سے کافی دنوں پہلے شروع کیا جاچکا تھا . مؤلف کا بیان ہے کہ

> «این فقیر مؤلف محمد قیام الدین بعد از کوشش تمام و سعی مالا کلام دواوین این اعزہ فراہم آوردہ پارۂ ابیات از ہرکدام بر سبیل یادگار در ذیل بیاض کہ مورخ موسوم بہ مخزن نکات بقید قلم در آوردہ » [3]

فحوائے عبارت سے ظاہر ہے کہ بیاض سازی کا کام کافی پہلے شروع کیا گیا تھا . رفتہ رفتہ اسے ایک تذکرہ کی شکل دیدی گئی . اس میں بعض تراجم کا اندراج مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور اس کے مرتب ڈاکٹر اقتدا حسن کی تحقیق کے مطابق روایت اول کی تکمیل سے بہت دنوں پہلے ہوچکا تھا . مثلاً ، ولی اللہ اشتیاق (م ۱۱۵۰ھ) اور مضمون متوفی (م ۱۱۴۷ھ) کا ترجمہ سنہ ۱۱۵۷ھ میں قلمبند کیا گیا . اس طرح دلاور خاں بیرنگ کا ترجمہ اس وقت شامل بیاض کیا گیا جب وہ ہم رنگ تخلص کرتے تھے جب کہ میر اور گردیزی نے بیرنگ لکھا ہے اور میر نے اس امر

---

۱ دیوان درد ، مرتبہ خلیل الرحمن داؤدی ، مقدمہ ، ص ۶۱

۲ تذکرۂ ہندی ، ص ۲

۳ مخزن نکات ، مرتبہ ڈاکٹر اقتدا حسن ، ص ۲

کی صراحت کی ہے کہ پہلے ہمرنگ تخلص کرتے تھے۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ قائم نے ان کا حال تخلص کی تبدیلی سے پہلے قلمبند کیا تھا۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے اس پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے :

« قائم نے اپنا تذکرہ پہلے بیاض کی صورت میں مرتب کیا تھا۔ اس بیاض کے آغاز کے بارے میں سب سے پہلی تاریخ ۱۱۵۷ھ ملتی ہے۔ ۱۱٦۷ کے بعد اس بیاض نے تذکرہ کی شکل اختیار کرلی اور مصنف نے اس کا نام مخزن نکات رکھا جس سے ۱۱٦۸ھ برآمد ہوتے ہیں۔ اس کے بعد بھی اس نے جا بہ جا اضافے کئے جن کا سلسلہ ۱۱۷٦ھ تک جاری رہا۔ »[۱]

یہی حال میر حسن کے تذکرۂ شعرائے اردو کا ہے جس کی تاریخ اختتام سے متعلق مؤلف نے لکھا ہے : « در تاریخ یکہزار و یک صد و نود و یک ہجری باتمام رسیدہ »

اس سے یہ قیاس کرنا بجا ہے کہ تذکرہ کی تالیف کا کام سنہ ۱۱۹۱ھ میں ختم ہوگیا۔ اس کے مرتب نواب صدر یار جنگ نے مقدمہ میں لکھا ہے :

« تذکرہ میں میر صاحب نے جو فہرست اپنی تصانیف کی لکھی ہے اس میں رموز العارفین ہے، گلزارارم نہیں ہے۔ رموز العارفین کا سال تصنیف سنہ ۱۱۸۸ھ ہے اور گلزار ارم کا سنہ ۱۱۹۲ھ۔ رموز العارفین کی نسبت لکھا ہے کہ وہ مشہور ہوچکی ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ تذکرہ سنہ ۱۱۸۸ھ اور سنہ ۱۱۹۲ھ کے ما بین لکھا گیا »[۲]

لیکن دستور الفصاحت کے دیباچہ میں مولانا امتیاز علی عرشی نے اس کے زمانۂ تالیف پر جو تحقیقی بحث کی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ میر حسن نے ۱۱۸۴ھ یا اس سے کچھ پیشتر تذکرہ لکھنا شروع کیا تھا اور سنہ ۱۱۹۱ھ میں ختم کردیا۔ بعد کے اضافوں میں صرف شاہ فصیح کی تاریخ وفات ہے جو سنہ ۱۱۹۲ھ میں واقع ہوئی تھی۔[۳]

اس کی ایک اور مثال تذکرۂ عمدۂ منتخبہ سے دی جاسکتی ہے۔ اس تذکرہ کی ابتدائی روایت سنہ ۱۲۱۵ھ یا اس کے قریبی زمانہ میں مسودہ سازی کی منزل

---

۱ دستور الفصاحت ، دیباچۂ مصحح ، ص ۵۹
۲ تذکرۂ شعرائے اردو ، طبع ثانی ، ص ۲
۳ دستور الفصاحت ، دیباچۂ مصحح ، ص ۱٦۹ - ۱٦۴

سے گذری۔ «یہ ہے معیار نقد سخن» ۱۲۱۵ھ اس کی تاریخ ہے۔ لیکن اس روایت کی تبئیض‌کاری میں غالباً ایک سال صرف ہوگیا جس کا اندازہ غالب علی سید کی کہی ہوئی تاریخ سے ہوتا ہے جس کا مادۂ تاریخ «عمدۂ منتخبہ» ہے جو تاریخ بھی ہے اور تذکرہ کا نام بھی ہے۔ اس کے بعد مصنف نے اس روایت میں اضافوں کا سلسلہ شروع کیا جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہا۔ رضی کی تاریخ «ہمین اسم اعظم» اور عاشق کے مادۂ تاریخ «باغ و بہار» سے ۱۲۱۷ھ مستفاد ہوتے ہیں۔ «مفتاح بوستان نعیم» ۱۲۱۸ھ نصیر کے مصرع «یہ مجموعہ کوئی عطر سخن ہے» ۱۲۱۹ھ اور احسان کی تاریخ «سرور دل شاعران زمان» ۱۲۲۰ھ برآمد ہوتے ہیں۔ یہ سلسلہ بقول پروفیسر خواجہ احمد فاروقی سنہ ۱۲۲۴ھ تک جاری رہا۔ جس کو اتمام تذکرہ کی تاریخ سمجھنا چاہئے۔ خاتمہ کی عبارت جس سے یہ تاریخ معلوم ہوتی ہے مندرجہ ذیل ہے:

«الحمد للہ کہ بہ فضل ایزد متعال این نسخہ نہم محرم الحرام سنہ ۱۲۲۴ھ موافق سنہ جلوس مبارک ۰۰۰ صورت اختتام پذیرفت۔»

اس سلسلہ میں آگے چل کر پروفیسر موصوف نے لکھا ہے کہ «اس کی مزید تصدیق نسخۂ پیرس اور نسخۂ عبدالحق سے بھی ہوتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ ڈاکٹر عبدالحق نہم محرم الحرام ۱۲۲۴ھ کو تاریخ کتابت تسلیم کرتے ہیں اور راقم الحروف کا خیال ہے کہ اس کو اختتام تذکرہ کی تاریخ سمجھنا چاہئے»۔[1]

«سبعۂ سیارہ» کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سرور سنہ ۱۲۳۶ھ سے پہلے اپنا دیوان اور تذکرہ مرتب کرچکے تھے۔

> «چون درین ایام از تدوین طبع زاد خود و تالیف تذکرۂ ریختہ گویان فراغ حاصل شد۔»[2]

مولانا آزاد کے قول کے مطابق ذوق نے دریائے اعظم سے تکمیل تذکرہ کی تاریخ ۱۲۳۶ نکالی تھی جب کہ یہ دراصل مثنوی سبعۂ سیارہ کی تاریخ ہے جس سے فاضل مرتب نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس سنہ تک یہ تذکرہ بہرحال مکمل ہوگیا تھا۔[3]

---

۱ عمدۂ منتخبہ، مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، ص ۸۲۴

۲ ایضاً، ص XIV

۳ ایضاً، ص XIV

لیکن تذکرہ سرور (عمدۂ منتخبہ) میں جہاں کئی ایسی شہادتیں موجود ہیں جن سے بصراحت معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نقش بہت پہلے صورت پذیر ہوچکا تھا وہاں ایسے داخلی شواہد بھی موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ سرور نے اس کے بعد بھی اضافہ و ترمیم کے عمل کو جاری رکھا۔ چنانچہ سرور تخلص شیخ پیر بخش کے ترجمہ میں لکھا ہے :

« در سنہ بست و سہ جلوس قبلۂ عالم ظل الہی جہان میرزا محمد اکبر شاہ غازی ... ہنگام مراجعت مرشد زادۂ عالمیان مرتبہ ملازمی حاصل نمود . »[1]

جس کے معنی ہیں کہ یہ ترجمہ باین صورت ۱۲۴۴ھ سے تعلق رکھتا ہے۔

ماحصل اس گفتگو کا یہ ہے کہ جن متون کی روایت میں مصنف تبدیلیاں اور اضافے کرتا رہتا ہے ان کے زمانۂ تالیف کے حتمی تعین میں بسا اوقات دشواری پیش آتی ہے۔ لیکن مختلف روایتوں کے تقابلی مطالعہ اور بعض ترجموں کے تحقیقی تعین کی مدد سے متن میں اصلاحات و اضافات کے زمانہ کی وسعت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یہی قیاسی یا تخمینی تعین ہے۔

ادواری تعین :

مختلف المیعاد متون زمانی تعینات کے سلسلے کو ادواری تعین کہا جاسکتا ہے۔ اوپر کی بحث کا بین السطور میں بھی اداوری تعین کی طرف اشارہ موجود ہے۔ مثلاً، عمدۂ منتخبہ کی وہ روایت جس سے ۱۲۱۹ھ میں صاحب تذکرہ کے بیان کے مطابق مؤلف مجموعۂ نغز حکیم قدرت اللہ قاسم نے استفادہ کیا تھا۔ نیز اس کے بعد کی روایتیں ۱۲۲۴ھ اور ۱۲۳۶ھ کو اگر سامنے رکھا جاسکے تو تو تقابلی مطالعہ کے ذریعہ مختلف روایتوں کا ادواری تعین کیا جاسکتا ہے اور یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ کس حصہ یا کس روایت کی تسوید کس زمانہ سے وابستہ ہے۔ کسی شعری مجموعہ میں شامل سلسلہ ہائے اشعار کو ہم کسی نہ کسی حد تک ادواری تعین کے دائرہ میں لاسکتے ہیں اگر اس کے مختلف مبیضوں اور ان ترجموں سے مدد لی جاسکے جو وقتاً فوقتاً معاصر تصانیف میں شامل ہوتے رہے۔ سودا کے کلیات کی تدوین پر گفتگو کرتے ہوئے شیخ چاند نے لکھا ہے :

---

۱ عمدۂ منتخبہ، ص ۴۲۶

« تدوین کلیات کی تاریخ کا صحیح تعین کرنا دشوار ہے . سودا کم و بیش پچاس سال تک طبع آزمائی کرتا رہا. اس لئیے اس کی زندگی میں اس کے کلیات کا ایک وقت میں مدون ہونا ناممکن تھا. میر . حمید ، گردیزی اور قائم نے کلیات کا کوئی ذکر نہیں کیا . »[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تذکروں کی تکمیل کے زمانہ تک یا کم از کم اس وقت تک جب ان میں سودا کا ترجمہ داخل کیا گیا سودا کا کلیات مرتب نہیں ہوا تھا . شیخ چاند کے بیان کے مطابق سودا کے کلیات کا جو قدیم‌ترین نسخہ ملا ہے وہ سنہ ۱۱۷۴ھ کا لکھا ہوا ہے . اس کی تدوین و کتابت کاحال اس کے ترقیمے سے واضح ہوتا ہے :

« فقیر بے حاصل ... گنہ گار و سیہ کار صادق علی و پریشان خاطر و شکستہ روزگار، بموجب فرمایش مہربان سراپا لطف و احسان حافظ نظارت خاں ... سلمہ الرحمن ، آنچہ کہ از دیوان مرزا رفیع سودا جمعی کہ نزد خود داشت در ہمین ہنگامۂ شاہ درانی ... از کمال پریشانی کہ اسباب کتابت درست نداشت ضرورتاً (کذا) مسودہ باستعجال تمام بجہت یادگاری بتاریخ ہفتدہم (کذا) شہر ربیع‌الثانی مطابق سنہ ہجری یکہزار و یک صد و ہفتاد و چہار در بلدۂ شاہجہان آباد در حویلی نواب برہان الملک انزوا اختیار کردہ وقت سہ پہر اختتام تحریر نمود »

اس میں « دیوان » کا لفظ آیا ہے . اس سے ایک مربوط مجموعۂ کلام مراد ہونا چاہئیے جس کے یہ معنی ہیں کہ اس سنہ میں پہلی بار ان کے دیوان کی تدوین عمل میں آئی . لیکن جس عجلت کے ساتھ یہ کام انجام دیا گیا اس کے پیش نظر یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ شاید یہ تمام و کمال مجموعۂ کلام پر محیط نہ ہو .

شفیق اورنگ آبادی نے اپنے تذکرۂ چمنستان شعرا تالیف سنہ ۱۱۷۵ھ میں سودا کے کلیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

« کلیاتش متضمن بر قصائد و مثنوی ومخمس و ترجیع‌بند و رباعی و مرثیہ قریب دو ہزار بیت بہ نظر امعان رسید . »[2]

---

۱ سودا از شیخ چاند ، ص ۱۰۱

۲ ایضاً ، ص ۱۰۲

شیخ چاند کا خیال ہے کہ یہ کلیات سودا کا کوئی اور انتخاب ہوگا اس لئے کہ سنہ ۱۱۷۴ھ کے نسخے میں اس کے کئی گنا ابیات موجود ہیں ۔ اس کے بعد میر حسن اور کئی دوسرے تذکرہ نگاروں نے تدوین دیوان کا ذکر کیا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ بارہویں صدی ہجری کے ربع ثانی میں سودا کی وفات ۱۱۹۵ھ سے پہلے ان کے دیوان کے کئی نسخے شیوع پاچکے تھے ۔ ان میں دو نسخے بطور خاص قابل ذکر ہیں ۔ ایک ان کے شاگرد اصلح الدین کا مرتب کردہ ہے :

« فقیر عزلت گزین اصلح الدین بگوش اہل نیوش می رساند کہ این دیوان رفیع بنیان مرزا رفیع السودا سلمہ اللہ تعالی ہست ۔ »[1]

اس سے واضح طور پر اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ یہ دیوان سودا کی زندگی میں مرتب ہوا ۔

سودا کے دیوان کا ایک اور اہم نسخہ ، نسخۂ جانسن ہے جو خاص اہتمام سے تیار کیا گیا تھا اور شاعر کے ممدوح مسٹر جانسن کو پیش کیا گیا تھا جو لکھنؤ کے ریزیڈینٹ تھے ۔

غرض کہ ایسے مختلف نسخے جو شاعر کی زندگی میں ترتیب پاگئے ہوں ان کی مدد سے فی الجملہ مختلف روایتوں اور حصص نظم کا ادواری تعین ممکن ہوجاتا ہے ۔

شعری متون کے سلسلہ میں تذکروں میں شامل روایتیں بھی ادواری تعین کی کچھ اہم کڑیاں ہوتی ہیں ۔ یہ صحیح ہے کہ تذکروں میں جو انتخاب شامل ہوتا ہے وہ مقدار کلام یا تعداد اشعار کے اعتبار سے اکثر کسی شاعر کی تمام تر تخلیقات کا نمایندہ نہیں ہوتا ۔ تذکرہ نگار نمونۂ کلام دیتے ہیں ، نمایندہ انتخاب نہیں دیتے ۔ غزل کے علاوہ دیگر اصناف سخن سے انتخاب کم ہی تذکروں میں شامل ہوتا ہے ۔ تاہم ایک عہد کے مختلف تذکروں کو سامنے رکھ کر ان زمینہائے سخن کا انتخاب کیا جاسکتا ہے جن میں اس وقت تک غزلیں کہی جاچکی تھیں ۔ بعض تخلیقات کا حوالہ بھی موجود ہوتا ہے ۔ اس کو سامنے رکھتے ہوئے ہم اس حصۂ کلام یا اس شعری تخلیق کے دور کو متعین کرسکتے ہیں ۔ کبھی یہ تعین ایجابی ہوتا ہے جس کے معنی ہیں کہ فلاں چیز فلاں معین وقت یا مدت میں سامنے آئی ، اور کبھی سلبی ، جس

---

۱ سودا از شیخ چاند ، ص ۱۰۲

سے واضح طور پر یہ مراد ہے کہ ایک طور پر قیاسی تعین کے ساتھ یہ کہا جاسکے کہ فلاں وقت کے بعد یا فلاں مدت سے پہلے سامنے آئی۔

شیخ چاند نے مختلف ادوار میں سودا کے کلام کی تاریخی ترتیب یا دوسرے الفاظ میں بعض تخلیقات شعری کا ادواری تعین اس نہج پر کیا ہے:

سنہ ۱۱۶۱ھ سے قبل کا کلام (بمقام دہلی) عہد محمد شاہی۔ سودا کا ممدوح بسنت خاں خواجہ سرا تھا۔ محمد شاہ کی وفات سنہ ۱۱۶۱ھ میں ہوئی۔ اس لحاظ سے جو قصیدے بسنت خاں کی مدح میں لکھے گئے وہ یقیناً سنہ ۱۱۶۱ھ سے قبل کے ہیں۔

سنہ ۱۱۶۵ھ سے قبل کا کلام۔ میر تقی میر اور خواجہ خاں حمید کے تذکرے اسی سال کی تالیف ہیں۔ ان میں جو کلام درج ہے اس کے متعلق یقین ہے کہ وہ سنہ ۱۱۶۵ھ سے قبل کا ہے۔ ان دونوں تذکروں میں ٦٦ غزلوں کے اشعار ہیں۔ اس کے سوا دو رباعیاں بھی ہیں اور قصیدۂ تضحیک روزگار کا بھی ذکر ہے۔

سنہ ۱۱۶۷ھ تا سنہ ۱۱۷۵ھ کا کلام بمقام فرخ آباد۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں سودا کا قیام فرخ آباد میں ہے مہربان خاں رند اور احمد خاں بنگش کی تعریف میں جو قصائد اور دوسری نظمیں وغیرہ موجود ہیں وہ سب اسی زمانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ بعض ہجویات کا بھی اسی دور سے تعلق ہے۔

۱۱۶۸ھ سے قبل کا کلام۔ قائم نے اپنا تذکرہ ۱۱۶۸ھ میں ترتیب دیا ہے۔ اس میں جو کلام درج ہوا ہے وہ اس سن سے قبل کا ہے۔ اس میں سے بعض غزلیں وغیرہ اس سے قبل تذکروں میں آگئی ہیں۔ لیکن غیر مشترک کلام بھی کافی ہے اور بعض نظموں وغیرہ کے نام بھی اس میں ملتے ہیں۔ یہ کلام غالباً قیام دہلی کے زمانہ کا ہے اس لئے کہ قائم نے لکھا ہے کہ مرزا ابھی‌ابھی فرخ‌آباد گئے ہیں۔

۱۱۷۴ھ سے قبل کا کلام۔ حبیب گنج والا نسخہ ۱۱۷۴ھ میں تحریر ہوا۔ اس میں وہ کلام درج ہے جو کاتب کے پاس جمع تھا۔ اس میں غزلیں، قصیدے، مثنویات، مسدس، مخمس وغیرہ ہیں۔ اس کے متعلق بھی قیاس ہے کہ وہ سودا کے قیام دہلی سے تعلق رکھتا ہے۔

سنہ ۱۱۷۵ھ سے قبل کا کلام۔ شفیق اورنگ آبادی نے اپنا تذکرہ ۱۱۷۵ھ

میں لکھا ہے. اس کی نظر سے سودا کا کلیات گذر چکا تھا. اس نے میر اور گردیزی کے انتخاب کردہ اشعار کے علاوہ کچھ اور بھی کلام بطور نمونہ درج کیا ہے اور چند نظموں کے نام بھی بتائے ہیں. یہ مشترک اور زائد کلام بھی قیام دہلی کے زمانہ کا معلوم ہوتا ہے.

سنہ ۱۱۸۵ھ تا سنہ ۱۱۸۸ھ. شجاع الدولہ کے زمانہ میں سودا کا قیام فیض آباد میں تھا. ان کی مدح میں جو قصیدے اور قطعے وغیرہ ہیں وہ سب اسی زمانہ کے ہیں. ان کے سوا چند ہجویات بھی ہیں جو ہم عصر شعرا وغیرہ کے حق میں کہی گئی ہیں. ان ہجویات میں اس مقام اور زمانے کی شہادت مل جاتی ہے.

۱۱۸۸ھ سے قبل کا کلام. اس سنہ میں تذکرے لکھے گئے. ایک تو قدرت اللہ شوق کا طبقات الشعرا، دوسرے میر حسن کا تذکرۂ شعرائے اردو. شوق نے پہلی مرتبہ سنہ ۱۱۸۸ھ میں اپنا تذکرہ لکھا. پھر سنہ ۱۲۰۹ھ میں اس میں معتدبہ اضافہ کیا. میر حسن نے ۱۱۸۸ھ سے قبل بہ زمانۂ شجاع الدولہ اپنا تذکرہ لکھنا شروع کیا تھا اور سنہ ۱۱۹۴ھ تک وہ لکھتا رہا. ان دونوں تذکروں میں جو کلام موجود ہے وہ سنہ ۱۱۸۸ھ سے قبل کا ہے[1]

سنہ ۱۱۸۸ھ تا ۱۱۹۵ھ. آصف الدولہ سنہ ۱۱۸۸ھ میں مسند نشین ہوئے. ان کے زمانہ میں سودا سنہ ۱۱۹۵ھ تک زندہ رہے. اس عرصہ میں ان کے ممدوحین میں خود نواب وزیر، ان کے نائب سرفراز الدولہ حسن رضا خاں اور ان کے درباری ریزیڈینٹ مسٹر جانسن ہیں. ان کی مدح میں سودا کے کئی قصیدے ہیں. ان کے سوا چند قطعات اور نظمیں ہیں جن سے قیام لکھنو کا صاف طور پر ثبوت ملتا ہے.[2]

شیخ چاند نے جس اسلوب پر سودا کے کلام کی تاریخی ترتیب اور ادواری ترتیب کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اس پر سودا کے بعض معاصرین میر، قائم، میر ضیا، میر سوز اور ان کے بعد کے بہت سے شعرا مثلاً، مصحفی، انشا، جرأت رنگین وغیرہ کے کلام کی تاریخی ترتیب قائم کی جاسکتی ہے.

غالب اس بارۂ خاص میں ایک مثالی شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے

---

۱ یہاں یہ سوچنے کی گنجائش ہے کہ میر حسن کے تذکرہ کے زمانۂ تکمیل تک اس دور کے کلام کے زمانی تعین کو محیط ہونا چاہئے.

۲ شیخ چاند، سودا ص ۲۸ ـ ۱۲۳

کلام کی تاریخی ترتیب ان کے مختلف قلمی نسخوں اور تذکروں کی مدد سے آج نسبتہً آسانی سے کی جاسکتی ہے۔

مرزا غالب نے بدو شباب سے شعر کہنا شروع کردیا تھا۔ اسی کے ساتھ وہ ابتدائے زمانۂ شاعری سے اپنے اشعار کی ترتیب کی طرف متوجہ ہوگئے جس کے ایک ثبوت کے طور پر نو دریافت بیاض کو پیش کیا جا سکتا ہے، جس کا مبیضہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور نثاراحمد فاروقی کے خیال کے مطابق سنہ ۱۲۳۱ھ تک تیار کرلیا گیا تھا۔ اس بیاض کو غالب کی اپنی خود نوشت تبئیضات میں شمار کیا گیا ہے۔ (اگرچہ اس سے اختلاف بھی کیا جارہا ہے۔) بہر نوع اس بیاض میں جو کلام موجود ہے وہ سنہ ۱۲۳۱ھ مطابق سنہ ۱۸۱۶ع کا ہے۔

اس بیاض کی دریافت سے نسخۂ حمیدیہ کو غالب کا سب سے پہلا اور قدیم ترین مجموعہ خیال کیا جاتا تھا۔ اس کی ترتیب کا زمانہ سنہ ۱۱۳۷ھ ہے۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے نسخۂ حمیدیہ کے بارے میں (جسے وہ نسخۂ بھوپال کہتے ہیں) لکھا ہے کہ اردو کلام کو بہ ترتیب ردیف جمع کرنے کا کام ماہ صفر سنہ ۱۲۳۷ھ مطابق آخر اکتوبر سنہ ۱۸۲۱ع سے پہلے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ اس کی اصل کوئی مردف دیوان تھا یا وہ بیاض تھی جس میں بہ ترتیب نظم اشعار لکھے گئے تھے۔[1]

غالب نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ «۱۵ برس کی عمر سے ۲۵ برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہوگیا۔»[2]

نسخۂ شیرانی۔ سنہ ۱۲۴۲ مطابق ۱۸۲۶ع میں نسخۂ شیرانی کی تسوید عمل میں آئی۔ یہ نسخہ مولانا عرشی کے بیان کے مطابق نسخۂ بھوپال میں کی جانے والی اصلاحات و ترمیمات کا مبیضہ ہے۔ تہذیب و تنقیح کا یہ کام صفر سنہ ۱۲۳۷ھ (اکتوبر ۱۸۲۱ع) کے بعد شروع ہوا اور سفر کلکتہ سے پہلے شوال ۱۲۴۲ھ مطابق اپریل سنہ ۱۸۲۶ع میں ختم ہوا۔ اس قیاس کی وجہ یہ ہے کہ نسخۂ بھوپال کے حاشیوں اور بین السطور میں جو ترمیمیں، اصلاحیں اور اضافے ہیں نسخۂ شیرانی کا متن اس کے مطابق ہے۔ نیز غالب نے سفر کلکتہ کے آغاز میں دو غزلیں جو باندے

---

۱ دیوان غالب، نسخۂ عرشی، ص ۱۹ - ۱۸

۲ ایضاً ص ۱۴

سے کہہ کر بھیجی تھیں وہ اس کے حاشئے میں درج ہیں۔

اس دور کے کچھ کلام کی نشاندہی عیارالشعرا مولفہ خوب چند ذکا اور کم و بیش عمدۂ منتخبہ سے بھی ہوتی ہے۔ جسے اپنے مرتبہ دیوان غالب (نسخہ عرشی) میں مولانا نے ‹یادگار نالہ› کے عنوان سے پیش کیا ہے۔

غالب نے سنہ ۱۲۴۳ھ مطابق سنہ ۱۸۲۸ع تا سنہ ۱۲۴۵ھ مطابق سنہ ۱۸۲۹ع اپنے سفر کلکتہ کے دوران مولوی سراج الدین احمد کی فرمایش پر اپنے فارسی اور اردو دیوان کا ایک انتخاب گل رعنا کے نام سے کیا۔ اس میں اردو اشعار کی تعداد ۴۵۴ ہے۔[1]

کلکتہ سے واپس آنے پر مرزا صاحب نے اپنے انتخاب اول پر نظر ثانی کرکے ایک اور مختصر دیوان مرتب کرلیا۔ اس دیوان حال کے قدیم ترین مخطوطہ (مخزونہ رضا لائبریری، رامپور) کے اشعار کا مقابلہ «گل رعنا» کے حصۂ اردو سے کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ گل رعنا کے ۴۵۴ اشعار میں سے صرف ۲۵، ۳۰ شعر گرائے گئے تھے اور سابق غزلوں کے مزید شعر چن کر اور نئی غزلوں کے کل شعر ایزاد کرکے غزلوں کے اشعار کی تعداد کو ۹۷۸ کردیا گیا تھا۔ اس سے قطع نظر، میرزا صاحب نے قدیم دیوان کے تین قصیدوں میں سے دو انتخاب میں شامل کرلئے ہیں۔ ان کے اشعار کی تعداد ۱۷۷ ہے۔[2] سنہ ۱۸۶۶ع مطابق سنہ ۱۲۸۳ھ میں نواب رامپور کی فرمایش پر غالب نے اپنے کلام کا ایک اور انتخاب کرکے رامپور بھیجا تھا۔ اس کا پہلے نسخہ سے تقابل کرکے یہ جانا جاسکتا ہے کہ اس اثناء میں مزید کچھ چیزوں کا اضافہ ہوا یا نہیں۔

علاوہ بریں اس دور میں غالب کے اشعار کا کچھ حال، آثار الصنادید، سیر المحتشم، گلستان سخن، گلستان بے خزاں، گلشن ہمیشہ بہار وغیرہ سے ہوسکتا ہے۔ نیز اسی طرح کے خطی و قلمی نسخوں وغیرہ سے ان کے فارسی اشعار کے ادواری تعین اور زمانی ترتیب کے سلسلے میں مدد لی جاسکتی ہے۔

شعری متون کے علاوہ، جیسا کہ اس سے پیشتر بھی اشارہ کیا جاچکا ہے، تذکروں اور بعض دوسری نوعیت کی کتابوں کے ضمن میں بھی اس طرح کا ادواری

---

۱ دیوان غالب، نسخۂ عرشی، دیباچہ ص ۲۱

۲ دیوان غالب، نسخۂ عرشی، دیباچہ، ص ۲۲

تعین بعض صورتوں میں ممکن ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر حال ہی میں راقم الحروف نے ایک تاریخی مخطوطہ (کتاب الشہادت) کا ترجمہ فارسی سے اردو میں کیا ہے۔ اس کی ترتیب دو مرتبہ عمل میں آئی ہے۔ جس کا اندازہ اس کے مؤلف شاہ عبدالستار علوی القادری کے دیباچہ سے ہوجاتا ہے جس میں سنہ ترتیب کی واضح طور پر نشان دہی کی گئی ہے:

> « برائے استفادہ آثار و اذکار مجاہدین و غازیان اسلام ... درین اوراق نگارش یافتہ در شہر نہم شوال المکرم سال نہ صد و پنجاہ و پنج ہجری مقدس۔ »[1]

اس کی ترتیب ثانی شاہ غلام شرف علوی کی وساطت سے عمل میں آئی جنھوں نے اپنی جانب سے سپرد قلم کئے جانے والے دیباچہ میں اس کی وضاحت کی ہے:

> « بشرف ارادت چندے از اذکار مجاہدین اسلام... در سال یکہزار و یک صد و سی ہجری النبوی صلعم در تحریر یافت۔ »[2]

ترتیب اول اور ترتیب ثانی کے مابین پونے دو سو برس کا فاصلہ ہے۔ اگر اس کتاب کے ایک سے زیادہ قلمی نسخے موجود ہوتے تو ان کے تقابلی مطالعہ کے ذریعہ یہ جانا جاسکتا تھا کہ پہلی اور دوسری ترتیب کے مشتملات میں کیا فرق تھا۔ ایسی مثالیں فرق مراتب کے ساتھ اور بھی مل جائیں گی۔

استقرائی تعین:

کسی متن کے زمانۂ ترتیب کے تعین کی ایک صورت استقرائی تعین ہے۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ کسی متن کے مضامین و مطالب یا دیگر شواہد کی مدد سے یہ کہا جاسکے کہ اس کا زمانۂ ترتیب یہ نہیں، یہ ہونا چاہئے۔ اس کی ایک نمایاں مثال کے طور پر ہم دکنی نثر کی مشہور کتاب معراج العاشقین کو سامنے رکھ سکتے ہیں، جس کا ایک قلمی نسخہ حضرت سید محمد بندہ نواز گیسو دراز متوفی ۸۲۵ھ کے رسائل کے ساتھ ملا تھا۔ اس کی بناء پر یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ

۱　تاریخ محمودی، ص ۳۰

۲　ایضاً، ص ۲۹

یہ حضرت کی تصنیف ہے ۔ بعد میں اس کے دو قلمی نسخے اور دریافت ہوئے ۔[1] لیکن یہ مسئلہ جوں کا توں رہا اور اس کا ذکر حضرت کی اردو تصانیف کے سلسلہ میں آتا رہا ۔ مگر حال ہی میں ڈاکٹر حسینی شاہد نے اپنے ایک مضمون (کلمۃ الحقائق اردو نثر کا پہلا مستند نقش) میں تحقیقی تجزئے کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ معراج العاشقین حضرت بندہ نواز کی تصنیف نہیں بلکہ اس رسالہ کے مصنف سید شاہ مخدوم حسینی ہیں جو پیر اللہ حسینی سے بیعت و خلافت رکھتے تھے ۔ پیر اللہ حسینی کو میراں جی خدا نما (متوفی ۱۰۷۳) سے اور ان کو حضرت امین الدین اعلی (متوفی ۱۰۸۶ھ) سے خلافت و اجازت حاصل تھی ۔ اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر حسینی شاہد نے لکھا ہے :

«معراج العاشقین کو ابھی تک حضرت خواجہ بندہ‌نواز کی تصنیف اور اردو کا پہلا نثری رسالہ سمجھا جاتا رہا ہے ۔ کسی نے اس کی زبان ، مضامین ، ناقص ترتیب ، الجھی ہوئی اور بے ربط عبارتوں پر توجہ نہیں دی ۔ اس رسالہ کی صرف تعلیمات پر ہی غور کیا جاتا تو معلوم ہوتا کہ حضرت بندہ نواز سے اس کا کوئی تعلق نہیں ، بلکہ یہ حضرت امین الدین علی اعلی کا اجتہاد ہے جس کو ان کے خانوادے اور ان کے سلسلے کے پیران طریقت نے اپنے نظم و نثر کے رسائل میں بالالتزام پیش کیا ہے ۔»[2]

« معراج العاشقین کوئی مستقل رسالہ نہیں ہے بلکہ قلادۃ الوجود مصنفہ شاہ مخدوم حسینی بلکانوری کا خلاصہ ہے اور یہ تلخیص بھی سلیقہ سے نہیں کی گئی ہے ۔ غرض یہ اور اسی طرح کے متعدد داخلی شواہد ایسے ملتے ہیں جن کی بنا پر (اس کے) سنہ کتابت سنہ ۹۰۶ ھ کی اہمیت ختم ہوجاتی ہے ۔ »[3]

---

۱ سید مبارز الدین رفعت نے اپنے ایک مضمون « قدیم اردو پر ایک تنقیدی نظر » میں اس سے متعلق موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے :

« معراج العاشقین کے دو اور نہایت [اہم ؟] قلمی نسخے پچھلے چند سالوں میں دریافت ہو گئے ہیں ۔ ایک نسخہ جامعۂ میسور کے کتب خانے اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں ، اور دوسرا کتب خانۂ سالار جنگ ، حیدرآباد ، دکن ، میں ۔ عبدالحق کے مرتبہ اور مطبوعہ نسخے سے ان نسخوں کا مقابلہ کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ عبدالحق کا مرتبہ متن ایک ضخیم کتاب کا صرف ایک جزو ہے ۔ »

(نوائے ادب ، بمبئی ، جنوری ۱۹۶۷ ، ص ۳۸)

۲ نوائے ادب ، بمبئی ، جولائی ۱۹۷۰ع ، ص ۱۰

۳ ایضاً ، ص ۱۹

کتب و رسائل کے قلمی نسخوں پر غلط سنین کے اندراج اور غلط انتسابات پر ڈاکٹر حسینی شاہد نے اپنے مضمون میں کئی مثالیں پیش کرتے ہوئے بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ:

«جس کسی نے دکنی نظم و نثر کے قلمی رسائل کا وسیع مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے کہ محض سرنامہ یا ترقیمہ میں کسی نام کا ہونا رسالے کو اس نام سے منسوب کرنے کا قطعی ثبوت نہیں ہوتا۔ دکھنی رسائل کے انبار میں ایسے رسائل کی کمی نہیں جن کے متعدد نسخوں پر مصنف کی حیثیت سے مختلف نام ملتے ہیں۔ انتساب کی ان غلطیوں کے مختلف اسباب ہوتے ہیں۔ منجملہ ان کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ کاتبوں نے نام، لقب، عرف یا ان کے کسی جزو کے اشتراک کی وجہ سے ایک مصنف کو دوسرے سے خلط ملط کردیا ہے... بندہ‌نواز سے منسوب رسائل بھی اس غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں۔»[1]

اس نوعیت کی ایک مثال قصۂ مہرافروز و دلبر کی صورت میں سامنے آئی ہے۔ اس پر حال ہی میں نثار احمد فاروقی نے ایک تحقیقی مضمون قلمبند کیا ہے۔ انہوں نے قصہ کے مصنف کے بارے میں اس کے فاضل مرتب ڈاکٹر مسعود حسین خاں سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

«مجھے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے کہ عیسوی خاں کا قلعہ سے گہرا تعلق رہا ہے اور اس نے یہ قصہ کسی وقت سنہ ۱۷۳۲ع تا سنہ ۱۷۵۹ کے درمیان لکھا ہوگا۔»[2]

اس ضمن میں انہوں نے لکھا ہے:

«اس کتاب کو عیسوی خاں کی تصنیف کہا گیا ہے۔ سر ورق پر بھی یہی نام چھپا ہے۔ لیکن اصل مخطوطے کے متن میں کہیں عیسوی خاں کا نام نہیں آیا۔ پہلے صفحہ پر (جس کا عکس شامل کتاب ہے) «قصہ عیسوی خاں کا» لکھا ہوا ہے۔ اس ایک موقع کے سوا اور کہیں یہ مذکور نہیں کہ تصنیف کرنے والا کون ہے۔ پہلے ورق کے یہ الفاظ بھی کسی دوسرے کے قلم سے ہیں یعنی متن کتاب کے خط

---

۱ نواے ادب، بمبئی، جولائی ۱۹۷۰ع، ص ۱۷

۲ فکر و نظر، علی گڑھ، ۱۹۷۱ع، شمارہ ۳ ص ۳۲

سے مختلف خط ہے ۔ ثانیاً ان الفاظ سے لازماً یہ مطلب نہیں نکلتا کہ یہ قصہ « تصنیف عیسوی خاں » ہے ۔ »[1]

آگے چل کر مقالہ‌نگار نے خود ہی اس سلسلے کے دو بنیادی سوال اٹھائے ہیں :

« اس بحث کے بعد بھی دو بنیادی باتیں حل نہیں ہوسکیں ، ایک تو یہ کہ یہ عیسوی خاں کون تھے ، دوسرے ان کا زمانہ کیا ہے ۔ کتاب چونکہ اردو کی قدیم بولی میں ہے اس لئے زمانے کی اہمیت خاص طور سے اور بھی بڑھ جاتی ہے . . . جب کھلی شہادت یا سند موجود نہ ہو تو قرائن ہی رہنمائی کرتے ہیں ۔ »[2]

اس سلسلے میں فاضل مقالہ نگار نے لکھا ہے :

(۱) « اس امر کی قوی شہادت موجود نہیں کہ عیسوی خاں (یا عیسیٰ‌خاں) ہی قصے کے مصنف ہیں ۔ اگر ہیں تو انھوں نے اس قصے کو تصنیف نہیں کیا بلکہ یہ داستان گو تھے اور کسی شخص نے ان کی داستان کو اس التزام کے ساتھ لکھ لیا ہے کہ جس طرح وہ بولتے جائیں ویسے ہی الفاظ لکھ لئے جائیں ۔

(۲) « اس قصے کا لسانیاتی مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ اس کا لکھنےوالا (یا بولنے والا) مغربی اضلاع کا باشندہ ہے ۔ اس کی زبان پر میرٹھ ، مظفر نگر ، سہارن پور ، مراد آباد اور بجنور کی بولیوں کا گہرا اثر معلوم ہوتا ہے ۔ »

اس بارۂ خاص میں صاحب مقالہ نے اس حقیقت کا پتہ چلایا کہ سادات کا ایک چھوٹا سا خاندان کشمیر سے آکر دہلی میں بس گیا تھا ۔ اس خاندان کے ایک فرد عیسی خاں بھی تھے ۔ ان کی بہن کی شادی شاہ سلیمان ، ساکن جلال آباد ، ضلع مظفر نگر ، سے ہوئی تھی ۔ ان کے بطن سے میر فریدالدین پیدا ہوئے ۔ ان کا تخلص آفاق تھا ۔ خود عیسی خاں کے ایک فرزند امیر بخش تھے ۔ یہ شہرت تخلص کرتے تھے ۔ یہ دونوں حضرات تذکرۂ مجمع الانتخاب (زمانۂ تالیف ۱۸۰۳ع ـ ۱۲۱۸ھ) کی تالیف سے دو سال قبل حیدر آباد پہنچے تھے ۔ صاحب تصنیف تھے ۔ ان کی بعض تصانیف مشترک بھی ہیں ۔ عیسی خاں بھی ان کے ساتھ ہی حیدر آباد گئے ۔

---

۲ فکر و نظر ، ص ۲۶

۱ ایضاً ، ص ۳۵

اس سے پہلے یہ دہلی میں شاہ کمال کی اطلاع کے مطابق شاہ نظام الدین کے نائب تھے جو مادھو جی سندھیا کے اقتدار کے زمانہ میں دہلی کے صوبیدار رہ چکے تھے. جب سنہ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے دہلی کو فتح کر لیا اور مرہٹوں کے اقتدار کا خاتمہ ہوگیا تو شاہ نظام الدین دہلی سے گوالیار چلے گئے. میر سید علی غمگین انہیں میر نظام الدین کے بھتیجے تھے جن کے کتب خانے میں قصۂ مہر افروز و دل بر محفوظ رہا ہے اور جسے غمگین دہلوی کے سجادہ نشین غنی محمد حضرت جی نے ۷ مئی ۱۹۲۹ء کو آغا حیدر حسن کو نذر کیا تھا.

ان مضامین تک رسائی کے بعد مقالہ نگار نے مخطوطہ کے صفحۂ اول پر لکھی ہوئی اس عبارت کی روشنی میں «مالک اس کتاب کا نائب صاحب جو کوئی دعوی کرے سو جھوٹا ہے» یہ فیصلہ دیا ہے کہ نائب صاحب سے یہاں عیسی خاں مراد ہیں. یہ کتاب ان کی ملکیت رہی ہے. کسی نے بعد میں اس پر قصۂ عیسوی خاں بہادر لکھ دیا ہے اور سہواً عیسی خاں کی بجائے عیسوی خاں قلم سے نکلا ہے یا عرفاً یہ اسی طرح پکارے جاتے ہوں گے.[1] اور یہی اس کے مصنف ہونے چاہئیں. چنانچہ انھوں نے لکھا ہے کہ

> «میرا گمان ہے کہ عیسوی خاں یا عیسی خاں نے ہی یہ داستان لکھوائی ہے اور یہ انیسویں صدی کے آغاز یا اٹھارھویں صدی کے عشرۂ آخر میں لکھی گئی ہے.»[2]

اس نوعیت کی مثالیں اور بھی مل سکتی ہیں کہ ایک شخص نے کسی داستان کو باقاعدہ طور پر ترتیب نہ دیا ہو بلکہ املا (Dictate) کرایا ہو. اور ایک مثال تو اسی دور کی ہے جس میں نثار صاحب کے استقرائی تعین کے تحت مذکورہ داستان وجود میں آئی ہے. یہ مثال «عجائب القصص» ہے جس کے مصنف شاہ عالم ثانی ہیں. اس پر تحقیقی نظر ڈالتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے:

> «اس کی ترتیب میں کسی مددگار کی شرکت قرین قیاس ہے اور دیباچہ کے ایک فقرے سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے: (جب چند

---

۱ فکر و نظر، ص ۴۱ - ۳۵

۲ ایضاً، ص ۴۱

دیوان بزبان فارسی و بہ زبان ریختـــہ [بموجب] ارشاد حضور والا مرتب ہوئے ۰ ۰ ۰ یکایک یہ مزاج اقدس ارفع اعلیٰ میں آیا کہ قصہ زبان ہندی میں بہ عبارت نثر لکھئے ۔)

« ارشاد حضور والا سے یہ راز ظاہر ہوتا ہے کہ جس شخص نے بادشاہ کے دیوان فارسی و ریختہ مرتب کئے ہونگے اس نے بادشاہ کی زبان سے سن کر یہ کہانی بھی لکھی ہوگی ۔ »[۱]

اس کی ایک اور مثال پرتھی راج روی سے پیش کی جاسکتی ہے ۔ اس قدیم شعری تصنیف کے لئے یہ دعوی کیا جاتا رہا ہے کہ یہ پرتھوی راج کے درباری شاعر چند کوی کی یادگار تصنیف ہے ۔ اسی لئے دیسی زبانوں میں اس کو سب سے قدیم کتاب کا درجہ دیا جاتا ہے ۔ تاریخی لحاظ سے راجپوتانے کے اکثر راجپوت خاندانوں کے زمانے اور نسب ناموں کے سلسلہ میں اسے ایک نہایت قدیم ماخذ کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے ۔

پچھلی صدی عیسوی میں یہ تصنیف خاص طور پر مغربی مستشرقین میں بہت مقبول رہی اور اس کی داستانوں کے تراجم اہل مغرب کے قلم سے نکل کر علمی رسائل میں شائع ہوتے رہے ، یہاں تک کہ مشہور مستشرق جان بیمز نے اس کے قواعد صرف و نحو بھی شائع کر دئے ۔ لیکن سنہ ۱۸۸۲ء میں کوی راج شیامل داس جی نے اس پر ایک عالمانہ و محققانہ مضمون لکھ کر اس کے مطالعے کی تاریخ میں بقول پروفیسر محمود شیرانی ایک تغیر عظیم پیدا کردیا اور یہ ثابت کیا کہ راسا ایک جعلی تصنیف ہے اور تاریخی اعتبار سے اس کی داستانیں بالکل من گھڑت اور فرضی ہیں ۔

پروفیسر محمود شیرانی نے اس پر اپنی کتاب پرتھی راج راسا میں ہر پہلو سے تحقیقی و تنقیدی نظر ڈالی ہے اور اس کے بیانات کو معاصر شہادتوں اور تاریخی حقائق کی روشنی میں پرکھا ہے اور انھیں ساقط الاعتبار قرار دیا ہے ۔ اس ضمن میں انہوں نے خاص طور پر اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ راسا میں شہاب الدین اور اس کے امرا کے جو نام دئے گئے ہیں وہ مغل دور کے مؤرخین کی روایت اور ان ناموں سے گہری مماثلت رکھتے ہیں جو عبدالحمید لاہوری نے اپنی کتاب میں پیش کئے ہیں ۔ یہ دراصل مغل امرا کے نام ہیں اور اس طرح کے ناموں اور

---

۱ فکر و نظر ص ۴۱

خطابوں کا رواج محمد غوری کے بہت بعد مغلوں کے زمانہ میں ہوا ۔ موصوف نے لکھا ہے :

« راسا کی فہرست میں ہماری نظر سے جب ایسے نام گذرتے ہیں مثلاً میر آتش ، رومی خاں ۰۰۰ خان خانان ، خان جہاں ، تمام بیگ ، عیسی قلی تو ۔ ۔ ۔ عہد مغلیہ کا نقشہ سامنے آجاتا ہے اور بغیر کسی پس وپیش کے یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ نام سب کے سب اس دور سے تعلق رکھتے ہیں ۔ »

خود سلطان کا اپنا نام جس انداز سے راسا میں دیا گیا ہے اس سے بھی یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ راسا کوئی ہم عصر روایت نہیں بلکہ اپنے زمانۂ تصنیف کے لحاظ سے مغلوں کے عہد عظمت کی یادگار ہے ۔ پروفیسر شیرانی کا بیان ہے :

« راسا کے بیان کے مطابق سلطان کا نام شہاب الدین ہے ۔ لیکن ہمیں تاریخ سے معلوم ہے کہ یہ سلطان کا شہزادگی کا نام ہے ۔ جب وہ تخت نشین ہوتا ہے تو شہاب الدین کا نام ترک کر دیتا ہے اور معز الدین کا لقب اس کی جگہ اختیار کر لیتا ہے ۔ یہی نام اس کے عہد کے کتبوں اور سکوں میں نظر آتا ہے ۔ کتب تاریخ مثلاً تاج المآثر ، طبقات ناصری و فیروز شاہی و مبارک شاہی بھی اسے اسی نام سے یاد کرتی ہیں ۔ مگر راسا اس کو فقط شہاب الدین کے نام سے جانتا ہے اور اس کے اصل نام معز الدین سے بالکل ناآشنا ہے ۔ کیا ایک معاصر دستاویز میں ۔ ۔ ۔ ایسی فاش غلطی کا ارتکاب ہوسکتا ہے ؟ اصل یہ ہے کہ خود مغلیہ دور کے مؤرخین بابر و فرشتہ و ابوالفضل وغیرہم برخلاف قدیم مؤرخین کے سلطان کو معز الدین کے مقابلے میں ترجیحاً شہاب الدین کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ ایسے بیانات راسا کے لئے جو اکبری عہد یا اس کے بعد کی تالیف ہے گمراہی کا سامان بن گئے ۔ »[1]

پروفیسر شیرانی نے اور بھی بہت سے شواہد و نظائر اس امر کے لئے پیش کئے ہیں کہ راسا کوئی معاصر تصنیف نہیں بلکہ ایک مؤخر تالیف ہے جو دور اکبری یا عہد جہانگیری سے تعلق رکھتی ہے ۔

---

۱ پرتھی راج راسا ، ص ۱۲۸ - ۱۲۷

اجزائی تعین :

جیسا کہ الفاظ سے ظاہر ہے اس کا تعلق متن کے جزئی تعین سے ہے۔ کسی متن کے بارے میں بعض وقت یہ طے کرنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ یا اس کا بڑا حصہ کب سے کب تک یا کس زمانہ میں ترتیب پایا۔ لیکن بعض داخلی یا خارجی شواہد کی مدد سے اس کے کچھ حصوں یا اجزاے متن کے اضافہ کا تعین ہوسکتا ہے۔ مثلاً میر حسن کی مثنویاں جنھیں ان کے شعری متن یا کلیات کے اجزا بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے رموز العارفین کا سال تصنیف سنہ ۱۱۸۸ھ، گلزار ارم کا زمانۂ تالیف سنہ ۱۱۹۲ھ اور مثنوی بدر منیر کی تخلیق کا سنہ ۱۱۹۹ھ ہے۔ اگر ان کے کلیات میں شامل ان شعری تخلیقات کے علاوہ شعراے اردو کے تذکرہ کو بھی ان کے کل متن کا ایک جزو قرار دیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ اس کی اساسی روایت کا سال ترتیب ۱۱۹۲-۱۱۸۸ھ ہے۔

تذکروں میں ایسے اجزائی تعین کی بنا پر جس سے کسی روایت کی ترتیب کے زمانہ پر روشنی پڑتی ہے، فی الجملہ تذکرہ کے زمانۂ تالیف کے بارے میں بھی کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ شعری متون میں بھی ایسے تاریخی واقعات کی طرف اشاروں کی مدد سے، جو کسی شاعر کے اپنے زمانہ سے تعلق رکھتے ہوں، یا پھر بعض تاریخی قطعات کی روشنی میں، مجموعی روایت کے زمانہ پر گفتگو ممکن ہوسکتی ہے۔ ایسے مکتوبات اور خطوط کی مدد سے جن پر تاریخ موجود ہو یا پھر جن میں کسی تاریخی واقعہ کا ذکر ہو اس نوعیت کے کسی متن کا اجزائی تعین کیا جاسکتا ہے۔ ایسی مثالیں شعری و ادبی متون کے علاوہ سفرناموں وغیرہ میں بھی مل سکتی ہیں۔

اردو شعرا کے دواوین میں ہم طرح غزلوں کی ایک اچھی بڑی تعداد ملتی ہے۔ یہ اس صورت میں بھی ہوا ہے جب استادوں کی غزلوں پر غزلیں لکھی گئی ہیں۔ مگر زیادہ تر ایسی غزلیں سخن ورانہ مطارحوں، مشاعروں اور شعری معرکوں میں سامنے آئی ہیں۔ اہل تذکرہ نے بعض ایسے مواقع کی غزلوں کی نشان دہی کی ہے۔ انشا و مصحفی، آتش و ناسخ، شاہ نصیر و ذوق اور ایسے بعض دوسرے معاصر شعرا کے ما بین ہونے والے معرکوں میں جو غزلیں ہوئی ہیں وہ اپنے زمانۂ

تالیف کی طرف خود ہی اشارہ کرتی ہیں . اس کی مثالیں جہاں غزلوں پر غزلیں کہی گئی ہیں بعض شعرائے قدیم کے یہاں بھی مل جاتی ہیں . مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے مرتبہ دیوان یقین کے مقدمہ میں یقین کی ایسی غزلوں کا حوالہ دیا ہے جن پر حاتم نے غزلیں کہی ہیں اور زمانی تعین کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے :

نمبر شمار	مصرع اول غزل حاتم	غزل کہنے کا سنہ
١	ہماری سیر کو گلشن سے کوئے یار بہتر تھا	١١٦٠
٢	جی دیا حاتم نے کیا بےوقت بےجا بےطرح	١١٥٥
٣	ہو رہا ہے ابر اور کرتا ہے وہ جانانہ رقص	١١٥٨
٤	دیکھ کر بلبل لب و رخسار خوباں کی طرف	١١٥٧
٥	سینہ نالاں کا حریف اور چشم گریاں کا حریف	١١٦١
٦	دل میں یوں ہے تجھ خیال چشم کے آنے میں دھوم	١١٥٣
٧	جب سے تمہاری آنکھیں عالم کو بھائیاں ہیں	١١٥٦
٨	خدا کے واسطے کوئی مری فریاد کو پہنچے	١١٥٣ [1]

ادبی تاریخ کے ایسے جن معرکوں اور مقابلوں کے زمانہ کا تعین ہوجاتا ہے ان میں شرکت کرنے والے اشخاص کی غزلوں کے زمانہ کو آسانی سے متعین کیا جا سکتا ہے . مثال کے طور پر مولوی کریم الدین نے دہلی کالج میں جو تاریخی مشاعرہ سنہ ١٢٦٠ ھ میں کیا تھا اس کی زمین ، طرح اور اس میں شرکت کرنے والے شاعروں کا ذکر انہوں نے ان سے متعلق تراجم میں کردیا ہے .

بعض غزلوں کے ساتھ اس طرح کے اشارے کبھی کبھی قدیم مرتبین متن بھی کرجاتے ہیں . مثلاً ، ذوق کی غزل — جس ہاتھ میں خاتم لعل کی ہے گر اس میں زلف سرکش ہو — کے ساتھ نسخۂ طبع اول میں حاشیہ پر یہ اشارہ موجود ہے : « زمانہ ابتدائے سخن گوئی » . مولانا محمد حسین آزاد نے ذوق مرحوم کی متعدد تخلیقات شعری کے ساتھ ان کے زمانۂ تالیف کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور کہیں کہیں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے .

شعری متون کے سلسلہ میں قدیم اخبارات و رسائل کے مطالعہ سے بھی بعض تخلیقات کا زمانہ کم و بیش متعین ہو جاتا ہے . دہلی اردو اخبار ، فوائد الناظرین ،

١　دیوان یقین ، مقدمہ ، ص ٦٧

محب ہند ، قران السعدین وغیرہ اخبارات میں ذوق ، غالب ، مومن وغیرہ اساتذہ کا کلام وقتاً فوقتاً چھپتا رہتا تھا ، جس سے آج یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ فی الجملہ ان ادب پاروں کا زمانۂ تخلیق کیا ہے ۔ مثال کے طور پر یہاں ذوق کی بعض شعری تخلیقات کا ذکر کیا جاسکتا ہے جو دہلی اردو اخبار میں اشاعت پذیر ہوئیں :

مزے جو موت کے عاشق بیاں کبھو کرتے
دہلی اردو اخبار، ۱۴ نومبر ۱۸۴۱ ، (مخزونہ نیشنل آرکایوز، دہلی)

کرے وحشت بیاں چشم سخن گو اس کو کہتے ہیں
ایضاً ، ۳۱ اگست ۱۸۵۱ ، (مخزونہ ادارۂ ادبیات اردو ، حیدرآباد)

پائے نہ ایک ایسا بھی دن خوشتر آسماں
ایضاً ، تتمہ ۲۵ اپریل ۱۸۵۲ (مخزونہ ادارۂ ادبیات اردو ، حیدرآباد)

یہ قصیدہ شہزادہ جواں بخت کی شادی کے مبارک موقع پر بارگاہ سلطان میں نذر کیا گیا تھا ۔

ساون میں دیا پھر مہ شوال دکھائی
دہلی اردو اخبار، ۳ اگست ۱۸۵۲ (مخزونہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد)

خوش ہو اے بخت زہے آج ترے سر سہرا
دہلی اردو اخبار، ۲۸ مارچ ۱۸۵۲ (مخزونہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد)

یہ اس سہرے کے جواب میں تھا جو غالب نے ملکۂ زمانی کی فرمایش پر کہہ کر اس مبارک موقع پر پیش کیا تھا اور جس کے نتیجہ میں غالب اور بادشاہ کے مابین شکررنجی کی نوبت آگئی تھی ۔

شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت
دہلی اردو اخبار ۱۰ ستمبر ۱۸۵۴ (مخزونہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد)

اس قصیدے سے متعلق دہلی اردو اخبار نے یہ اطلاع بھی دی کہ بعد استماع اس قصیدے کے ایک گاؤں جاگیر میں استاد ممدوح کو عطا ہوا ۔

کسی متن کے اجزا سے متعلق خارجی بالخصوص معاصر تحریروں اور بیانات کا حوالہ تحقیق متن کے سلسلہ کا ایک نہایت اہم کام ہے ۔ اس سے کسی متن کے سلسلوں کی دریافت اور تحقیقی ترتیب کے ضمن میں بہت سی اہم باتیں سامنے آ

جاتی ہیں ۔ کوئی متن کس زمانہ میں زیر تالیف تھا یا کس وقت تک اس کی کون سی روایت سامنے آئی یا آچکی تھی، اس کی دریافت بعض متون کے بارے میں غیر معمولی اہمیت اختیار کرجاتی ہے ۔ اس کے ساتھ کسی متن کے بعض گم شدہ سلسلوں کی بازیافت کی جانب بھی ذہن منتقل ہوتا ہے اور تحقیق و تجسس کی راہوں کی طرف رہنمائی ہوتی ہے ۔

اضافی تعین :

کسی متن یا جزء متن کے متعلق یہ تصفیہ کہ فلاں وقت تک بہرحال اس کی تالیف عمل میں آچکی تھی ، اضافی تعین ہے ۔ کبھی تو یہ فیصلہ اس ترقیمہ سے ہو جاتا ہے جو اس کی نقل کے سنہ کو ظاہر کرتا ہے ۔ مثال کے طور پر میر کے تذکرۂ نکات الشعرا کی ترتیب کب عمل میں آئی ، اس کا حتمی فیصلہ تو موجودہ روایت کی روشنی میں ممکن نہیں ۔ آنند رام مخلص کے تذکرۂ وفات کو بنیاد مان کر یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اس کی تالیف سے میرصاحب ۱۱۶۵ھ تک فارغ ہوچکے ہوں گے ۔ مگر یہ صرف قیاس ہے ۔ اس کے مقابلے میں اس کا ترقیمۂ نقل جو طبع ثانی کے ساتھ شامل ہے اس کی طرف واضح طور پر اشارہ کرتا ہے کہ سنہ ۱۱۷۲ سے پہلے موجودہ روایت بہرحال مکمل ہوچکی تھی :

« تحریر فی التاریخ ہفدہم رمضان المبارک سنہ ۱۱۷۲ یک ہزار و یک صد و ہفتاد و دو من الہجرۃ »

معاصر تذکروں اور تحریروں میں بعض تصانیف سے متعلق اس نوعیت کے حوالے موجود ہوتے ہیں جن سے ان کی ترتیب کے زمانہ کا اضافی تعین ہوجاتا ہے ۔ یہ کسی جزئی تالیف سے متعلق بھی ہوسکتے ہیں اور کسی مکمل تصنیف کے بارے میں بھی ۔

میر نے سودا کے ترجمہ کے ذیل میں ان کے قصیدہ « تضحیک روزگار » کے بارے میں لکھا ہے :

« قصیدہ در ہجو اسپ گفتہ بہ تضحیک روزگار »[1]

یقین کے ترجمہ کے ذیل میں کلیم کے قصیدہ مسمی بہ « روضۃ الشمرا » کا

---

۱ نکات الشعرا ، طبع ثانی ، ص ۲۱

حوالہ موجود ہے :

«قصیدہ گفتہ است مسمی بہ روضۃ الشعرا درو نام تمام شعرا نقل کردہ»[1]

جعفر علی خاں زکی کے ترجمہ میں مثنوی حقہ کی تالیف کا ذکر کیا ہے :

«بادشاہ محمد شاہ بر او فرمایش حقہ کردہ بود ، دو سہ شعر موزوں کرد ، دیگر سرانجام ازو نیافت . اکنون شیخ محمد حاتم کہ احوالش نوشتہ آمد باتمام رسانید وآن مثنوی خالی از مزہ نیست»[2]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس مثنوی کا اتمام تذکرہ کی تالیف کے دوران ہوا تھا اور یہ کہ میر نے خود بھی ایسا دیکھا تھا .

محمد فقیہ صاحب دردمند کے ترجمہ میں ان کے ساقی نامہ کا حوالہ موجود ہے : « ساقی نامہ کہ در مدح ممدوح خود گفتہ ، »[3] صاحب چمنستان شعرا نے ساقی نامہ کے ۲۸ شعر نقل کئے ہیں جو اس کے متن کے استناد کے طور پر کام آسکتے ہیں .

اس طرح کی بعض مثالیں مختلف تحریروں اور تذکروں میں اور بھی مل جائیں گی . اب اگر وہ کسی معاصر متن کے بارے میں نہیں تو ان کی حیثیت تشہید متن کی سی ہوگی اور معاصر متون کے سلسلہ میں کبھی یہ مثالیں اجزائی تعین کے ذیل میں کام آئیں گی اور کبھی اضافی تعین میں . بہرحال اس طرح کی مثالوں سے متن کی تاریخ تشہید اور تنقید کے ایک سے زیادہ مسائل وابستہ ہوتے ہیں .

۱　نکات الشعرا ، طبع الثانی ، ص ۸۲

۲　ایضاً ، ص ۱۳۷

۳　ایضاً ، ص ۱۱۷

* عتیق احمد صدیقی

سر سید کا لسانی اسلوب

سر سید دہلی میں پیدا ہوئے. وہ ایک اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ تھے. یہ خاندان صرف منصب و وجاہت کا امتیاز نہیں رکھتا تھا بلکہ شرافت و نجابت اور علم و فضل کی روایت کا بھی حامل تھا. اس زمانے کے دستور کے مطابق انھوں نے عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی. ان کے والد کو اور دیگر افراد کو قلعۂ معلیٰ سے توسل حاصل تھا. قلعۂ معلی سے ان کا ربط ضبط بھی بچپن سے ہی رہا. وہ بہت کم عمری سے دربار شاہی سے انعام واکرام حاصل کرتے اور آداب شاہی بجا لاتے رہے. جب (١٨٤٢ع) انھیں شاہی دربار سے جواد الدولہ عارف جنگ کا خطاب ملا تو دہلی میں استاد ذوق کی شاعری اور زبان کا چرچا تھا. محاورہ بندی کو دلی کی زبان کا خاص جوہر سمجھا جاتا تھا. ان کی تعلیم کے آغاز کے وقت ہی دہلی کالج قائم ہوچکا تھا اور شہر میں اس کے اثرات کے چرچے ہونے لگے تھے. ان کی پیدایش سے کافی پہلے میر امن دلی والا معریٰ نثر میں دلی کی زبان کا ٹھاٹھ دکھا چکا تھا اور ان کے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی رجب علی بیگ سرور محاوروں کے ہاتھ پاؤں توڑنے کا محاورہ چست کر کے اور گویا میر امن کا جواب مسجع نثر میں لکھ کر داد سخن دے چکے تھے اور یہ طرز خاصا مقبول ہو رہا تھا.

سر سید نے اس لسانی پس منظر کے ساتھ اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز کیا. یہ سلسلہ نصف صدی سے زیادہ (١٨٤٢ تا ١٨٩٨ع) جاری رہا. ان کے توسن قلم کی جولانگاہ کوئی ایک میدان نہ تھا. ان کی تصانیف متنوع موضوعات پر مشتمل ہیں. لیکن انھوں نے نہ محاورہ بندی کے ٹھاٹھ دکھلائے نہ مرصع کاری کے جوہر، نہ زبان کا پر شکوہ انداز اختیار کیا اور نہ عالمانہ انداز. وہ زبان کو عطیۂ قدرت کے طور پر استعمال کرتے رہے جس کا مفید ترین مصرف یہ تھا کہ وہ اپنے

---

* جناب عتیق احمد صاحب صدیقی، ام. اے؛ ڈی. لنگ؛ استاد شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ؛ رکن اصطلاح سازی کمیٹی، ترقیء اردو بورڈ، دہلی.

مافی الضمیر کو ادا کریں۔ ایک طرف اسے قوم کی آواز کا ذریعہ بنائیں اور دوسری طرف اس سے قوم کی تہذیب و تربیت کا کام لیتے رہیں۔ اگر قدرت کی عطا کردہ نعمتوں کے شکر کی بہترین صورت یہ ہے کہ ان کو بہتر سے بہتر طور پر مفید مصرف میں لایا جائے تو سر سید وہ فرد فرید ہیں جو اہل اردو کی طرف سے اس عطیۂ قدرت کا شکر بجا لائے ہیں۔ وہ زندگی بھر خود حق کی جستجو کرتے رہے اور قوم کے لئے فلاح و بہبود اور خیر کی راہیں تلاش کرتے رہے۔ انھوں نے اس سماج کے مسلمات سے بغاوت کی۔ معاشرتی اور اخلاقی ضابطوں پر تنقیدی نظر ڈالی۔ اور چونکہ ہمارے معاشرے اور اخلاق کی جڑیں مذہبی تعلیمات اور روایات میں پیوست تھیں اس لئے مذہب کے از سر نو جائزے پر بھی زور دیا۔ جلاء القلوب فی ذکر المحبوب سے ان کی تفسیر القرآن تک ایک طویل سفر بھی ہے اور ذہنی انقلاب کی ایک پوری داستان بھی۔ اس کے لئے بڑی جرأت کی بھی ضرورت تھی اور تنگ نظریوں کی تمام قیود کو توڑنے کی بھی۔ انھوں نے بڑی بےباکی، صبر و تحمل اور پوری دیانت کے ساتھ اس سفر کی منزلیں طے کیں۔ ان مقاصد کے لئے ایک بات پیش نظر رہنا ضروری تھی اور وہ یہ کہ زبان ابلاغ خیال اور تبادلۂ خیال کا ذریعہ ہے اور اس کو یہی کام انجام دینا چاہئے، یعنی یہاں محض لفظوں کے طوطا مینا بنانا نہیں تھا، بلکہ ان خیالات کو جو دل کی گہرائی میں محسوس کئے گئے، اپنے مخاطبین تک پہنچا دینا تھا۔ ان خیالات کو اپنی فطری روانی میں الفاظ کا جو بھی جامہ میسر آئے اسی میں پیش کردینا تھا۔ یہاں لفظوں کی نوک پلک درست کرنے کی ضرورت بھی شاید محسوس نہیں کی گئی۔ زیادہ سے زیادہ توجہ اس امر پر مرکوز رہی کہ فطری اور سادہ ترین انداز میں کس طرح اپنی بات کہہ دی جائے، نہ صرف کہہ دی جائے بلکہ اس کی خوب وضاحت بھی کردی جائے۔

سر سید نے بہت متنوع موضوعات پر مضامین لکھے۔ ان میں معاشرتی مسائل بھی تھے اور اخلاقی بھی، سیاسی موضوعات تھے اور تعلیمی بھی، فلسفیانہ مضامین بھی تھے اور سائنسی بھی۔ لیکن مذکورہ بالا مجبوری یا مصلحت کے سبب کسی نہ کسی نوع سے ان کا تعلق مذہب سے قائم تھا۔ ان کے مخاطب بھی بالخصوص مسلمان ہی تھے جو ہر چیز کو مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھنا پسند کرتے تھے۔ اس لئے بھی موضوعات کے تمام تر تنوع کے باوجود مذہبیات ان کی تحریروں کا خاص میدان

رہا۔ انگلستان کی اصلاح معاشرت کے سلسلے میں ایڈیسن اور اسٹیل کی کوششوں کو سراہتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ ان کے خیالات کے جلد شائع ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ مذہبی بحثوں میں نہ الجھے اور اسی لئے

> «ہم بھی مذہبی خیالات سے بچنا چاہتے ہیں۔ مگر ہمارے ہاں تمام رسمیں اور عادتیں مذہب سے ایسی مل گئی ہیں کہ بغیر مذہبی بحث کئے ایک قدم بھی تہذیب و شایستگی کی راہ میں نہیں چل سکتے۔ جس بات کو کہو کہ چھوڑو، فوراً جواب ملے گا کہ مذہباً ثواب ہے، اور جس بات کو کہو کہ سیکھو، اسی وقت کوئی بولے گا کہ مذہباً منع ہے پس ہم مجبور ہیں کہ تہذیب و شایستگی اور حسن معاشرت سکھانے میں ہم کو مذہبی بحث کرنی پڑتی ہے۔»[1]

لیکن موضوعات کے اس جبر کے باوجود اپنی تحریروں میں انہوں نے زبان کا وہ اسلوب اختیار نہیں کیا جو اس دور کے علمائے مذہب کی تحریروں کا عام انداز تھا۔ انہوں نے مصطلحات کے علاوہ زبان کو عربی فارسی عناصر سے بوجھل نہیں ہونے دیا۔ ان کو احساس تھا کہ ان کا روئے تخاطب صرف خواص (اہل علم) کی طرف نہیں، بلکہ ان عوام کی طرف بھی ہے جو اپنی کم علمی کے باعث آسان زبان میں ہی بات سمجھ سکتے تھے۔ ان کو یہ بھی احساس تھا کہ وقیع ترین بات بھی گنجلک انداز بیان کی بھول بھلیاں میں اپنا وزن کھو بیٹھتی ہے۔ پھر وہ یہ بھی جانتے تھے کہ خواص اپنے زعم علم میں اکثر سیدھی، سچی اور ٹھیک باتوں کو جو نئی ہوں اور جو ان کے قدیمی مسلک کے خلاف ہوں، تسلیم نہیں کرتے، بلکہ کبھی قوت استدلال سے اور کبھی محض کج بحثی سے ان کی تردید کرتے رہتے ہیں۔ عوام میں نئے خیالات کو قبول کرنے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے یہ توقع بےجا نہ تھی کہ اگر عام فہم زبان میں بات کی جائے تو اس کی اپیل وسیع تر ہوگی۔ اسی لئے انہوں نے زیادہ سے زیادہ عام فہم انداز بیان اختیار کیا تاکہ ان تحریروں کی رسائی زیادہ سے زیادہ لوگوں تک ہو اور ان کے خیالات کا دائرۂ اثر بڑھے۔

دیکھا جائے تو اس وقت اردو کے دو لسانی اسلوب موجود تھے۔ ایک سادہ

---

۱ مقالات سرسید مرتبہ عبداللہ خویشگی، ص ۴۸

و پرکار — اپنے دامن میں اردو کے رچے بسے الفاظ و محاورات کو لئے رواں دواں ، دوسرا مرصع و پرشکوہ — فارسی الفاظ و تراکیب سے بوجھل ، لفظی اور معنوی صنعتوں کا انبار لئے ہوئے . ایک کے نمایندہ میر امن کہے جاسکتے ہیں اور دوسرے کے تحسین و سرور. ان میں واضح فرق موجود تھے اور مختلف حلقوں سے ان کی داد بھی دی گئی اور ان کی تقلید بھی کی گئی . ان سے ہٹ کر ایک انتہا انشا کی رانی کیتکی کی کہانی میں بھی دیکھی جاسکتی ہے. لیکن یہاں دو باتیں قابل لحاظ ہیں . ایک تو یہ کہ ان سب مصنفین کے موضوعات صرف داستان تک محدود ہیں . اس محدود میدان میں وہ اپنے اپنے اسلوب کو نبھا سکے . یہ کہنا مشکل ہے کہ ان میں سے کوئی اسلوب متنوع موضوعات کا کہاں تک ساتھ دے سکتا تھا ، اور معاشرے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں اور پھیلتی ہوئی ضرورتوں کو کہاں تک پورا کر سکتا تھا . لیکن یہ مسلم ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی اردو کے لسانی جینیس سے ہم آہنگ نہیں تھا . ایک بہت سپاٹ تھا تو دوسرا بہت مرصع ' یہاں ایک کا جھکاؤ بائیں طرف زیادہ تھا تو دوسرے کا دائیں کا طرف. ضرورت توازن کی تھی . سرسید کی تحریر سے یہ توازن پیدا ہوا . اس کی ایک وجہ تو وہی قرار دی جاسکتی ہے جس کا اوپر ذکر ہوا ، یعنی موضوعات کا تنوع. دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے ان موضوعات کے بارے میں « طریقۂ راسخۂ قدیمہ » پر نہیں سوچا ، بلکہ ان پر نئے حالات ، نئے علوم اور نئے انداز فکر کی روشنی میں نظر ڈالی. اس نے بہتوں کو چونکایا اور اختلافات کا ایک لاوا ابل پڑا . ان مختلف فیہ مسائل پر گفتگو کرنے اور اپنی بات کو دوسروں کے لئے قابل قبول بنانے کے لئے قوی استدلال کی ضرورت تھی. انہوں نے اپنے ہر خیال کے لئے بیش از بیش دلیلیں فراہم کیں ، ان کے لئے عملی اور نظریاتی زندگی سے مثالیں بہم پہنچائیں. ان دلیلوں اور مثالوں کے ساتھ وہ جو بات پیش کرتے ہیں اس کو منوا لینا چاہتے ہیں . شاید اس لئے بھی کہ یہ انہوں نے دیانت کے ساتھ سوچی ہے اور ان کو اس کی صداقت اور افادیت کا کامل یقین ہے . حالی نے اسی کو ان کی « خود رائی » سے تعبیر کیا ہے. لیکن یہاں محض خود رائی کا معاملہ نہیں ہے . وہ اپنی ہر بات کے لئے قوی استدلال پیش کرتے ہیں . استدلال کی توانائی کی مختلف سطحیں ہیں. ایک داخلی جس کا دار و مدار کلام کی معنویت پر ہوتا ہے . دوسرے خارجی جو معنویت سے قطع نظر

صرف لفظوں پر مبنی ہوتی ہے۔ ان دو کے درمیان ایک اور سطح بھی ہے جہاں عبارت اور الفاظ استدلال کی داخلی توانائی میں اضافہ کا سبب بن جاتے ہیں۔ سر سید استدلال کی معنوی توانائی کو نثر کے اسلوب سے بھی تقویت بہم پہنچاتے ہیں۔ اپنی رائے کو قوت کے ساتھ پیش کرنے میں انہوں نے زبان سے کس طرح کام لیا، ذیل کے اقتباسات میں ملاحظہ فرمائیے:

(۱) «کوئی عزت اور کوئی بزرگی اور کوئی تقدس اور کوئی صداقت اسلام کی اور بانیء اسلام کی اس سے زیادہ نہیں ہوسکتی جو اس نے بغیر کسی لا و لپیٹ کے اور بغیر کسی دھوکہ دینے کے اور بغیر کسی کرشمہ و کرتوت کا دعوی کرنے کے صاف صاف لوگوں کو بتادیا کہ معجزے وعجزے تو خدا کے پاس ہیں۔ میں تو مثل تمہارے ایک انسان ہوں۔ خدا نے میرے دل میں جو وحی ڈالی ہے اس کی میں تم کو تلقین کرتا ہوں۔»[1]

(۲) «اگلے خاندان جن کو ہزاروں کا مقدور تھا، معاش سے بھی تنگ تھے اور یہ ایک اصلی سبب ناراضیء رعایا کا گورمنٹ سے تھا۔ لوگوں کے دل جو تبدل عملداری کو چاہتے تھے اور نئی عملداری کے راغب اور دل سے اس لئے خوش تھے، میں سچ کہتا ہوں اسی سبب سے تھے۔ ہم سچ کہتے ہیں اور پھر ہم سچ کہتے ہیں کہ ہم بہت سچ کہتے ہیں کہ جب افغانستان سرکار نے فتح کیا لوگوں کو بڑا غم ہوا۔»[2]

(۳) «اگر تمام ہندوستان کے حالات بغاوت پر نظر کی جائے تو ہم کو یقین ہے کہ دونوں قومیں جو ہندوستان میں بستی ہیں برابر بلکہ ایک سے زیادہ ایک اور ایک سے زیادہ ایک اس فساد میں نظر پڑیں گی۔»

پہلا اقتباس تفسیر القرآن کے اس مقام سے ہے جہاں وہ سورۃ انعام کی آیت (وقالوا لولا نزل علیہ آیۃ من ربہ۔ قل ان اللہ قادر علی ان ینزل آیۃً ولکن اکثرھم لا یعلمون) کی تفسیر کے سلسلے میں معجزات اور ان کی حقیقت سے بحث

---

۱ تفسیر القرآن، جلد ۳، ص ۲۹

۲ اسباب بغاوت ہند، مشمولہ حیات جاوید، ص ۹۱۴

۳ ایضاً، ص ۹۲۴

کر رہے ہیں۔ اس عبارت کے پہلے فقرے «کوئی عزت اور کوئی بزرگی اور کوئی تقدس اور کوئی صداقت اسلام کی اور بانیء اسلام کی اس سے زیادہ نہیں ہوسکتی» پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دو لفظوں یعنی «کوئی» اور «اور» کی تکرار سے ایک خاص فضا پیدا ہوئی ہے۔ «کوئی» میں جو تعمیم ہے وہ ایک ہمہ جہتی تصور دیتی ہے۔ عزت و بزرگی اور تقدس و صداقت اگرچہ اضافت کے ذریعہ اسلام اور بانیء اسلام کے ساتھ مربوط ہیں، لیکن اس مخصوص ربط کے بعد ان کے اندر ایک عمومیت پیدا ہوئی ہے کہ ان صفات کو کسی بھی حد تک بڑھائیے، ان پر کسی بھی نقطۂ نظر سے غور کیجئے اور ان کی کتنی بھی مبالغہ آمیز صورت تصور کیجئے، وہ اس مقررہ دائرے سے باہر نہیں ہوسکتی۔ یہاں گویا مصنف کے ذہن میں ان صفات کے وہ تمام تصورات موجود ہیں جو مختلف زمانوں میں، مختلف طبقوں اور مختلف نقطۂ نظر رکھنے والوں کی طرف سے پیش کئے جاتے رہے ہیں۔

خود مصنف کے ذہن میں جو تصور ہے وہ گویا ان سب پر حاوی اور ان سب سے بڑھ کر ہے۔ یہ ایک مصلح کا ذہن ہے جو جزئیات سے ہٹ کر کلیات پر اصرار کرنا چاہتا ہے۔ اس کو یقین ہے کہ کلیات تسلیم ہوجائیں تو جزئیات خود بخود انہیں کے ذیل میں آجاتی ہیں۔ پھر یہ تعمیم کسی ایک خصوصیت میں نہیں ہے، بلکہ تعمیم میں ہر ایک خصوصیت الگ ہے اور «کوئی» کی تکرار سے اسی پر زور دیا گیا ہے۔ دوسرا لفظ جس کی تکرار ہوئی «اور» ہے۔ یہاں عطف کے ذریعہ جن لفظوں کو جوڑا گیا ہے وہ مترادفات نہیں ہیں، لیکن کیا کسی کو کسی پر ترجیح حاصل ہے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف ان میں سے ہر ایک کو برابر کی اہمیت دینا چاہتا ہے، گویا ان میں سے ہر ایک مستقل بالذات اور مساوی درجہ کا حامل ہے۔ وہ خصوصیات جو ان کے ذریعہ بیان کی گئی ہیں، اگرچہ ایک کل بناتی ہیں، لیکن ان سب پر الگ الگ توجہ کی بھی ضرورت ہے۔ یہاں بآسانی فارسی عطف «و» کا بھی استعمال ہو سکتا تھا لیکن اس سے لفظوں کی اتنی واضح علاحدگی کا تصور نہیں ابھر سکتا تھا اور ان صفات کے گڈ مڈ ہوجانے کا امکان تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ان کی معاویانہ حیثیت متأثر ہو۔ «اور» کے استعمال سے ان سب امکانات پر حسب منشا قابو پا لیا گیا ہے۔ پھر اس میں جو روانی پیدا

ہوتی ہے وہ میدانی دریا کی سبک اور خاموش روانی نہیں ہے، بلکہ کوہستانی دریا کی روانی ہے جو رکاوٹوں کے ساتھ جاری رہتی ہے اور جس میں گھن گرج اور تیزی ہوتی ہے — ایسی تیزی جو اپنے ساتھ خس و خاشاک ہی کو نہیں بلکہ بڑی بڑی چٹانوں کو توڑ پھوڑ کر بہا لے جاتی ہے. یہ انداز ان کے اس ذہن کا بھی غماز ہے جو اپنی رائے کو بڑے وثوق کے ساتھ ٹھیک سمجھتا ہے اور اس کو منوانے کے لئے پر زور استدلال کرتا ہے. اس «اور» کی تکرار سے جو صلابت اس فقرے میں پیدا ہوئی ہے وہ بھی قابل توجہ ہے. (یہ بات ابھی تحقیق طلب ہے کہ اپنے تأثرات و کیفیات میں بعض مترادفات کس طرح ایک دوسرے سے مختلف ہیں.)

لفظ «اور» کا یہ استعمال سرسید کے ہاں بہت کثرت سے ملتا ہے. مثلاً

(۴) «ہم یہ نہیں کہتے کہ ہماری گورمنٹ نے ملکی حالات اور اطوار دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ہم اس کے بدل مقر ہیں اور بعض قوانین گورمنٹ اور ہدایات بورڈ آف ریوینیو اور آنریبل تامسن صاحب کے ہدایات نامۂ مال کو اس کا گواہ سمجھتے ہیں. مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ رعایا کے حالات اور عادات اور خیالات اور اوضاع اور اطوار اور طبیعت اور طینت اور لیاقت کے دریافت کرنے میں توجہ نہیں کی. بلا شبہ ہماری گورمنٹ کو نہیں معلوم تھا کہ ہماری رعیت پر دن کیسا گذرتا ہے اور رات کس مصیبت کی آتی ہے اور وہ دن بہ دن کس مصیبت میں پڑتے جاتے ہیں اور کیا کیا رنج روز بہ روز ان کے دل میں جمتے جاتے ہیں جو رفتہ رفتہ بہت کثرت سے جمع ہوگئے تھے اور ایک ادنیٰ تحریک سے دفعۃً بہہ پڑے.»[۱]

عطف سے صرف لفظوں اور فقروں کو نہیں جوڑا گیا بلکہ جملوں کو بھی مربوط کیا گیا ہے کہ کسی جملہ کے ختم پر مخاطب کی توجہ کا سلسلہ ختم نہ ہو اور جو کچھ کہا جارہا ہے وہ اس کی بےتوجہی کا شکار نہ ہوجائے، بلکہ اس کا ذہن برابر متوجہ رہے اور مخاطب مخالف کے سامنے معاملے کا ایک ایک پہلو پیش کردیا جائے. اس کے لئے فرار کی تمام راہیں مسدود کردی جائیں. وہ لاجواب ہوجائے اور بات کو تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ رہے. پھر اس سے یہ بھی احساس دلانا مقصود ہے کہ خیالات کسی ترجیحی ترتیب سے پیش نہیں کئے گئے.

---

۱ اسباب بغاوت ہند، مشمولہ حیات جاوید، ص ۸۹۵

تقدیم و تاخیر سے کسی بات کی اہمیت زیادہ یا کم نہیں کرنی ہے ، بلکہ جتنی باتیں پیش کی گئی ہیں وہ سب ضروری ہیں. اختلافی مسائل کے علاوہ بھی « اور » کا استعمال کچھ کم نہیں ہے . مگر وہاں اس سے دوسرا کام لیا گیا ہے . وہ ہے اختصار و جامعیت ، کس طرح بات کو ٹھوس اور مختصر انداز میں پیش کردیا جائے اور اس اختصار سے مخاطب کی توجہ میں کمی واقع نہ ہوجائے . اس کے لئے بہت سے مختصر مفرد جملوں کو وہ « اور » کےذریعے مربوط کر دیتے ہیں. رسول اکرم کی سیرت و شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

(۵) « اور جو شخص کہ آپ کے پاس حاضر ہوتے تھے اوس پر ایسی نظر عنایت اور التفات فرماتے تھے کہ وہ شخص یہی بات جانتا تھا کہ مجھ سے سوا اور کسی پر اتنی عنایت نہیں اور فقیروں کو بہت چاہتے اور ان میں بہت بیٹھا کرتے اور ان کے جنازے کے ساتھ جاتے اور مہمان کی بہت خاطر داری کرتے اور اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرتے . . . اور آپ روزہ بہت رکھا کرتے اور آپ جب سوتے تو آپ کا دل جاگتا رہتا اور جو کوئی کچھ کہتا تو سن لیتے اور آپ صدقہ کے مال کو نہ کھاتے تھے اور جو کوئی تحفہ لاتا تو لے لیتے اور اوسے بہت سلوک کرتے . »[1]

اب ذرا لفظوں سے آگے بڑھ کر پہلے اقتباس کے پہلے فقرے پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں نحو کے عام قاعدے سے انحراف ہے . لفظوں کی عام ترتیب بدل دی گئی ہے . اس میں پہلے مضاف - مضاف الیہ کی ترتیب کو الٹ دیا گیا : « کوئی عزت اور کوئی بزرگی . . . اسلام کی اور بانیء اسلام کی . . . » ترتیب کی اس تبدیلی سے جو زور بیان پیدا ہوا ہے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں . پھر فقرہ ہائے اسمی جو عام حالات میں متصل ماقبل فعل ہوتے ، ان سے جملہ کا آغاز کیا گیا. مقام کی اس تبدیلی سے ان کی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے اور یہی فقرے جملے میں توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں. وہ قاری یا سامع کو فوراً اپنی طرف متوجہ کرلیتے ہیں اور تأثر کی یہ گرفت جملہ کے ختم ہونے تک مسلسل برقرار رہتی ہے . یہاں دو تأثر پیدا ہوتے ہیں. ایک تو یہ کہ مصنف اسلام اور بانیء اسلام

---

۱ جلاء القلوب ، ص ۴۱

کی عزت، بزرگی، تقدس کا خود بڑا داعی ہے، اور ان کے بارے میں اس کا اپنا مخصوص نقطۂ نظر بھی ہے، اور دوسرے یہ کہ کسی دوسرے نقطۂ نظر سے پیش کی ہوئی یہی خصوصیات ان سے فروتر ہونگی. یعنی وہی اپنی رائے پر وثوق اور اس کو دوسروں سے تسلیم کرانے کا پرجوش انداز. سرسید نے نحوی ترتیب سے انحراف کو بہت جگہ برتا ہے. مثلاً، تفسیر سے ہی ایک اور جملہ ہے:

(۶) «جو چیز کہ ہمارے تجربہ سے خارج ہے جیسے کہ روح، اس کی نسبت بجز اس کے کہ دلیل یا قیاس سے کوئی امر کہیں حسب مقتضائے فطرت انسانی اور کچھ کر نہیں سکتے.»[۱]

اردو کے ابتدائی اسلوب پر فارسی عربی نحو کا گہرا اثر تھا. سرسید کے کے ہاں کہیں کہیں اس کی جھلک نظر آتی ہے. یہ انداز عبارت میں جھول اور پیچیدگی کا باعث بنتا ہے. دو چھوٹے چھوٹے جملے ملاحظہ ہوں:

(۷) «سرکشی کا ارادہ جو دل میں پیدا ہوتا ہے اس کا سبب ایک ہی ہوتا ہے یعنی پیش آنا ان باتوں کا جو مخالف ہوں ان لوگوں کی طبیعت اور طینت اور ارادہ اور عزم اور رسم و رواج اور خصلت اور جبلت کے جنھوں نے سرکشی کی.»[۲]

(۸) «مگر تعجب یہ ہے کہ اپنے ساتھ خالی گاڑیاں واسطے لے جانے خزانہ کے نجیب آباد کو لایا تھا.»[۳]

سرسید جہاں زندگی بھر آزادیٔ فکر اور آزادیٔ رائے کی حمایت کرتے رہے اور تمام تر مخالفتوں کے باوجود اس حق کو خود بھی استعمال کرتے رہے، وہیں انھوں نے زبان کے استعمال میں بھی خاصی آزادی برتی ہے. انھوں نے روز مرہ استعمال ہونے والے پچاسوں انگریزی الفاظ بلاتأمل استعمال کئے. ان میں اصطلاحی اور غیر اصطلاحی سبھی طرح کے الفاظ تھے. اس کو خواہ انگریزی زبان سے مرعوبیت کا نتیجہ کہا جائے یا ضرورت کا تقاضا، مگر یہ بات اردو کے امتزاجی مزاج سے خوب میل کھاتی تھی. یہ بات بجائے خود غور طلب ہے کہ کیوں اس امتزاج کی زیادہ پذیرائی نہ ہو سکی. انھوں نے صرف الفاظ کے مستعار لینے پر

---

۱ تفسیر القرآن، جلد ۳، ص ۱۲۴

۲ اسباب بغاوت ہند، مشمولہ حیات جاوید، ص ۸۸۶

۳ سرکشیٔ ضلع بجنور، ص ۱۱۲

ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ ان کو فارسی و عربی الفاظ کے درجہ میں اردو میں کھپانے کی کوشش کی۔ انہوں نے انگریزی الفاظ کے فارسی و عربی الفاظ کے ساتھ ترکیب اضافی میں استعمال سے بھی گریز نہیں کیا۔ قواعدِ گورمنٹ اور پائداریء گورمنٹ جیسی ترکیبیں ان کے ہاں مل جاتی ہیں۔ انہوں نے ڈگری کی جمع ڈگریات اور چٹھی کی جمع چٹھیات بھی استعمال کی۔ فارسی واو عطف کو اردو عطف اور کے مقابلہ میں کم ہی استعمال کیا، لیکن اس کی حد ادب مقرر نہیں کی۔ اس کو اردو عطف کی طرح بے تکلف استعمال کیا۔ انہوں نے کرشمہ و کرتوت کا مجموعہ بھی بنا ڈالا۔ عربی جمع سے اردو قاعدے کے مطابق جمع الجمع بنانے سے بھی اجتناب نہیں کیا۔ تحقیقاتوں، جناتوں اور کفاروں جیسے الفاظ خوب استعمال کئے:

(۹)　«یہی ودیعت ہے جس نے انسان کو نئی نئی ایجادوں اور حقائق اشیا کی تحقیقاتوں اور علوم و فنون کے مباحثوں پر قادر کیا ہے۔»[۱]

(۱۰)　«انسانوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو جناتوں سے پناہ چاہتے تھے۔»[۲]

آج ہم لفظ «پاس» سے قبل ہمیشہ «کے» استعمال کرتے ہیں۔ سرسید کی تحریروں میں یہ لفظ تنہا بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً

(۱۱)　«جن لوگوں نے مذکورہ بالا آیتوں سے یہ استدلال کیا ہے کہ آنحضرت پاس کوئی معجزہ نہ تھا۔ ۔ ۔»

(۱۲)　«اور اللہ تعالی نے میرے تئیں آپ پاس بھیجا ہے۔»[۴]

یہ سب وہ امور تھے جن کو متقدمین نے روا رکھا تھا اور استعمال کیا تھا۔ لیکن متوسطین نے ان پر پابندیاں عائد کیں اور ان کو ناجائز قرار دیا۔ یہ بات زبان کی اصلاح کے نام پر کی گئی لیکن اس سے زبان کا دائرہ بھی محدود ہوگیا۔

ایک اور لفظ جس کو ان کی شخصی بولی (Idiolect) سے منسوب کیا جاسکتا ہے وہ «جوکہ» ہے۔ جس کو وہ ہمیشہ «چوں کہ» کے معنی میں استعمال کرتے ہیں:

(۱۳)　«اور جوکہ یہ لوگ ضلع میں فساد مچا سکتے تھے، ان کو اپنی

۱　تفسیر القرآن، جلد ۳، ص ۱۰
۲　ایضاً، ص ۸۷
۳　ایضاً، ص ۱۱۲
۴　جلاء القلوب، ص ۱۲

طرف کرلینے سے فساد نہ ہونے کی توقع تھی »[۱]

(۱۴) « جو کہ دنیا میں بادشاہوں کا طریقہ اپنی عظمت و جلال دکھانے کا یہی ہے کہ تخت پر بیٹھے ہیں . . . اسی کی تمثیل میں خدا نے بندوں کو سمجھانے کے لئے اپنے جلال و عظمت کو بتایا . »[۲]

مصدر مستقبل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے تو اس میں تاکید پیدا ہوتی ہے . لیکن یہ استعمال تخصیصی ہے اور اب درجۂ معیار سے گرتا جارہا ہے . تاکیدی انداز پیدا کرنے کے لئے سرسید نے مصدر کو مستقبل مطلق کے معنی میں استعمال کیا ہے . مثلاً

(۱۵) « جب اس طرح کے اسباب جمع ہو جاویں گے تو کوئی شیشہ بھی ہاتھ سے چھوٹ کر گرنے سے نہیں ٹوٹنے کا . »[۳]

(۱٦) « اگر وہ ناممکن چیزیں ہو بھی جاویں جو وہ چاہتے ہیں تب بھی وہ لوگ ایمان نہیں لانے کے . »[۴]

مستقبل کے اسی استعمال میں کہیں امکان کو بھی شامل کردیا گیا ہے :

(۱۷) « یہ کہنا . . . تسلیم نہیں ہو سکنے کا . »[۵]

کہیں کہیں الفاظ کی بعض عجیب صورتیں ملتی ہیں . ان کو کسی قاعدہ کے تحت نہیں رکھا جاسکتا لیکن اس آزاد روی کا اظہار ہوتا ہے جو سرسید نے زبان کے استعمال میں روا رکھی . جیسے :

(۱۸) « مگر میں ان عارضی تبدیلات کو بھی اپنی بحث میں جگہ نہ دوں گا . »[٦]

(۱۹) « وہ غور کرتا ہے کہ کن محسوسی اور ذہنی چیزوں سے وہ خوشی حاصل کرتا ہے . »[۷]

(۲۰) « یہ بات گورمنٹ کے لئے بہت اچھی اور پر ضرور تھی . »[۸]

---

۱ سرکشی ضلع بجنور ، ص ۱۱۸
۲ تفسیر القرآن ، جلد ۳ ، ص ۱۷۳
۳ ایضاً ، ص ۳۱
۴ ایضاً ، ص ۳
۵ ایضاً ، ص ۴۳
٦ ایضاً ، ص ۱٦
۷ ایضاً ، ص ۱۷
۸ اسباب بغاوت ہند ، مشمولہ حیات جاوید ، ص ۸۹٦

(۲۱) «اس حسرت اور افسوس کے باعث سے کہ ہندوستانیوں کے قدیم ملک پر غیر قوم قابض ہوگئی تھی تمام قوم نے اتفاق کر کر سرکشی کی .»[۱]

(۲۲) «وہ شخص یہی بات جانتا تھا کہ مجھ سے سوا اور کسی پر اتنی عنایت نہیں .»[۲]

(۲۳) «یہ کیسے اچھے لوگ ہیں کہ بے غرور ہیں .»[۳]

سچ یہ ہے کہ سرسید نے پہلی بار اردو نثر کو بے محابا استعمال کیا. انھوں نے اردو میں عقلی استدلال کی بنیاد ڈالی . انھوں نے ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا جن پر اردو میں اس سے پہلے کچھ نہیں لکھا گیا تھا. اس سے اردو زبان کے پوشیدہ امکانات کو بروے کار آنے کا موقع ملا. یہاں زبان اور محاورے سے زیادہ توجہ نفس مضمون پر تھی اس لئے اس زبان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ آزادیاں برتنے کی گنجائش پیدا ہوسکی. اس کے نتیجہ میں نثر بہت سی بے جا بندشوں سے آزاد ہوگئی. یہاں زبان کے چٹخارے کے بجاے استدلال کی براقی سے معنویت کو وقار بخشا گیا. اس سے ایک مؤثر لسانی اسلوب وجود میں آیا جس کا تسلسل حالی اور عبدالحق سے ہوتا ہوا دور حاضر تک پہنچا ہے.

---

۱ اسباب بغاوت ہند ، مشمولہ حیات جاوید ، ص ۸۸۹

۲ جلاء القلوب ، ص ۳۱

۳ اسباب بغاوت ہند ، مشمولہ حیات جاوید

ایک غلطی کی تصحیح

اپریل ۱۹۷۱ء کے شمارے میں ڈاکٹر حسینی شاہد کا ایک مضمون کلمۃ الاسرار کے عنوان سے شائع ہوا تھا. اس میں غلطی سے صفحات کی ترتیب کے وقت کچھ عبارت الٹ پلٹ ہوگئی. ناظرین اس کی تصحیح فرمالیں :

ص ۵ ، س ۲ «اصل رسالہ اس طرح شروع ہوتا ہے» کے بعد وہ عبارت ہوگی جو ص ۱۵ پر سطر ۲۵ سے شروع ہوکر ص ۱۶ کی آخری سطر پر ختم ہوتی ہے.

(مرتب)

تبصرے

کربل کتھا کا لسانیاتی مطالعہ از خلیق انجم و گوپی چند نارنگ ، ناشر : مکتبۂ شاہراہ ، اردو بازار ، دہلی نمبر۶ ، ۱۹۷۰ ، صفحات ۷۱ ، چار روپے

کربل کتھا اردو کی قدیم نثری کتابوں میں وجہی کی سب رس کے بعد لسانی اعتبار سے سب سے اہم کتاب ہے۔ وجہی کی سب رس کی اہمیت ادبی بھی ہے اور لسانی بھی۔ کربل کتھا کی اہمیت صرف لسانی ہے۔ سب رس کی زبان اور اس کے اردو ہونے میں محققین مختلف الآرا ہیں۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ یہ سرے سے اردو زبان کا نمونہ ہے ہی نہیں بلکہ یہ ہریانی زبان کی کتاب ہے۔ ایسے حالات میں اردو کے مولد و آغاز کے علاقائی پس منظر میں کربل کتھا کی لسانی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ تصنیف اس علاقہ کی زبان کا نمونہ ہے جسے عام طور پر اسکا مولد سمجھا جاتا ہے اور اس طرح اردو زبان کی تاریخی لسانیات سے متعلق تحقیق میں یہ کتاب قابلِ قدر مطالعہ کا باعث ہو سکتی ہے۔

اردو میں لسانیات پر کام غیر تسلی بخش ہے۔ ہندوستان میں جدید لسانیات کی مقبولیت کے باوجود اردو میں لسانی مطالعوں کی رفتار ہر سمت میں سست رہی ہے جبکہ دیگر زبانوں میں مختلف ادارے خوب کام کر رہے ہیں۔ لسانی مطالعوں میں مختلف نثری متنوں کے توضیحی مطالعے جن سے تاریخی لسانیات میں بھی مدد مل سکے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس سلسلہ کا پہلا مطالعہ سب رس کی زبان پر شیرانی مرحوم کا مقالہ ہے جو اورینٹل کالج میگزین ، لاہور ، میں شائع ہوا تھا۔ زیر نظر کتاب «کربل کتھا کا لسانی مطالعہ» اردو کی کلاسیکی کتابوں کے لسانی مطالعہ کے سلسلے کی دوسری کوشش ہے۔ پروفیسر شیرانی مرحوم کا مقالہ لسانی اعتبار سے قدیم قواعدی اصول اور اصطلاحوں پر مشتمل ہے ، «کربل کتھا کا لسانی مطالعہ» کے مرتبین جدید لسانیات کی سمت و رفتار سے واقف ہیں اس لئے انھوں نے زبان کی لسانی ساخت میں صوتی ، صرفی ، نحوی ، لفظی اور املائی خصوصیات کو توضیحی لسانیات کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کی ہے۔

صوتی سطح پر مصنفین نے کربل کتھا کی زبان کا پنجابی ، برج بھاشا اور کھڑی بولی سے مقابلہ کر کے اس صوتی رجحان کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس تقابلی لسانیات کی مدد سے اردو زبان کے تاریخی ارتقا کی صوتی خصوصیات کی طرف بھی توجہ جاتی ہے۔ تاہم اسکی بیشتر توضیحی خصوصیات دلّی اور نواح دلّی سے باہر کی زبان میں بھی پائی جاتی ہیں۔ معکوسی Reploflex آوازوں

میں البتہ ڑ کی آواز شاید عہد فضلی کی اردو کی خصوصیت ہو۔ مصوتوں کے انفیانے کا رجحان بھی شمال تا جنوب عام طور سے پایا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ بھی تاریخی ارتقا کے سلسلے میں کسی خاص نشاندھی کا باعث نہیں ہوسکتا۔ صرفی تبدیلیوں میں بھی کربل کتھا کی چند لسانی خصوصیات برج اور پنجابی میں اور کچھ دکنی اور گجری میں بھی پائی جاتی ہیں یہی حال لفظوں اور املائی خصوصیات کا بھی ہے لہٰذا وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ فضلی کی لسانی خصوصیات اسی سے مخصوص ہیں۔ بلکہ یہ متعدد آریائی بولیوں کی مشترک خصوصیات ہیں۔ لہٰذا ان خصوصیات کی بنیاد پر تاریخی لسانیات میں مدد لینا شاید سائنسی نتیجوں تک رہنمائی نہ کر سکے۔ اس دور کی اسی قسم کی اسی علاقے سے مخصوص چند اور کتابوں کا دستیاب ہونا ضروری ہے۔

اردو کی بولیوں کی طرح اہم نثری کتابوں کے توضیحی مطالعے بھی مستقل لسانی موضوعات ہیں جن پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ مصنفین نے جو اردو کے جدید محققین میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں، اس مطالعہ کے ذریعہ اس قسم کے مطالعوں کی اہمیت کو نہ صرف یہ کہ خود محسوس کیا ہے بلکہ آیندہ اس میدان میں کام کرنے والوں کی رہنمائی بھی کی ہے۔ لسانیات کے دیگر پہلوؤں پر کام کرنے کے سلسلے میں چاہے وہ تاریخی لسانیات ہو، چاہے کوئی اور شاخ ہو، توضیحی تجزیہ وہ بنیادی کام ہے جس کے بغیر آگے بڑھنا اور لسانی تحقیق کی دیگر منزلیں سر کرنا ممکن نہیں۔ ڈاکٹر نارنگ اور ڈاکٹر خلیق انجم اپنی اس کاوش کے لئے ہمارے شکریے کے حقدار ہیں۔ یہ کتاب خاص طور سے یوں بھی توجہ طلب ہے کہ کربل کتھا مختلف یونیورسٹیوں میں داخلِ نصاب ہے، اور اس کتاب کی اہمیت جیسا کہ اس سے قبل کہا جاچکا ہے، ادبی سے زیادہ لسانی ہے۔ ہماری یونیورسٹیوں میں اردو کے تعلق سے عام طور سے لسانی موضوعات کو سمجھانے والے اساتذہ ذرا کم ہی ھیں۔ ایسے حالات میں یہ کتاب اساتذہ اور طلبہ دونوں کے لئے مددگار اور ڈگر کا تعین کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔

(ڈاکٹر) عبدالستار دلوی

<u>شہرتِ غالب بہ گیتی</u>، مؤلفہ سید حیدر عباس رضوی، شائع کردہ شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال، ۱۹۷۰ع، صفحات ۱۲۸، قیمت تین روپے۔

سنہ ۱۹۶۹ میں غالب صدی منائی گئی ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں غالبیات کا ایک طوفان آگیا۔ یہ رسالہ بھی اسی طوفان کا ایک جھونکا ہے۔ اس میں اردو

زبان کے آٹھ اہل قلم حضرات کے مختلف النوع حسب ذیل مضامین ہیں : ۱۔ غالب کی شاعری از پروفیسر محمد مجیب ، ۲۔ غالب کا صحیفۂ منسوخ از ڈاکٹر گیان چند ، ۳۔ غیرمطبوعہ مکتوبات مرزا غالب بنام شاہ غمگین از رضا محمد حضرت جی صاحب ، ۴۔ غلطیہائے مضامیں مت پوچھ از وجاہت علی سندیلوی ، ۵۔ کلام غالب کی شرحیں از ڈاکٹر سید حامد حسین ، ٦۔ غالب کی خود اشتہاریت از حنیف کیفی بریلوی ، ۷۔ غالب کا ایک عقیدتمند مولانا ابوالکلام آزاد از سید حیدر عباس رضوی ، ۸۔ بنام غالب از سید حیدر عباس رضوی .

آٹھوں مضمون اپنی اپنی جگہ اہم ہیں . ان میں ڈاکٹر گیان چند کا مضمون غالب کا صحیفۂ منسوخ ، حقیقت پسندانہ اظہار خیال ہے . یہ ایک حقیقت ہے کہ جس چیز کی شہرت عام ہوجائے خواص سے قطع نظر عوام بھی اس کی مدح و ستایش میں بے سمجھے بوجھے لب کشائی کرنا اپنا فرض خیال کرنے لگتے ہیں . غالب کے مشکل اشعار کا بھی یہی حال ہے کہ لوگ ان کے متعلق خاموشی کو اپنی علمی توہین سمجھتے ہیں . اس سلسلہ میں ڈاکٹر گیان چند نے خوب کہا ہے کہ :

> « (منسوخ) دیوان میں تقریباً دو سو اشعار اس قابل ہیں کہ انھیں متداول دیوان کے دو سو اشعار کے ساتھ بدل لیا جائے یعنی متداول دیوان کے دو سو مغلق ترین اشعار کی گردن مار کر دو سو قلم زدہ اشعار کو ان کی جگہ دیدی جائے . »

یہ چار سو اشعار کا رد و قبول یا قبول و رد اسی مذاق کے اختلاف اور اور ذہنی بلند پروازی کی غمازی کرتا ہے . شارحین کو اختیار ہے کہ مروج یا منسوخ دیوانوں میں سے جس قدر اشعار مناسب خیال فرمائیں انتخاب فرماکر ان کی شرح لکھدیں . لیکن اگر یہ مذاق اور اختیار عام ہوگیا تو ڈر ہے کہ سارا کلام غالب غت ربود ہوکر رہ جائے گا .

غالب کے فارسی خط شاہ غمگین کے نام تاریخی چیز ہیں . مولانا ابوالکلام آزاد کی غالب کے بارے میں نواب سر امیر الدین خاں مرحوم کی روایت اسی بیان کا حصہ معلوم ہوتی ہے جو غالب کے قید ہوجانے پر خاندان لوہارو نے غالب سے بے تعلقی کے بارے میں دیا تھا . اس بارے میں سید حیدر عباس کا اعتراض بالکل مناسب اور معقول ہے کہ نواب امیر الدین خاں مرحوم نے جو بات غالب کی طرف منسوب کی ہے وہ تو غالب کے کسی ہمعصر مخالف نے بھی نہیں کہی .

(مولانا) مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی

نسخۂ بھوپال اور نسخۂ بھوپال ثانی از عبد القوی دسنوی ، شائع کردہ شعبۂ اردو، سیفیہ کالج ، بھوپال ، ۱۹۷۱ ، صفحات ۸۸ ، تین رُپے ۔

غالبیات کے سلسلے میں دیوان غالب کا نسخۂ بھوپال (نسخۂ حمیدیہ) جو پچپن سال پہلے منظر عام پر آیا اور نسخۂ بھوپال ثانی (بیاض غالب) جس کا انکشاف غالب صدی کے موقع پر ہوا ، نہایت اہم ادبی اور تحقیقی دستاویزیں ہیں ، زیر نظر مقالے میں عبد القوی دسنوی نے دونوں نسخوں کے متن اور غالب کی اصلاحوں، ترمیموں اور محذوف اشعار کا جائزہ لیا ہے ۔ دونوں نسخوں کے بارے میں عبد القوی نے مفید معلومات فراہم کی ہیں ۔

قادر نامۂ غالب مرتب عبد القوی دسنوی ، شائع کردہ شعبۂ اردو، سیفیہ کالج ، بھوپال ، ۱۹۷۱ ، صفحات ۳۱ ، قیمت : ڈیڑھ روپیہ ۔

« قادر نامہ » کی تالیف کے انتساب کے بارے میں محققین میں اختلاف رائے ہے ۔ عبد القوی دسنوی نے تیرہ نسخوں کی مدد سے قادر نامہ کا ایک صحیح متن تیار کیا ہے ۔ پیش لفظ میں مرتب نے مختلف دلائل اور مضامین کے سہارے اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قادر نامہ غالب ہی کی تصنیف ہے جو انہوں نے اپنی اہلیہ کے بھانجے زین العابدین خاں عارف کے بچوں کے لئے لکھا تھا ۔ کتاب کا اگر لسانی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جاتا تو بہتر ہوتا ۔

غالب با نژاد نو مرتبین : عمر حیات خاں ، سید ظہور الاسلام اور اقبال مسعود ، شائع کردہ شعبۂ اردو ، سیفیہ کالج ، بھوپال ، ۱۹۷۱ ، صفحات ۱۲۰ ، تین رُپے

زیر نظر کتاب سیفیہ کالج ، بھوپال ، کے ایم ۔ اے ۔ کے طلبہ کی کاوشوں کا نتیجہ ہے ۔ اس میں آٹھ مختصر مضامین ہیں جو غالب کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں ۔ اس قسم کے مجموعے طلبہ میں ادبی اور تحقیقی ذوق پیدا کرنے میں سودمند ثابت ہوں گے ۔

(ڈاکٹر) آدم شیخ

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بمبئی

کی

نئی کتاب

راگ مالا

مصنفہ

سید عبدالولی عزلت سورتی

جس میں راگوں، راگنیوں اور پتروں کی دلکش
انداز میں اشعار میں تصویریں کھینچی گئی ہیں

مرتبہ

عبدالرزاق قریشی

ملنے کا پتا:
ادبی پبلشرز، شیفرڈ روڈ، بمبئی نمبر ۸
قیمت: مجلد چار رُپے، پچاس پیسے

Nawa-e-Adab

A QUARTERLY JOURNAL OF

THE ANJUMAN-I-ISLAM URDU RESEARCH INSTITUTE

Annual Subscription:

Inland & Pakistan: Rs. 6 Foreign: Shillings 12
(inclusive of postage)

Price per copy: Rupee one & Paise fifty

[Vol. 22 1971 JULY - SEPTEMBER No. 3]

All remittances to be made to

THE ADABI PUBLISHERS

8 Shepherd Road, Bombay 8 (India)